زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثــالــث

جلد-۴ شمارہ -۱۴

جنوری تا دسمبر ۲۰۱۹ء

مدیر اعزازی **مدیر**

اقبال حسن آزاد ثالث آفاق صالح

سر ورق ......نعیم یاد

رابطہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ	:	...........۱۵۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۵۰/روپے)
سالانہ	:	...........۶۰۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۷۰۰/روپے)
خصوصی تعاون	:	...........پندرہ ہزار روپے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر مما لک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف مما لک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ستر (۷۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	اسی (۸۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پچاس (۵۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو ساٹھ (۱۶۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	بیس (۲۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
قطر:	:	دوسو (۲۰۰) ریال
کویت	:	تیس (۳۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن مما لک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتے پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لیے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Allahabad Bank
Jamalpur Branch
A/c No. 20962191966
IFSC Code-ALLA0210009

فہرست

اداریہ	اقبال حسن آزاد	ادارہ	۵
حمد	محمد شفیع الرحمٰن شفیع		۸
نعت	مرغوب اثر فاطمی		۱۰
غزلیں	افتخار حیدر/راشد طراز		۱۱
گوشہ حسین الحق			
کوائف	حسین الحق	ادارہ	۱۳
خاکہ	اب فقط رہ گئی افسانہ طرازی اے دوست	عبدالصمد	۱۶
مضامین	عالمی زہراب اور حسین الحق کے افسانے	پروفیسر وہاب اشرفی	۲۱
	حسین الحق کے دو مجموعے	پروفیسر محمد حسن	۳۷
	نئے اندازِ فکر کا افسانہ نگار	ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی	۳۹
	ناگہانی......میری نظر میں	وارث علوی	۴۳
	ناگہانی......ایک مطالعہ	ڈکٹر افصح ظفر	۴۴
	کربلا......ایک تجزیہ	کلام حیدری	۴۸
	ایک کہانی......کئی اندازِ نظر	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۰
	زندگی کا آئینہ ساز......حسین الحق	فاروق ارگلی	۵۲
	حسین الحق اور "نیو کی اینٹ" کے افسانے	ڈاکٹر منظر اعجاز	۶۳
	حسین الحق بحیثیت افسانہ نگار	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	۷۲
	حسین الحق کی افسانہ نگاری......ایک جائزہ	مشتاق احمد نوری	۷۵
	زخمی زخمہ	اظہار خضر	۸۵
	"گلاس میں خواب" معاصر ہندوستان کا استعارہ	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۹۲
	حسین الحق کے افسانے کی پذیرائی	عشرت ظہیر	۱۰۵
انتخاب	ناگہانی	حسین الحق	۱۰۶
یادرفتگاں	میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا منشایاد	محمد نعیم یاد	۱۲۱

مضمون	شریف طینت افسانہ نگار......نیاز اختر	تنویر اختر رومانی	۱۲۶
ایزاد	ہتک کے بعد	امجد جاوید	۱۳۳
افسانے	پلاسٹک کے بوئے	فرحین جمال	۱۵۴
	دا۔جی	گل ارباب	۱۵۹
	ایک مزدور کی موت	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر	۱۶۶
	امپیریا کے مجسمے تلے	ہما فلک	۱۷۶
	بوڑھے آدمی کا خواب	محمد جمیل اختر	۱۸۳
	تازہ جھونکا	ڈاکٹر شکیل احمد خاں	۱۸۷
	اپنا شہر	بلال مختار	۱۹۳
	بھیڑیے	نیاز اختر	۱۹۷
	کیا بھروسہ ہے زندگانی کا	نشاط پروین	۲۰۱
ناول کا ایک			۲۰۵
باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خاں	
ثالث پر		ڈاکٹر منصور خوشتر	۲۱۵
تبصرہ	"ثالث" شمارہ نمبر ۱۳		
تبصرے	عالمی اردو ادب/نند کشور وکرم	اقبال حسن آزاد	۲۱۶
	مطالعے کا سفر/سلیم انصاری	اقبال حسن آزاد	۲۱۷
	ندائے گل/قاری ساجد نعیم	اقبال حسن آزاد	۲۱۸
	روح دیکھی ہے کبھی/ہما فلک	اقبال حسن آزاد	۲۲۰
مکتوبات	وسیم احمد فدا، آفتاب احمد آفاقی، یمین تابش، ممتحنہ اختر، اصغر شمیم، عشرت ظہیر، رینو بہل، ابوفہد		۲۲۲ تا ۲۲۴

◄● ►

اردو لکھئے ، اردو پڑھیے ، اردو بولیے

● **اداریہ**

● **اقبال حسن آزاد**

اداریہ

"مجھے گدے پر نیند نہیں آتی ہے۔"

نرم لہجے میں کہی گئی اس بات نے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری کردی اور میں حیرت زدہ نظروں سے اس شخص کو دیکھنے لگا جسے اللہ تعالی نے ہر قسم کے آرام وآسایش سے نوازا ہے۔ میں نے اس کی مسکراتی آنکھوں کو غور سے دیکھا اور میرے ذہن میں آتش کا یہ شعر گونجنے لگا:

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریے پہ بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر

قالین کو ٹھوکر مارنے والے اس شخص کا نام ہے حسین الحق......ناول نگار، افسانہ نگار، تنقید نگار، شاعر، پروفیسر اور نہ جانے کیا کیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک نفیس انسان ہیں۔ ادیب خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اگر وہ باادب نہیں تو میری نظر میں اس کی قدر و قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔ حسین صاحب کی زبان بڑی پیاری ہے...... پیاری اور من موہنی۔ بقول فراز:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

میرا ان سے غائبانہ تعارف تو چالیس پینتالیس سال پرانا ہے مگر بالمشافہ ملاقاتیں صرف چار ہیں۔ پہلی ملاقات اسّی کی دہائی میں پٹنہ میں ہوئی۔ ان دنوں وہ چھوٹا ناگپور کی ملازمت چھوڑ کر مگدھ یونیورسیٹی آچکے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ تو کمیشن کے ذریعہ منتخب کئے گئے تھے پھر آپ نے اپنی پکی نوکری کیوں چھوڑ دی۔ کہنے لگے کہ میرے ایک ہاتھ میں مذہب دے دو اور دوسرے میں ادب، میں جی لوں گا۔ اور وہاں یہ دونوں چیزیں میسر نہیں تھیں اس لئے میں نے وہ نوکری چھوڑ دی۔

دوسری ملاقات گیا میں ان کے دولت کدے پر ہوئی۔ میں ایک بارات کے ساتھ وہاں گیا تھا اور جانے سے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ اور کسی سے ملاقات ہو نہ ہو حسین صاحب سے ضرور ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔ جناب شاہد اختر بھی اس شادی کی تقریب میں شریک تھے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے میرا تعارف

ان سے کروادیا۔ میں نے دوران گفتگو ان سے وعدہ لیا کہ کل صبح وہ مجھے حسین صاحب سے ملوانے کے لئے لے جائیں گے۔ حسب وعدہ وہ دوسرے روز اسکوٹر لے کر آئے اور میں ان کے ہمراہ حسین صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ کافی تپاک سے ملے اور دیر تک باتیں کیں۔ باتوں باتوں نے انہوں نے فن افسانہ نگاری کے سلسلے میں کئی اہم نکات سے مجھے روشناس کرایا۔ خاص طور پر مجھے ان کا یہ جملہ یاد رہ گیا کہ افسانے کا کلائمکس ناشگفتہ کلی کی طرح منھ بند ہونا چاہیے۔ میں نے ان کی اس بات کو گرہ میں باندھ لیا۔

ان سے میری تیسری ملاقات کریم سیٹی کالج، جمشید پور کے سیمینار میں ہوئی۔ وہ، میں اور محترمہ شہناز نبی اسٹیج پر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ اس روز ان سے کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی کیونکہ ان کی تمامتر توجہ شہناز نبی صاحبہ کی جانب تھی۔

اور یہ میری ان سے چوتھی ملاقات تھی جس میں انہوں نے فرمایا کہ مجھے گدّے پر نیند نہیں آتی ہے۔ وہ دراصل اردو فورم، مونگیر کے سالانہ جلسے میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ فورم نے ان کی اور جناب شاہد اختر کی میزبانی میرے ذمے لگا دی تھی۔ دونوں حضرات بذریعہ کار شام پانچ بجے غریب خانے پر تشریف لائے۔ دوران سفر وہ مسلسل میرے رابطے میں رہے۔ پھر ہم لوگ تیار ہو کر جلسہ گاہ پہنچے جہاں انہوں نے ایک نہایت عمدہ افسانہ پیش کیا۔ تقریب کے بعد جناب شاہد اختر تو پروفیسر منصور احمد نیازی صاحب کے یہاں چلے گئے اور میں حسین صاحب کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ میرے ڈرائنگ روم میں ایک دیوان بچھا ہوا ہے اور جب میں نے اس پر ان کا بستر تیار کیا تو......اب مجھے یہ سوچ سوچ کر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ میں اپنے مہمان کے لئے خاطر خواہ بندوبست کرنے سے قاصر تھا۔ بہر کیف! اگلی صبح جاتے جاتے فرما گئے کہ آپ تو بڑے پیارے انسان ہیں۔ آپ سے رابطہ رکھنا چاہیے۔ لیجئے صاحب! شرمندگی کا سارا احساس کافور ہو گیا۔

میرا ان سے رابطہ تو برسوں پرانا ہے۔ جن دنوں میں زیر تعلیم تھا تو ان کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ پھر جیسے جیسے فکشن کی سمجھ آتی گئی میں ان کی تحریروں کا اسیر ہوتا چلا گیا۔ زبان پر ایسی گرفت کم ہی افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔ آتش نے کہا ہے کہ:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

میں سمجھتا ہوں کہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ نثر نگاری بھی مرصع سازی ہی ہے۔ اور بلاشبہ حسین الحق ایک بہترین مرصع ساز ہیں......صرف مرصع ساز ہی نہیں بلکہ وہ ایک عمدہ مجسمہ ساز بھی ہیں۔ وہ اپنے

الفاظ سے ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے متحرک ہو جاتا ہے۔''گونگا بولنا چاہتا ہے'' ہو یا ''نیو کی اینٹ''، ''انحد'' ہو یا ''نا گہانی'' یا پھر کوئی اور افسانہ......ان کا مخصوص رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مستند قلم کار وہ ہے جس کا اپنا ایک الگ اسٹائل ہو اور جو اپنی تحریر سے پہچان لیا جائے۔ حسین الحق اس تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔ مجھ سے ایک دفعہ ایک شاعر صاحب نے پوچھا تھا کہ ''ثالث'' میں گوشہ چھپوانے کا کیا معیار ہے؟ میں نے کہا کہ میں صرف انہی لوگوں پر گوشہ نکالتا ہوں جو میری نظر میں مستند اور معتبر ہوتے ہیں۔ اور اس کے لئے ''ثالث'' کسی قسم کی مالی مدد بھی نہیں چاہتا۔ حسین الحق صاحب اعلیٰ پایہ کے ادیب ہیں۔ زیرِ نظر گوشہ ان کے شایانِ شان ہے یا نہیں یہ تو قارئین ہی بتائیں گے:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

جس طرح چاند، سورج، ستاروں، ہواؤں، گھٹاؤں اور پرندوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اسی طرح ادب کی بھی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ زیرِ نظر شمارے میں اگر ایک طرف ہندوستان شعراء اور ادیب مثلاً محمد شفیع الرحمٰن شفیعؔ، مرغوب اثر فاطمی، راشد طراز، عبد الصمد، فاروق ارگلی، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، عشرت ظہیر، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، تنویر اختر رومانی، نیاز اختر اور نشاط پروین ......وغیرہ شامل ہیں تو دوسری جانب پاکستان سے اقبال حسن خاں، امجد جاوید، محمد جمیل اختر، شکیل احمد خاں، افتخار حیدر، گل ارباب اور محمد نعیم یاد، سوئٹزرلینڈ سے شاہین کاظمی، جرمنی سے ہما فلک اور آسٹریلیا سے بلال مختار وغیرہ کی نگارشات شمارے کی زینت ہیں۔

''ثالث'' آن لائن بھی دستیاب ہے۔ آپ اس کے گذشتہ شمارے درج ذیل لنک پر جا کر نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ اسے ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

www.salismagazine.in

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔ آپ اپنی رائے درج ذیل موبائل نمبر پر وھاٹس ایپ بھی کر سکتے ہیں۔

8210498674

◀◀ ● ▶▶

● محمد شفیع الرحمٰن شفیعؔ

حمد

اللہ مرئی، غیر مرئی جان کا خالق ہے تو
ہے مہرباں سب پر، بڑا فیاض ہے، رازق ہے تو
کل روز و شب، ارض و سما، بارش تری آیات ہیں
تاباں ترے خورشید سے روئے زمیں، ذرات ہیں
عالم یہ اسباب فراواں سے ترے معمور ہے
ہے تو صمد تنہا، ترے آگے ہر اک مجبور ہے
افلاک پر نیّر، قمر، انجم، کشادہ کہکشاں
روئے زمیں پر بحر، دریا، کوہ، جنگل، گلستاں
تو ہی زمین اور آسمانوں کا سراپا نور ہے
پھر بھی نگاہوں سے ہماری تو پرے، مستور ہے
تو ہے احد، تو لم یلد ہے اور لم یولد بھی ہے
ند ہے نہ ضد کوئی ترا، تو لم یزل ہے حد بھی ہے
رحمت غضب پر تیرے سبقت لے گئی اے مہرباں
دیتا ہے تو کل بے بسوں کو مانگے بن ہی خود اماں
مرضی تری جس کو عطا کر دے ہدایت کی ضیا
چاہے جسے، بھٹکا کرے وہ گمرہی میں ہی سدا
عزت ملے اس کو، تو جس پر ہو گیا خود مہرباں
کوئی نہ ذلت سے بچا پائے، اگر کہہ دے تو 'ناں'
بے شک! تجھے سب کی خبر، تو ہی ہے عالم غیب کا
ہے داغ ہر مخلوق میں کوئی نہ کوئی عیب کا
سب سے بڑا احسان تیرا بعثتِ احمدؐ خدا
ہے جن کا اسوہ زندگی میں کامرانی کی بنا

دے رب ہمیں علم و شعورِ خود شناسی فضل سے
جن کے سبب محظوظ ہو پائیں گے تیرے وصل سے
تو ہے تصور سے پرے، کیسے کروں تیری ثنا
میرے تصور میں ہے کیا، تو دیکھتا، تو جانتا
حسنِ عبادت کی عطا کردے ہمیں توفیق تو
اب مغفرت فرما، لحد میں آئے ہر جنت کی بو
اسلام پر ہو زندگی، ہم در صفِ اخیار ہوں!
ایمان پر ہو موت، ہم بھی شاملِ ابرار ہوں!
کر لے شفیعؔ بے زباں کی تو قبول اے رب دعا
میرا ہے بس ایمان تجھ پر اور وہ بھی بے ریا

◀◀ ● ▶▶

Shabnam Manzil
Near Masjid Alba Colony
P.O.Phulwari Sharif
Patna-801505
Mob.:9431448749

● مرغوب اثر فاطمیؔ

نعت

مانا شبِ تاریک سے گھبرائے ہوئے ہیں
ہم مژدۂ تنویر مگر پائے ہوئے ہیں
نکلے جو کڑی دھوپ میں جاں بازِ محمدؐ
رحمت کے بہت دور تلک سائے گئے ہیں
جو عہد کیا اس پہ کھرے اُترے نہیں ہم
کیا دستِ دعا خود سے ہی شرمائے ہوئے ہیں
آمد پہ شہِ دینؐ کے انعام و بشر کیا
دامن تو پروں والے بھی پھیلائے ہوئے ہیں
انوار کا منبع ہے وہی صاحبِ لولاکؐ
یہ ذرے اسی مہر کے چمکائے ہوئے ہیں
ایثار و رواداری و اخلاص و اخوت
یہ نسخے سبھی آپؐ کے بتلائے ہوئے ہیں
کیا ذاتِ مقدسؐ کا ہو لفظوں میں احاطہ
اوصاف تو قرآن میں خود آئے ہوئے ہیں
ہم اُنؐ کے مکمل ہوں یہی رب کی رضا ہے
سو عشرت و ہنگام کو ٹھکرائے ہوئے ہیں
اے بابِ کرمؐ کیجئے مشرف بہ حضوری
اشعار اثرؔ نعت کے کچھ لائے ہوئے ہیں

◀◀ ● ▶▶

Road No:7
Moh: Ali Gunj
Gaya:823001
Mob.:9431448749

غزلیں

افتخارحیدر

ڈھلکتی شب کے ستاروں کا دکھ نہیں سمجھا
کسی نے ہجر کے ماروں کا دکھ نہیں سمجھا

ہیں آپ غرق، مناظر کی خوش نمائی میں
سلگتے، جلتے چناروں کا دکھ نہیں سمجھا

لگائے فتووں کے انبار پینے والوں پر
کسی نے بادہ گساروں کا دکھ نہیں سمجھا

الاؤ تاپتے بیٹھے ہوؤں کی جھرمٹ نے
بھڑک کے بجھتے شراروں کا دکھ نہیں سمجھا

ہر اک نے منزل مقصود پر نگاہ رکھا
جھلستی راہ گزاروں کا دکھ نہیں سمجھا

زمانہ جھولیاں بھرنے میں ہی رہا مصروف
مراد دیتے مزاروں کا دکھ نہیں سمجھا

◄◄ ● ►►

Plot No:242
Gulshan sardar
Rachna Town
Shahadra
Lahore(Pakistan)
03368311214

راشدطراز

زمین ہوتی نہیں گرچہ آسماں کی طرح
مگر یہ آج بھی لگتی ہے سائباں کی طرح

میں جانتا ہوں کہ تقدیر میں مکان نہیں
بنا رہا ہوں مگر دل کو لا مکاں کی طرح

ہزار عیش ہیں لیکن کہیں دوام نہیں
حیات کیوں نظر آتی ہے داستاں کی طرح

دلا دے مجھ کو جو احساس میری بستی کا
ہو کوئی جائے اماں ایسے آشیاں کی طرح

چراغ اپنے لہو سے جلا کے ایماں کا
چلا ہوں جانبِ منزل میں کارواں کی طرح

وجود آخری سرحد ہے پاسبانی کی
سوائے اس کے نہیں کوئی پاسباں کی طرح

طرازؔ آخرِ شب کہہ رہی خاموشی
سحر بھی ہوتی ہے انوارِ دو جہاں کی طرح

◄◄ ● ►►

Dilawarpur
Munger-811201
9934628955
9304861140

● کوائف

نام......حسین الحق
تاریخی نام......وصی بخت رسا
والدکانام......مولانا محمد انوارالحق شہودی (حضرت نازش سہسرامی)
پیدائش......نومبر ۱۹۴۹ء، بمطابق......۱۰/محرم ۱۳۶۹ ہجری
جائے پیدائش......سہسرام
مدرسے کی تعلیم......مدرسہ بورڈ، بہار سے (مولوی تک)
تکمیلِ درس عالم تک......مدرسہ خانقاہ کبیریہ، سہسرام سے
میٹرک......ضلع ہائی اسکول، آرہ سے......۱۹۶۵ء
آئی اے، بی اے......ایس پی جین کالج، سہسرام سے......۱۹۶۹ء
ایم۔اے، اردو، پٹنہ یونیورسٹی سے......سشن ۱۹۶۹ء......۱۹۷۱ء (ریزلٹ ۱۹۷۲ء)
ایم۔اے، فارسی......۱۹۷۴ء (مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا)
یو جی سی فیلوشپ، پٹنہ یونیورسٹی سے......۱۹۷۳ء
پی ایچ ڈی......"اردو افسانوں میں علامت نگاری" (۱۹۸۵ء، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا)

ملازمت:
۱۔ بحیثیت لکچرر پہلی تقرری......گروگوبند سنگھ کالج، پٹنہ سٹی (۱۹۷۲ء)
۲۔ پبلک سروس کمیشن سے مستقل تقرری......اس پی کالج، دمکا (موجودہ صوبہ جھارکھنڈ میں، ۱۹۷۴ء)
۳۔ گیا کالج گیا......۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۰ء
۴۔ پی جی ڈپارٹمنٹ آف اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا......۱۹۸۱ء تا ۲۰۱۴ء سبک دوشی تک
لکچرر
ریڈر
پروفیسر

دیگر ذمہ داریاں:
۱۔ صدر شعبہ، اردو (چند سالوں تک فارسی بھی)، ۲۔ یونیورسٹی پروکٹر، ۳۔ ممبر: سینیٹ/سنڈیکیٹ/بہار اردو اکیڈمی

سبک دوشی......نومبر ۲۰۱۴ء

ادبی سفر:
پہلی کہانی......۱۹۵۹ء، بعنوان "ایمان داری کا پھل" (اس کے آخر میں تاریخ بھی درج ہے۔ یہ اپنی اصلی صورت میں میرے پاس محفوظ ہے۔ نصرت ظہیر صاحب کی ضد پر، ان سی پی یو ایل کے "بچوں کی دنیا" میں یہ کہانی، اصل کاپی کے عکس کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔)
۱۹۶۴ء......۱۹۶۷ء کے درمیان بچوں کی کچھ کہانیاں غنچہ، بجنور، ٹافی لکھنؤ، بچپن، غالباً بریلی......وغیرہ میں شائع ہوئیں۔
پہلی مطبوعہ افسانہ نما تحریر......"پسند" جمیلہ، دہلی میں ۱۹۶۵ء
پہلا مطبوعہ افسانہ......"وہ"......ماہ نامہ "آئندہ" (جمشید پور، مدیر، سہیل واسطی)
پہلا مطبوعہ مضمون "جینے کا انداز بدلنا ہوگا..." (۱۹۶۸ء، ہفتہ وار، معاشرہ، پٹنہ)
پہلا مطبوعہ نیم ادبی مضمون "اردو شاعری پر گاندھی جی کے اثرات" (ماہنامہ "بہار کی خبریں" ۱۹۶۹ء) پہلا ادبی انعام "اختر اورینوی پرائز" (بزم ادب، شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے، ۱۹۷۱ء) پہلی ادارت......بچوں کے رسالے "انوارِ صبح" کی ۱۹۶۶ء
پہلا ریڈیو پروگرام......۱۹۷۱ء
پہلا مضمون جس میں، نئے افسانہ نگاروں کے ذکر میں، مجھے بھی یاد رکھا گیا ماہنامہ "تحریک" (دہلی) ۱۹۷۱ء یا ۱۹۷۲ء کے کسی شمارے میں......ارج، نام کے کسی صاحب کا جدید افسانے پر لکھے مضمون میں
پہلی مطبوعہ کتاب: "آخری گیت" (۱۹۷۶ء)
پہلا مطبوعہ افسانہ: "وہ" (۱۹۶۷ء)
افسانوی مجموعے: ۱۔ پس پردہ شب (۱۹۷۹ء)، ۲۔ صورت حال (۱۹۸۱ء)، ۳۔ بارش میں گھرا مکان (۱۹۸۳ء)، ۴۔ گھنے جنگلوں میں (۱۹۸۵ء)، ۵۔ مطلع (۱۹۹۰ء)، ۶۔ سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (۱۹۹۶ء)، ۷۔ نیو کی اینٹ (۲۰۱۰ء)
۸۔ حسین الحق کے منتخب افسانے (مرتب: پروفیسر صغیر افراہیم ۲۰۱۹ء)
ناول: ۱۔ بولو مت چپ رہو (۱۹۹۰ء)، ۲۔ فرات (۱۹۹۲ء)، ۳۔ اماوس میں خواب (۱۹۱۷ء)
طویل نظم: آخری گیت (۱۹۷۶ء)
تنقیدی کتب: ۱۔ نثر کی اہمیت، ۲۔ اردو فکشن، ہندوستان میں

سوانح: ۱۔ آثار حضرت وصی (سوانح حضرت وصی الحق مسکین اصدقی)
تذکرہ: ۱۔ آثار حضرت وحید اصدقی
تاریخ: ۱۔ آثار بغاوت (ذکر مجاہد جنگ آزادی قاضی علی حق)
تصوف: ۱۔ تفہیم تصوف، ۲۔ شرح غیاث الطالبین (ایک صوفی بزرگ، حضرت مولانا غیاث الدین اصدقی کے صوفیانہ نکات کی شرح)
ترجمہ: ۱۔ اسلام کے ابتدائی عہد کا نظام تعلیم (ڈاکٹر ظفر عالم خاں کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)
ترتیب وتدوین: ۱۔ حضرت مولانا محمد انوارالحق شہودی نازش سہسرامی کی نثر و نظم پر مشتمل چھ کتابوں کی ترتیب و تدوین
ایوارڈ: ۱۔ سہیل عظیم آبادی فکشن ایوارڈ (بہار اردو اکیڈمی، ۲۰۱۵ء)، ۲۔ کل ہند ادب ایوارڈ (بنگال اردو اکیڈمی، کولکتہ)، ۳۔ کل ہند غالب ایوارڈ (غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی)
اعزازات: ۱۔ پوسٹ گریجویٹ اسکالرشپ: حکومت بہار سے، ۲۔ جونیر فیلوشپ: یو جی سی سے (برائے تحقیق)، ۳۔ جونیر فیلوشپ اور سینیر فیلوشپ، مرکزی حکومت سے (برائے تخلیق)
انعامات: ۱۔ مطلع پر پہلا انعام، ۲۔ اردو نثر پر پہلا انعام، ۳۔ اردو فکشن ہندوستان میں، پر پہلا انعام، ۴۔ تفہیم تصوف پر پہلا انعام، ۵۔ فرات پر دوسرا بڑا انعام، ۶۔ متعدد کتابوں پر چھوٹے بڑے کئی انعامات
سیمینار، مذاکرے اور کانفرنس: فکشن، تنقید، شاعری، تصوف اور مذہب پر صوبائی، ملکی، غیر ملکی، قومی، بین الاقوامی......سینکڑوں سیمیناروں، مذاکروں، اور کانفرنسوں میں، کلکتہ، دہلی، علیگڑھ، الہٰ آباد حیدرآباد، گلبرگہ، ممبئی، سری نگر، جے پور، ٹونک، لکھنؤ، اور امریکہ کے کئی شہروں میں حاضری اور شرکت کا موقع ملا۔
مطبوعہ افسانوں کی تعداد: ۲۰۰ کے قریب
مطبوعہ مضامین: تقریباً ۱۵۰
اردو کی کم از کم 30 تیس انتھولوجیز میں میری مختلف کہانیوں کا انتخاب۔ ہندی میں کم از کم دس کہانیوں کا ترجمہ، مختلف مترجمین نے کیا۔ اس کے علاوہ، انگریزی، پنجابی اور تامل میں کہانیوں کے تراجم چھپے۔
"اماوس میں خواب" کا ترجمہ سید سرور حسین نے کیا، جو پریس میں ہے۔
میری افسانہ نگاری یا ناول نگاری کے حوالے سے جن ناقدین نے مضمون لکھا، یا اپنے مضامین میں حوالے دئے، یا تاثرات تحریری طور پر ظاہر کئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن، قمر رئیس، وہاب اشرفی، دیویندر اسر، ڈاکٹر محمد عقیل، مہدی جعفر، وارث علوی، رام لعل، اقبال مجید، زبیر رضوی، قمر اعظم ہاشمی، افصح ظفر، عبدالمغنی، کلام حیدری، عتیق اللہ، پیغام آفاقی، انور خاں، سلیم شہزاد، حمید سہروردی، سید محمد اشرف، شاہد اختر (افسانہ نگار)، انیس رفیع، عبدالصمد، علی امام، سلطان اختر، شہاب ظفر اعظمی، احمد یوسف، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، اعجاز علی ارشد، منظر اعجاز، مشتاق احمد نوری، صغیر افراہیم، ابوالکلام قاسمی، علی احمد فاطمی، فاروق ارگلی، صدیق الرحمٰن قدوائی، اقبال حسن آزاد، اقبال واجد، معصوم عزیز کاظمی، قدوس جاوید، شافع قدوائی، افروز اشرفی، اسلم جمشید پوری، انور سدید، صبا اکرام، طارق سعید، اسلم حنیف، ڈاکٹر عصمت جاوید، عشرت ظہیر، جوگندر پال، ارتضی کریم، عنوان چشتی، رضا نقوی واہی، اختر اورینوی، جمیل مظہری، شفق، شمس الحق عثمانی، شاہد ماہلی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، نیر مسعود وغیرہ وغیرہ۔ ان ناموں میں ناقد اور تخلیقی فنکار دونوں شامل ہیں۔

پتہ: سرسید کالونی
نیو کریم گنج
گیا: ۸۲۳۰۰۱
9934066720

اقبال حسن آزاد

کا تیسرا افسانوی مجموعہ

پورٹریٹ

شائع ہو چکا ہے
صفحات : ۱۶۰
قیمت : ۱۲۵/روپے
ملنے کا پتہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱

● خاکہ
● عبدالصمد

اب فقط رہ گئی افسانہ طرازی اے دوست

پیارے حسین الحق!

میرا خط وصول کر کے چونکئے مت۔ آخر ہمارے لئے خط کوئی عجوبہ شے تو نہیں۔ ہم تو اس ماحول کے پروردہ ہیں جب ہمیں خط و کتابت کی باقاعدہ تعلیم دی گئی تھی۔ والد کو والد بزرگوار یا والد محترم، چچا کو عموی صاحب، والدہ کو والدہ محترمہ، استاد کو استاد گرامی وغیرہ لکھنا سکھایا گیا تھا اور ہم نے بہت دنوں تک اس پر عمل بھی کیا اور اپنے بچوں کو بھی اس کی تعلیم دی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بچے تعلیم اور روزی روٹی کی تلاش میں گھر کی دہلیز کو پھلانگ گئے تو انہیں سیل، واٹس ایپ اور انٹرنیٹ نے آلیا اور اب تو بچے خط لکھنے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں اور اسے مضحکہ خیز جانتے ہیں۔ خیر، ان باتوں کی اس وقت چنداں ضرورت نہیں ہے، مگر جب بات نکلتی ہے تو دل کا درد کسی نہ کسی صورت جاگ ہی اٹھتا ہے۔

دراصل بہت دنوں سے جی چاہ رہا تھا تم سے باتیں کرنے کو، تمہیں برا بھلا کہنے کو، کچھ سننے کو، یوں کہو کہ 'گلیانے' کو، سو یہ باتیں کسی اور ذریعہ سے کرنا ممکن نہیں تھیں۔ تم میرے واحد دوست ہو جس سے لڑائی کرنے میں بھی مزا آتا ہے اور دوستی کرنے میں بھی۔ اب تو ہمیں یاد بھی نہیں کہ ہمارے درمیان کتنی بار لڑائیاں ہوئیں، ہم ایک دوسرے سے منہ پھلائے رہے، پھر مل گئے۔ کمال یہ ہے کہ کوئی لڑائی بھی دشمنی میں تبدیل نہیں ہوئی، کیا تم اس کو معمولی بات سمجھتے ہو؟ نوجوانی میں تو تم ایک آگ تھے، لڑنا جھگڑنا تمہارا محبوب مشغلہ تھا، ہر کسی کی بات کو کاٹ دینا تمہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ ویسے تمہارے اپنے دلائل بھی کوئی کمزور نہیں ہوتے تھے۔ تمہارے بارے میں مرحوم شاہد احمد شعیب ہنستے ہوئے کہتے تھے کہ حسین سے کبھی یہ نہ کہنا کہ خدا ایک ہے، ورنہ وہ نعوذ باللہ اسے غلط ثابت کرنے پر تل جائے گا۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے، مگر بجھی ہوئی راکھ میں کبھی کبھی چنگاری سلگ اٹھتی ہے۔ دیکھنے والوں اور سننے والوں کو تمہاری جوانی دکھائی دینے لگتی ہے اور انہیں لطف آجاتا ہے۔

تمہیں ہر جگہ، ہر موقع پر اپنے آپ کو منوانے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کا جنون سا تھا۔ اس چکر میں تم کبھی کبھی حدود کو بھی پھلانگ گئے۔ تمہیں بھیڑ چال کا حصہ بننا کبھی پسند نہیں آیا۔ دوسروں کے نقش قدم پر چلنا تمہیں کبھی اچھا نہیں لگا۔ تمہاری شخصیت کا ایک اہم راز اس کا متضاد ہونا بھی ہے۔ تم ایک ایسے خانوادے

کے فرد ہو جو لوبان اور اگربتی کے دھوؤں اور خوشبوؤں سے معمور تھا۔ فاتحہ، درود، میلاد شریف، عرس مبارک، قوالی، حال قال...... خود تمہاری وضع قطع شاہ صاحبوں اور مولویوں جیسی، سر پر دستار بھی بندھ گئی اور ایک حلقہ ارادت بھی قائم ہو گیا۔ مگر تمہارے مزاج کے تضاد اور انفرادیت کے شوق نے تمہیں چین نہیں لینے دیا۔ بنیادی تعلیم تو تم نے مولوی اور عالم تک حاصل کی، پھر انگریزی کے دوش پر سوار اردو میں ایم اے کر لیا، پوری یونیورسٹی میں اول بھی آئے۔ پھر ڈاکٹریٹ، پھر کالج اور یونیورسٹی میں نوکری...... ہر جگہ تم نے اپنی انفرادیت کا جھنڈا مضبوطی سے تھامے رکھا۔ وضع قطع تو نہیں بدلی کہ یہ تمہاری مجبوری نہیں بلکہ تمہاری خاندانی وراثت کا حصہ بن چکی تھی، مگر تمہاری باتوں اور گفتگو سے مولویوں یا شاہ صاحبوں کی بو باس کبھی نہیں آئی بلکہ عقلی اور منطقی بنیادوں پر مسائل اور چیزوں کو پرکھنے والا ایک الگ ہی آدمی برآمد ہوا۔ اختلاف کی گنجائش تو ہر باشعور ذہن کا سرمایا ہوتا ہے، سو تمہاری باتوں سے اختلاف تو خوب کیا جاتا مگر تمہارے دلائل کو یکسر رد کرنا کبھی ممکن نہیں ہوا۔ تمہارے دلائل سننے والوں کے ذہن میں کہیں نہ کہیں اٹک گئے اور رہ رہ کے کچھ سوچنے پر مجبور کرتے رہے۔

تم نے بھی اپنے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بچوں کے رسالوں میں چھپنے چھپانے سے شروع کیا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمہاری تحریر میں پختگی اور مشق کی جھلک نمایاں رہتی ہے۔ میرا ہمیشہ یہ موقف رہا کہ جن لوگوں نے بچوں کے رسالوں سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، ان کے لہجے میں مضبوطی اور فن پر گرفت مسلم ہوتی ہے۔ دراصل شروع ہی سے ایک خاص ادبی ٹریننگ ہو جاتی ہے۔ سن ستر کے بعد تو بچوں کے رسالوں میں بھی وہ دم خم باقی نہیں رہا کہ نئے اور سینئر لکھنے والے بھی ان میں ایک کشش محسوس کریں۔ ہمارے زمانے میں یعنی تمہارے زمانے میں بچوں کے تو ایسے رسالے نکلتے تھے کہ ان کے سامنے بڑوں کے بھی بعض رسالے پھیکے پڑ جاتے۔

تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ جدیدیت سامنے نہیں آئی تھی، جو ادب اس وقت لکھا جا رہا تھا، اس میں بہت کم روشنی اور سرشاری تھی معیاری رسائل یا تو بہت کم نکل رہے تھے یا انہیں زندہ رہنے کے لئے طرح طرح سمجھوتے کرنا پڑتے۔ اس وقت بعض سطحی قسم کے رسالوں کو خوب عروج حاصل ہوا۔ ان کی اشاعت لاکھ کو بھی پھلانگ گئی تھی۔ تم نے اس وقت بھی روایتی قسم کے افسانے نہیں لکھے۔ جدیدیت کا سورج طلوع ہوا تو ایک تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوا، مگر بعد میں جوش اور جنون میں ایسا ادب تخلیق کیا جانے لگا کہ جنہیں پڑھ کر بقول محمد حسن خوف آتا تھا۔ افسانے کے نام پر لکیریں کھینچی جانے لگیں اور شاعری کے نام پر الفاظ اچھالے جانے لگے۔ تم نے جدیدیت کی آب و ہوا میں راحت کی سانس لی اور شاید تمہیں محسوس ہوا کہ تمہیں اپنی انفرادیت کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ اسے پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں تمہاری ٹیڑھی چال کو معنویت کا درجہ حاصل ہوگا۔ مگر ہوا یہ کہ تمہاری فطرت میں ادب کا جو

خالص لہو شامل ہو چکا تھا، اس نے تمہارے قدموں کو بہکنے سے روک دیا۔ تم ایک جدید افسانہ نگار کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب تو ہوئے، مگر اسی دور میں 'شب خون' جیسے رسالے میں تمہارا ایک بے حد معنی خیز اور معیاری افسانہ 'بارش میں گھرا مکان' بھی شائع ہوا جو جدید افسانے کا میگنا کارٹا ثابت ہوا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تمہارے اس نقش قدم پر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ تم نے یوں تو سینکڑوں افسانے لکھے، مگر جب بھی تمہارے افسانوں کا خیال آتا ہے 'بارش میں گھرا مکان' ضرور یاد آجاتا ہے۔

لگ بھگ پچاس برسوں میں تم کبھی تھکے نہیں۔ تمہاری ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تم نے اپنے آپ کو کبھی دہرایا نہیں۔ جدیدیت کے زمانے میں ادب کے ایسے نادر نمونے بھی بے راہ روی کے شکار ہو گئے جنہیں فیشن کا روگ نہیں لگ جاتا تو وہ یقیناً ادب میں اضافہ کا سبب بنتے۔ تمہیں یہ روگ نہیں لگا۔ کیوں بھائی......؟ تمہاری صحبت تو ایسے ہی لوگوں کے ساتھ تھی جو دن رات بے معنی جدیدیت فرد کی تنہائی، معاشرے کی بے حسی، سماج کا کھوکھلا پن اور اسی قسم کی باتوں سے فضا کو 'معطر' کئے رہتے۔ یہ باتیں نہ زمین کی تھیں نہ آسمان کی، شاید معلق بھی نہیں تھیں، پھر کہاں تھیں......؟ اس کا جواب اس وقت بھی کسی کے پاس نہیں تھا، اور آج تو خیر...... مگر تم نے اس ہنگامہ خیزی کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کیسے بچائے رکھا؟ تم تو یوں جواب نہیں دو گے، مگر تمہاری تحریروں میں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اس بات پر مجھے آج بھی رشک آتا ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کلام حیدری جیسے سخت گیر نگاہوں کے مالک نے تمہارے ایک افسانے کے بارے میں جو کرفیو کے موضوع پر لکھا گیا تھا، کہا تھا کہ کمال ہے، افسانہ نگار نے کرفیو لفظ کا کہیں استعمال نہیں کیا۔ افسانہ نگار کی احتیاط اور شعور کی بالیدگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان کا لکھا ہوا اس وقت بھی تمہارے لئے ایک سند کا درجہ رکھتا تھا، آج بھی رکھتا ہے۔ تعداد کی بات کی جائے تو شاید اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ افسانے تم ہی نے لکھے ہیں۔ گو کچھ افسانوں میں تم نے اپنے معیار کو برقرار نہیں رکھا۔ پھر بھی اگر ایک سخت اور غیر جانبدار انتخاب کیا جائے تو تمہارے پاس کم سے کم درجن بھر ایسے افسانے ضرور نکل آئیں گے جنہیں نہ صرف اردو اور ہندوستانی زبانوں بلکہ عالمی معیار کے افسانوں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ اتنے افسانے تمہارے کسی ہمعصر کے ہاں شاید ہی ملیں۔

زبان و بیان پر جو تمہاری غیر معمولی گرفت ہے، اس کی اصل وجہ تمہاری گھریلو اور ابتدائی تعلیم ہے۔ تم نے اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی بھی پڑھی۔ گھر کا ماحول مذہبی ہونے کے علاوہ علمی اور تہذیبی بھی تھا جس کا تم پر گہرا اثر پڑا، اور علم و ادب تمہارے DNA میں رچ بس گئے۔ ویسے تم نے کہیں کہیں اپنے علم کا بے جا فائدہ بھی اٹھایا۔ تم نے طول طویل مذہبی مقالات بھی لکھے۔ یہاں تک تو خیر مولوی اور سجادہ نشیں ہونے کا کچھ جواز بھی ہے، لیکن تم نے شاعری بھی کی، تنقیدی مقالات بھی لکھے۔ یہاں تک

کہ سیاسی مضامین لکھنے سے بھی باز نہیں آئے۔ بھیا تم تو فکشن کے میدان میں اپنا سکہ جما ہی چکے تھے، پھر تمہیں کیا پڑی کہ دوستوں اور ہمعصروں کو دوسرے میدانوں میں بھی رشک وحسد میں مبتلا کرو۔

منہ میں ہر وقت پان بھرے رہنے اور اس سے کام نہیں چلا تو تم نے گل لگا کے چپ رہنے کا آرٹ بھی سیکھ لیا۔ اس آرٹ سے خوب فائدہ بھی اٹھایا۔ جہاں تمہیں خاموش رہ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تم نے اپنے ایجاد کردہ آرٹ سے کام لیا۔ گاندھی جی اپنے مون برت سے بڑی بڑی بلائیں ٹال دیتے تھے اور مصیبتوں میں گھر کر بھی سرخ رو بنے رہتے، سو تم نے بھی یہی کیا، مگر اس وقت تمہیں کیا ہو گیا تھا جب پٹنہ کی ایک ادبی محفل میں تم اپنا افسانہ سنا رہے تھے...... جدید افسانہ، تو صدارت کر رہے ایک ممتاز تنقید نگار نے تمہیں ڈانٹ کے بیٹھا دیا تھا۔ ان کے خیال میں افسانے میں بعض فحش الفاظ کا استعمال ہوا تھا۔ دراصل افسانہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تم چپ چاپ بیٹھ گئے۔ حالانکہ اس وقت تم نے چپ رہنے کا آرٹ نہیں سیکھا تھا اور پان سے تمہاری اتنی گہری دوستی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تمہیں پتہ ہے، اس وقت تمہاری کس قدر شہرت ہوئی تھی، ہر محفل میں اسی کا ذکر تھا۔ جو تمہیں نہیں جانتے تھے، وہ بھی تمہیں جان گئے تھے اور ہم...... یعنی تمہارے عصر تمہاری اس بے جا شہرت سے کس طرح مرعوب ہوئے تھے اور ہمارے دلوں میں بھی خواہش جنم لینے لگی تھی کہ کاش ہم بھی کچھ ایسا ہی افسانہ سناتے، ہم بھی اس طرح بیٹھا دیے جاتے اور ہماری شہرت بھی تمہاری طرح پر لگا کے اڑنے لگتی۔ مگر کیا کیا جائے، یہ سب تو اللہ کی دین ہے یعنی شہرت، وہ بھی بے جا۔

یاد ہے تم کو، اپنی جوانی میں تم کس قدر رومانٹک ہوا کرتے تھے۔ ہر خوبصورت چہرہ، مدہوش کر دینے والی ہر خوشبو، ہر دل فریب پھول اور ہر اچھی چیزیں تمہیں اچھی لگتی تھیں اور تم اپنے اس ذوق لطیف سے خوب محظوظ بھی ہوتے تھے۔ رومانس کے ایک آدھ معاملے میں تم سنجیدہ بھی ہوئے، مگر یہی ایک میدان ہے جہاں تمہیں کماحقہ کامیابی نہیں ملی۔ یہ تمہارا ظرف ہے کہ تم اپنی ناکامی کو اس خندہ پیشانی سے برداشت کر گئے کہ تمہارے ہونٹوں کی سرخ مسکراہٹ پھیکی نہیں پڑی اور تم وہی کے وہی رہے جو کہ تم تھے۔ دینے والے داتا نے اس کے بدلے تمہیں ایسی بیش بہا نعمتوں سے نوازا کہ تم آج بھی بے شمار لوگوں کی نگاہوں میں رشک کا مرکز بنے ہوئے ہو۔ تمہیں نشاط جیسی باوفا، سنجیدہ، بردبار، جفاکش اور خاموش رہنے والی بیوی عطا ہوئی، جس کے سبب تمہاری زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ فرماں بردار، جان چھڑکنے والے، محبت کرنے والے، دل خوش کر دینے والے بچے ملے۔ بیٹوں کے برابر داماد ملے۔ ان سب عطاؤں کے سبب تمہیں ایک ازلی سکون نصیب ہوا۔ تمہیں محسوس ہوتا ہے پیارے کہ اس عمر میں بھی تم کس قدر پرسکون رہتے ہو، ہر طرح کی بے چینی، انتشار، اضطراب، وسوسوں سے کوسوں دور ہو، اس کی وجہ ہے

تمہارے گھر کا سکون، بیوی بچوں سے تمہارا والہانہ پیار، جو تمہیں دنیا کی بہت سی آلائشوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہاں...... اس میں تمہارے پاندان کا بھی ایک اہم کردار ہے جسے فراموش مت کرو۔

تمہاری شخصیت کا ایک ایسا روشن پہلو اس وقت میرے سامنے آیا جب حج کے پونے دو مہینوں کا تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو شاید کبھی نہیں جان سکتا تھا۔ تم پورے سفر اور حج کے ارکان میں اپنی بیوی نشاط کو وہیل چیئر پر لئے پھرے اور تمہاری پیشانی پر سلوٹ کا نام ونشان نہیں آیا۔ میں کئی میلوں کے اس پیدل سفر کو بھول نہیں سکتا جب ہم منیٰ سے مکہ مکرمہ واپس آرہے تھے، ہمارے جسم ہم پر بھاری ہو گئے تھے، مگر تم اس سفر کو پان کی گلوریاں منہ میں دبائے نہایت پرسکون انداز میں طے کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر نے یقیناً تمہیں دوہرے حج کا ثواب عطا کیا ہوگا۔

تم نے دنیاوی حصول کی بیشتر دوڑ سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی کوشش کی اور اپنے معلوم و نامعلوم مقاصد کی طرف یکسوئی سے رواں دواں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہارا ذہن کبھی انتشار اور وسوسوں میں مبتلا نہیں رہا اور اس کو ہمیشہ تر وتازہ رکھ کے تم اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہے۔ بے شک عام روش کے مطابق تمہاری خدمات کا وہ اعتراف نہیں ہوا جس کے تم بجا طور پر مستحق ہو، مگر یاد رکھو کہ تمام اعترافات، اعزازات اور انعامات سے الگ ہٹ کر جو شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، وہ ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ تمہارے اس مزاج کی تشکیل وتخلیق میں تمہارے جنت نشیں والد رحمت اللہ علیہ کا بھی بہت اثر ہے۔ تم پورے کے پورے تو ان کی طرح نہیں بن سکے، مگر بہر کیف تم ان کے بیٹے ہو، تم میں ان کی جھلک دکھائی دے ہی جاتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب تم اپنی ریش مبارک کو کبھی کبھی بڑھا دیتے ہو۔

لو، بھلا، میں تو چلا تھا تمہیں 'گلیانے'، اور بیٹھ گیا تمہاری خوبیاں گنوانے۔ حسین! کوئی انسان بھی بے عیب نہیں ہوتا۔ اس کے اندر خالق دو جہاں نے خوبیاں اور خامیاں دونوں رکھ دی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ترازو کے پلڑے میں کس کا پلڑا جھکتا ہے۔ نیکیوں کے ڈھیر سے یہ نہیں جھکتا بلکہ نیت کا اخلاص اس پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ تمہیں پرسکون اور کامیاب دیکھ کے بہت خوشی ہوتی ہے۔ خدا تمہیں اسی طرح رکھے۔

تمہارا دوست: عبدالصمد

<< ● >>

A- 212,Rajnigandha
Sadaqat Ashram
Patna-800010
07739838768

● پروفیسر وہاب اشرفی

عالمی زہراب اور حسین الحق کے افسانے

(ایک تنقیدی مطالعہ)

پتہ نہیں کیوں جب میں حسین الحق پر تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں تو کئی مسائل مجھے گھیر لیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں مختلف نوع کے اصناف کے ارد گرد گھوم رہا ہوں۔ کوئی ایسی سیدھی لکیر سامنے نظر نہیں آتی جو مجھے احساس دلاتی کہ موصوف کی صحیح تفہیم کا راستہ یہی ہے۔ کافی وقت لگ گیا اپنے ذہن کو ایک سطح پر لانے کے عمل میں، تب مجھے احساس ہوا کہ حسین الحق کے افسانے تو کئی اعتبار سے گوتھک (Gothic) ہیں۔ کہیں کہیں خوفناک کہانیوں سے گزرنے کا تجربہ ہوا، جیسے میں ادب کے اس علاقے میں ہوں جہاں خوف ہو۔ کہیں کہیں Novella کا بھی لطف آیا۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ حسین الحق کوئی گوتھک صنف سے اپنے قاری کو آشنا نہیں کر رہے ہیں، نہ ہی وہ خوف کی دنیا میں پہنچانے کی کاوش میں سرگرم ہیں اور نہ ہی ناویلا تخلیق کر رہے ہیں۔ دراصل حسین الحق کی دنیا آج کی پیچیدہ دنیا ہے، جو سیدھی سادی نہیں ہے، کتنے متضاد عناصر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ جو ہموار نظر آتا ہے وہ ہموار نہیں ہے۔ حسین الحق کا ذہن ان پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہے۔ چاہتا ہے کہ اگر وہ مسائل کو Settle نہ کر سکے تو کم از کم وہ جہات پیدا کرے جہاں یہ سب آئینے کی طرح جھلک جائیں...... وہ لوگ جو زندگی کو سنوارنے اور بنانے کے قوانین بناتے ہیں وہ کوئی اور ہیں۔ خالق نہ کوئی قانون بنا سکتا ہے اور نہ کوئی ایسا دستہ تیار کر سکتا ہے جو منفی صورت حال کو مثبت میں تبدیل کر دے۔ ایسا نہ کر پانے کے باوجود فنکار کوئی ایک قوت ضرور ہے جسے سیاسی بازی گر بھی سمجھتے ہیں اور وہ رہنما بھی جن کی نیت میں خلل نہیں۔ حسین الحق اپنے افسانوں میں منفی سلسلوں کو مثبت کے ایک وسیع اور شفاف آئینے کے سامنے رکھ دیتے ہیں، اب اپنی اپنی بصیرت ہے، کون کیا دیکھ سکتا ہے اور کیا حاصل کر سکتا ہے یہ قاری کی صلاحیت پر منحصر ہے اس لئے کہ تاثرات مختلف وضع اختیار کر سکتے ہیں۔ حسین الحق کے فکر کی تفہیم میں اس رمز کو پانے کی شاید پہلی اور کلیدی ضرورت ہے۔ وہ اس ضرورت کو کس طرح عملی جامہ پہناتے ہیں اس کے لئے حسین الحق کے کسی مجموعے کو اٹھا لیجئے۔ مجموعہ ''سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ'' کا پہلا افسانہ تیس صفحات پر مشتمل ہے جس کا عنوان ہے ''کوس کوس پر پہرہ بیٹھا'' جبکہ ''سوئی کی نوک پر رکا لمحہ'' سات صفحے میں ختم ہو جاتا ہے۔ کسی افسانہ نگار کا ایک بڑا مسئلہ سامنے یہ آتا ہے کہ

کوئی افسانہ کتنا طویل ہو سکتا ہے یا اس کے اختصار کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے؟ حتمی جواب شاید کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اب مختصر ترین افسانہ یا افسانچہ یا فسانہ ایک سے چند سطور پر مشتمل ہو سکتا ہے جبکہ طویل افسانے پچاس صفحات سے زاید کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اب پڑھنے والوں کا نہیں ہے۔ دراصل افسانہ نگار کا ہے کہ وہ اپنے موضوع کی ترسیل کیسے کر سکتا ہے اور کیسے تیور اختیار کر سکتا ہے؟ ہم سبھی جانتے ہیں کہ سمرسٹ مام (Somerset Maugham) نے اپنے مجموعے ''کمپلیٹ شارٹ اسٹوریز'' (Complete Short Stories) میں لکھا تھا کہ کہانیوں کو کم سے کم سولہ سو الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ بیس ہزار پر۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آج بھی افسانے انہیں دونوں حدود کے درمیان لکھے جا رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض فنکار اپنی سی سوچتے ہوئے کسی ضابطے کے اسیر نہیں۔

جب میں افسانہ 'کوس کوس پر پہرہ بیٹھا' کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے کئی جگہ اس کا احساس ہوا کہ اس کے کردار اصل حادثات وسانحات کی بازدید کر رہے ہیں۔ اس بازدید میں ایک ایسا منظر نامہ سامنے آتا ہے جو بے حد غمناک ہے اور ہورر (Horrer) کی فضا بھی قائم کرتا ہے۔ بسے بسائے گھر کس طرح اجڑتے ہیں؟ امن وسکون کیسے چھن جاتا ہے؟ پرتشدد حالات کیوں کر زندگی کا لمحہ لمحہ گھناؤنا بنا دیتے ہیں؟ وغیرہ سے ہم روز آشنا ہوتے ہیں، خصوصاً جنہیں تقسیم ہند کا سامنا ہوا ہے اور وہ ایسے غضبناک حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہوں گے، بعض صورتوں میں تو اپنے ہی نہیں، احباب، رشتے ناطے دار، پڑوسی، دوست دشمن سب کی معنویت بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ حسین الحق کسی ایک پہلو کو سامنے نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں یوں ہے جیسے پردۂ سیمیں پر کوئی سلائڈ (Slide) دکھائی جا رہی ہے۔ میں ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے حسین الحق کی سوچ اور فکر کی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بڑی بات کو بعض حوالوں سے وہ کس طرح موثر بناتے ہیں۔ اس عمل میں وہ خواہ مخواہ ذی علم بننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ نہایت رواں دواں اور سہل انداز میں اپنے موقف کا اظہار کر دیتے ہیں جو افسانے کا مرکزی موضوع نہ بھی ہو تو ضمنی ضرور ہوتا ہے:

''اور وہ عالم بہشت کے محلوں کا سبق یاد کراتا ہے اور اس کے ثنا خواں ہندوستان میں عشق کو ملعون گردانتے ہیں اور پاک پٹن کا فرید اکہتا ہے کہ آدمی کے تمام اعضا عشق سے گوندھے گئے ہیں کیونکہ یہ تمام ولولہ عشق کا ہے جو عاشقوں میں پایا جاتا ہے اور وہ ازل سے ابد تک ''ارنی اُنظر'' کا دم بھرتے ہیں اور خود میں نے بھی آثار الاولیا میں لکھا دیکھا کہ خلیل علیہ السلام کو ایسی محبت تھی کہ محض محبت کی وجہ سے اپنے فرزند کو قربان کرتے تھے، اسی وقت حکم آیا کہ اے ابراہیم! تحقیق ہو گیا کہ تم میری محبت میں ثابت قدم ہو۔''

''پس لعنت ہو مجھ پر کہ میں ثابت قدم نہ رہ سکا۔'' رجائی بدبدایا اور سسکیوں

میں گرفتار ہوا۔''

''تو کا ہے میں ثابت قدم نہ رہ سکا بھائی، کچھ اپنا حال سنا؟'' مبشر نے اسے پھر کریدا۔

''پیارے مبشر رجائی جس حد تک کہہ سکتا تھا، میں نے کہہ ڈالا، پر یہ اندھیری رات ہنوز چاروں کھونٹ تنی ہوئی ہے، تو اپنے جی کو مخمصے اور افسوس میں نہ ڈال اپنا حال بیان کر اور اپنے من پہ رکھا بوجھ اتار۔''

> تب اس بات پر مبشر رجائی پھر مخمصے اور شک میں گرفتار ہوا، جانے یہ کون ہے جس کا نام اسمٰعیل مرچنٹ ہے، کیا یہ واقعی اسمٰعیل مرچنٹ ہے؟ سارے میں مکر کا کاروبار پھیلا ہوا ہے، ایسے میں اس کے خلوص کی کسوٹی کیا ہے؟ یہ بھی جدا ہو جانے والے 'رفیق گمشدہ' کی طرح سفر کے بیچ ہی ملا تھا، وہ تو جدا ہو گیا، پر یہ کون ہے جو ہنوز ساتھ ہے، اس عرصہ محشر میں جہاں ہر پل جدائی تقدیر ہے یہ کیسا رفیق ہے جو جدا نہیں ہوتا۔''
>
> (افسانہ: کوس کوس پر پہرہ بیٹھا)

ان سطور کو غور سے پڑھیئے پھر اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ اس حوالے میں متعلقہ لوگوں کے وطن کی مٹی کی خوشبو کس طرح ابھر رہی ہے۔ کسی کردار کی ندامت جھلک رہی ہے، کسی کی جدائی کا المیہ سامنے آ رہا ہے۔ دراصل شاعر کی طرح حسین الحق بھی ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ ''برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است'' اور صرف اس شق کے حوالے سے حسین الحق کے فن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مجھے یہاں ایک بات کہنے دیجئے کہ جب میں یہ افسانہ پڑھ رہا تھا تو ایڈگر ایلن پو (Edger Allan Poe) کا شاہکار The Fall of the House of Usher ذہن میں گونج رہا تھا۔ دونوں میں مطابقت اس حزن و انتشار کی ہے جو متعلقہ عہد کا خاصہ رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حسین الحق Poe ہیں یا وہ کسی طور بھی Detective اصول اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ حسین کے بعض افسانوں میں ٹیرر (Terror) یا خوف کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ پو (Poe) کا افسانہ دراصل ایسے ہی معاملات کی خبر دیتا ہے جو حسین الحق کا موضوع ہے۔

حسین الحق روزانہ کے واقعات کی جھلک دکھلا رہے ہوں یا تقسیم کا المیہ پیش کر رہے ہوں، بہت سارے حوالے ان کے ذہن میں ہوتے ہیں جنہیں ان کی تخلیقی قوت ہم آمیز کر دیتی ہے۔ ان کے یہاں براہ راست فلسفیانہ مباحث کا عمل نہیں ہے لیکن فلسفیانہ طرز ادا ضرور ہے۔ ویسے تو ہر افسانہ نگار اپنی فکر کے اعتبار سے فلسفے کے دائرے میں ہوتا ہے جس کی نگاہیں بہت سے حوالوں سے ٹکراتی ہیں۔ یہ صورت حسین

الحق کے یہاں جا بجا ابھرتی رہتی ہے جس کی نشاندہی کم از کم میرے لئے اساسی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے میں اسی افسانے کا ایک اور اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں، ملاحظہ کیجئے:

> ''شکاری کتوں کا گھیرا ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا اور ہمارے پاس سرحدوں پر جا کر بغیر سوچے سمجھے قتل کرنے یا قتل ہونے کے علاوہ اگر کوئی چارہ' کار تھا تو صرف یہی کہ ہم مخبس کا خیر مقدم کریں، پس ہم نے اپنا رخ موڑا اور اہرام کے سائے میں پناہ کے طالب ہوئے، مگر فضا ہر جگہ زہر آلود اور مسموم ہو چکی ہے اور علاقائی قومی مفادات انسانی جان اور تحفظ پر فتح پا چکے ہیں، سو ہمیں وہاں سے الٹے پاؤں واپس ہونا پڑا، آگے بڑھے تو افلاطون اور ارسطو یاد آئے مگر جو حال عین کا وہی غین کا، لے دے کے ہمارے پاس سارترے بچ رہا تھا، باقی دوست ابھی راہ میں ہوں گے، بصرف میں کاٹھمنڈو کی ترائی سے نیچے اتر آیا اور کاسمو پولیٹن کے چکر میں عروس البلاد کا رُخ کیا مگر وہاں بھی مہاماری پھیلی ہوئی تھی......اور تب ایسے میں تم آن ملے۔''
>
> (افسانہ: ''کوس کوس پر پہرہ بیٹھا)

کوئی بھی محسوس کر سکتا ہے کہ صورت حال کیا ہے کوئی جگہ پر سکون نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر محاذ پر شکاری کتنے پیچھا کر رہے ہیں اور لازماً قتل ہونے کی منزل سامنے آ گئی ہے۔ ایسی زہر آلود اور مسموم فضا میں کیسے کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ کہیں علاقائی اور قومی مفادات قاتل ہو گئے ہیں تو کہیں کچھ اور، ایسے میں افلاطون کیا دے سکتا ہے اور ارسطو کیا؟ ہاں سارترے کے یہاں جائے پناہ مل سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وجودی مفکر ہے اور کیکرے گارد (Kierkegeard) اور ہسرل (Husseral) کا ذہنی ہمنوا۔ لیکن یہاں وجود پر کوئی بحث نہیں بلکہ اس حرماں نصیبی کا المیہ ہے جو انسانی سرشت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اب تو انسانی طبائع کا فساد نمایاں ہے۔ ایسا ہی حزنیہ کلچر حسین الحق کے افسانے کا قوام بناتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حسین الحق سارترے کے ہمنوا ہیں بلکہ جس طرح وہ انسانی آلام کو پیش کر رہے ہیں وہ اس فکر کا پتہ دیتے ہیں جس کا رشتہ کہیں نہ کہیں سارترے سے ملتا ہے۔ لہٰذا موصوف کا حوالہ لایعنی نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ایسے حالات میں مفکرین کا یاد آنا کچھ لاشعوری عمل محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ فکری میلان کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے۔

اس حوالہ جاتی پُر تاثر بیان سے الگ ہوتے ہوئے افسانہ ''سوئی کی نوک پر رکا لمحہ'' کی طرف توجہ کیجئے۔ اس کا ایک سرسری مطالعہ بھی قاری کو سیموئل بیکٹ (Samuel Becktt) کے ویٹنگ فار گودو (Waiting for godot) کی طرف مائل کرے گا۔ افسانے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''وہ تین، سائیکر اٹوفل۔ بھرتن تاؤ اور سشتمیر اسٹیج پر بیٹھے ہیں۔ اسٹیج کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ یا تو کھلا آسمان ہے اور آسمان کے نیچے کچھ بھی نہیں ہے، یا چاروں طرف سے بند ایسا ہال ہے جس میں ہوا آنے جانے کے لئے بھی کوئی سوراخ نہیں، یا شاید ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسری کیفیت ہو۔

جس مقام کا تذکرہ ہے، وہاں سامعین کے بیٹھنے کی جگہ سب کرسیاں الٹی پڑی ہیں میزیں الٹی ہیں اور تمام الٹی کرسیوں اور میزوں کا رُخ اسٹیج کی مخالف سمت میں ہے۔ ڈائس پر سائیکر اٹوفل بھرتن تاؤ اور سشتمیر ایک دوسرے کی پشت سے پشت ملائے بیٹھے ہیں۔ اس طرح کہ اگر دیکھنے والے ہوتے، تو یہ ان کی مخالف سمت میں ہوتے۔

تینوں گفتگو میں مصروف ہیں۔

بھرتن تاؤ: اب روشنی ہونی چاہئے۔

سائیکر اٹوفل: کیا روشنی نہیں ہے؟

سشتمیر شاید ہے یا شاید نہیں۔'' (افسانہ: سوئی کی نوک پر رکا لمحہ)

اب آپ ویٹنگ فار گودو میں اس صورت واقعہ کو دیکھئے۔ اس کے دو کردار اسٹرا گون (Estragon) اور ولدیمیر (Valdimir) کو بس اتنی سی فکر ہے کہ گودوٹ یعنی گودو آئے گا یا نہیں؟ اس کی آمد کے سلسلے میں یہ دونوں ہی امید وبیم کے شکار ہیں۔ لیکن ہر حال میں نتیجہ ایک قسم کے تعطل کا استعارہ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ دونوں کردار دکھ، افلاس یا موسموں کے اثرات سے بے خبر ہیں۔ لیکن وہ ان کے بارے میں مضحکہ خیز خیالات رکھتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ بیکٹ نے اس میں فرائڈین نفسیات، کرسچن اساطیر اور وجودی فلسفے کے ادغام سے زندگی کی لایعنیت واضح کی ہے۔ اب حسین الحق کے تین کردار سائکر اٹوفل بھرتن تاؤ اور سشتمیر کو دیکھئے۔ سب سے پہلے تو ان تینوں کردار کے نام اچنبھے میں ڈالتے ہیں۔ ان کے بیٹھنے کا انداز بھی کچھ عجیب سا ہے۔ کرسیاں تو ہیں لیکن سب الٹی ہیں اور میز مخالف رُخ پر رکھی گئی ہیں۔ پورا منظر حیرت زا ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ آگے چلئے تو سشتمیر اس طرح ہنستا ہوتا ہے جیسے وہ رو رہا ہو۔ ان کی باتیں بھی عجیب موضوعات رکھتی ہیں۔ عجیب اس لئے کہ سامنے کے مسائل مضحکہ خیز صورت میں ابھارے جا رہے ہیں پڑھنے لکھنے کی بھی باتیں ہوتی ہیں۔ جرم وقصور اور سزا وجزا کے موضوعات سامنے آتے ہیں۔ منصفی کا رمز بھی ابھرتا ہے۔ معصوموں کو بچ کہا جانا سشتمیر کو حیرت میں ڈالتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے خیال میں یہی ریڑھ کی ہڈی ہیں، نیو کی اینٹ ہیں۔ ان کرداروں کو ایسے واقعات اور ایسے سنگین حالات سے غصہ بھی آتا ہے۔ بھرتن تاؤ سائیکر اٹوفل پر وار کرتا ہے، لیکن ٹوفل نہ چیختا ہے اور نہ چلاتا ہے اور بے ہوش

ہو کر گر پڑتا ہے۔ بھرتن، سائیکر اٹوفل کی بے ہوشی سے متاثر نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر تھوک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ناظرین کی گیلری کی طرف مخاطب ہو کر زور زور سے کہتا ہے۔ کیا کہتا ہے، یہ آپ بھی سنئے:

''پچھلی متعدد گہری اندھی راتوں سے یہی تماشا جاری ہے۔ آج جو کچھ ہوا، اس میں سے کچھ بھی نیا نہیں...... تم! گدھوں کی اولاد...... تم کو نہ کل کچھ معلوم تھا نہ آج...... نعرہ لگا کر گھر میں گھس جانے والے بزدلو! ایک مثال نہیں کہ ان نے جو آج باہر نہیں ہیں، اور ان نے جو آج باہر ہیں، کسی نے بھی سامنے آکر مقابلہ کیا ہو، تم بھی مقابلے پر نہیں آسکتے...... وہ دور گزر گیا جب کلکتہ میں تالاب کے چاروں طرف محاصرہ رہتا تھا اور تالاب کے اندر لڑکے اور لڑکیاں رات رات بھر جاڑے کی ٹھٹھرتی راتوں میں اس حصار میں بزدلانہ مفاہمت کے بجائے ڈبکیاں لگایا کرتی تھیں...... تم...... آخ تھو......'' (افسانہ: سوئی کی نوک پر رکا لمحہ)

یہاں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہے اور انسان جس بے حسی کا شکار ہے اس کی بھی ایک تصویر ہے۔ پہلے سرفروشی کسے کہتے تھے اس کی بھی مثال پیش کی گئی ہے۔ لیکن یہ سچائیاں ہیں جو Absurd بن کر سامنے آتی ہیں۔ ایسے حالات مستقل ہیں اور اب انسانی رویے کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس طرح بھرتن تاؤ اور سشتمیر کے عوامل سے زندگی کی بے معنویت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ آخر کا یہ منظر دیدنی ہے:

سشتمیر آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتا ہوا اسٹیج سے نیچے اتر کر دیکھنے والوں کی گیلری کی طرف بڑھ رہا ہے...... بھرتن تاؤ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سشتمیر کی طرف دیکھ رہا ہے...... چہرہ اندرونی کرب کا مظہر...... ایسا لگتا ہے جیسے وہ کچھ کرنا چاہتا ہے مگر اپنے اعمال پر خود قادر نہیں...... سشتمیر کی طرف رُخ کر کے منہ کھولتا ہے مگر آواز نہیں نکلتی...... پورا منہ پھاڑ دیتا ہے لیکن آواز غائب...... بڑی مشکل سے پھنسی پھنسی دبی دبی آواز نکلتی ہے...... سشتمیر آگے بڑھتے بڑھتے رک جاتا ہے، پلٹ کر بھرتن تاؤ کی طرف دیکھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے:

''ایک بے چین سور ایک پرسکون سقراط سے بہتر ہے برتن تاؤ!''

پھر آگے بڑھ جاتا ہے...... کچھ دور چل کر پھر رکتا ہے اور پلٹ کر کہتا ہے:

''فیصلے کی گھڑی قریب آپہنچی، ٹامک ٹوئیاں مارنا تاریخی جرم ہے۔''

بھرتن تاؤ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا ہے جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے

ہوں...... لیکن چہرہ اندرونی کرب کا مظہر ہے...... شدید تکلیف کے آثار نمایاں...... کبھی (شاید سشتمیر کو آواز دینے کے لئے) منہ کھولتا ہے، پھر بند کر لیتا ہے...... پھر کھولتا ہے...... پھر بند کر لیتا ہے...... کبھی ذرا سا ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور پھر جلدی سے پیچھے کھینچ لیتا ہے......''

سائیکر اٹوفل بے ہوش پڑا ہے۔

سشتمیر ناظرین کی گیلری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ناظرین کی گیلری خالی ہے، سب کرسیاں ٹیبل اور میزیں الٹی پڑی ہیں۔

اور......

اور اسٹیج کی کیفیت جیسی تھی ویسی ہی ہے۔!!'' (افسانہ: سوئی کی نوک پر رکا لمحہ)

گویا یہاں بے حسی سے زیادہ بے بسی کی کیفیت ہے۔ کسی چیز پر کسی کو اختیار نہیں۔ اور جب کوئی شخص اختیار سے عاری ہو تو وہ کس حد تک معطل ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حسین الحق نے ایک عجیب جملہ رقم کیا ہے جو اپنی معنویت کے اعتبار سے نہ صرف ہمہ پہلو ہے بلکہ زندگی کی سوچ اور فکر نیز اس کے نتائج کی بھی خبر دیتا ہے۔ سشتمیر کہتا ہے کہ ایک بے چین سور ایک پرسکون سقراط سے بہتر ہے۔ یہاں عمل اور حرکت کا جو منظر نامہ ابھارا گیا ہے یا جس کا سبق دیا گیا ہے وہ لازماً Quotable مزاج رکھتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ علمی جملہ خود افسانہ نگار کی علمی زندگی کا اشاریہ (Index) ہے۔ صرف علم سے کچھ نہیں ہوتا۔ علم کو باعمل ہونا چاہئے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ایک Absurd افسانہ کے اندر ایسی علمی بات کا دخل عمل ہے؟ لیکن یہ سچ ہے کہ مضحکہ خیز واقعات میں اعلیٰ ترین ذہنی وفکری آفاق پیدا کرنا فنکار ہی کا کام ہے، اور وہی اسے بطریق احسن انجام دے سکتا ہے۔ لیکن لیکن ذرا ٹھہر کر ''ویٹنگ فار گودو'' کی طرف واپس آیئے۔ ڈرامے کے اختتام میں بس یہ ہوتا ہے کہ اسٹرا گون اب اپنی جگہ سے کہیں دور نکل بھاگنا چاہتا ہے۔ لیکن ولدیمیر کا مشورہ ہے کہ پہلے وہ پوڑو (Pozzo) اور لکی (Lucky) کھیل لے۔ (واضح ہو کہ یہ دونوں کردار بھی) ایسے ہی الجھے ہوئے ڈائیلاگ کے ساتھ لکی پوڑو سامنے آجاتے ہیں۔ لکی گر جاتا ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ پوڑو کو کھینچتا ہے۔ ولدیمیر کچھ ویسا ہی کھیل کھیلنا چاہتا ہے لیکن آخر میں اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے سوائے مضحکہ خیزی کے اور آخرش وہ بس گودو کا انتظار کرتے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ انتظار کرنا ہی ان کا مقدر ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو سزا کے مستحق ہوں گے۔ اور پھر اسٹرا گون اور ولدیمیر یہ کہتے ہوتے ہیں کہ اس منظر نامے میں صرف درخت زندہ ہیں اور اسی زندہ درخت میں وہ پھانسی لگانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا کرتے نہیں (عمل

سے سارے کرداروں کا بُعد ظاہر ہے) اور اپنے منصوبے کو یہ کہتے ہوئے تعطل میں ڈالتے ہیں کہ اگر آنے والی شب میں بھی گودو نہیں آیا تو وہ لازماً پھانسی لگالیں گے اور تب وہ یہاں سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن حرکت نہیں کر سکتے۔ بیکٹ نے حرکت وعمل کی منفی صورت کو وجودی فکر سے اس طرح ہم آمیز کر دیا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے جزو ہو گئے ہیں۔ زندگی کی مضحکہ خیزی صرف بیکٹ کا مدعا نہیں ہے بلکہ انسانی افعال کا انفعال بھی اس کے مرکز نگاہ میں ہے اور یہ وجودی فکر کا ایک کلیدی پہلو بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ حسین الحق ایسا کچھ کرنا نہیں چاہتے، لیکن بے بسی، بے کسی اور ناہمواری کی کئی صورتیں سامنے لانے میں یقیناً بے حد کامیاب ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جدیدیت کے علمبردار جو وجودیت کے فکری مباحث کو لے کر چلنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں وہ حسین الحق کے اس افسانے سے بے خبر رہے ہیں۔ حالانکہ وجودی افکار کی تخلیقی کیفیت کیا ہو سکتی ہے اس کی ایک اچھی مثال حسین الحق کا متذکرہ افسانہ ہے۔ افسوس کہ اس افسانے کے حوالے سے حسین الحق کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں حسین الحق کو ایڈورڈ البی (Edward Albee) ژاں ژینے (Jean Genet) ہیرولڈ پنٹر (Harold Pinter) ویک لیو ہیل (Vaclv Havel) کی سطح پر رکھ رہا ہوں۔ نہ میں انہیں کافکا اور کامیو کے آس پاس بیٹھا رہا ہوں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ وجودی افکار پر ایسے معیاری افسانے کی اردو کے علمائے نقد کو خبر ہونی چاہئے ورنہ چند ناموں کے حصار میں رہنے کے باعث ان کی ساری کارگزاری باطل قرار پا سکتی ہے۔ بہر حال مجھے محسوس ہوتا ہے کہ باشعور فنکار مختلف سمتوں کی طرف جست لگا سکتا ہے اور کامیابی کے ساتھ۔ حسین الحق کے افسانے اس کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ حسین الحق کی وجودی فکر ایک آدھ افسانے پر ہی محیط ہے ''پس پردہ شب'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک افسانہ ہے۔ ''منظر کچھ یوں ہے'' اس کے بعض جملے دیکھئے:

(۱) سب کچھ واضح، کچھ دھندلا، کچھ روشن روشن، کچھ مدھم مدھم......''

(۲) یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ ڈرامہ دیکھنے والوں کے بغیر بھی دکھایا جائے گا۔

(۳) جہاں یہ اسٹیج تیار کیا گیا ہے اس کے چاروں طرف قناتیں گھیر دی گئی ہیں اور یوں گھیر دی گئی ہیں کہ داخلے کے تمام راستے مسدود ہیں۔

(۴) اسٹیج پر چھوٹے بڑے مکانات کا سلسلہ دور دور تک چلا گیا ہے، جن میں سے ہر دروازے پر بڑے بڑے قفل پڑے ہیں اور باہر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے، ہر مکان میں کچھ نہ کچھ افراد ضرور ہیں، بعض

مکانات سے بعض بچے باہر آنا اور باہر بکنے والے نت نئے غباروں سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں لیکن ان کے بزرگ دبی دبی آوازوں میں ان کو ان کے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، بچے مچلتے ہیں اور منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں، لیکن بزرگوں کی کوشش یہی ہے کہ ان کی آواز باہر نہ جائے، بعض مکانات میں کچھ افراد ساکت و جامد اونگھ رہے ہیں، بعض کے ہاتھ پشت پر ہیں اور منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا ہے۔"

بہت سے دوسرے اقتباسات درج کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں کتنے ہی Absurd واقعات پیش کئے گئے ہیں، جن سے زندگی کی لایعنیت اور کئی احمقانہ صورتیں واضح ہوتی ہیں۔ لیکن میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا، نہ میں اس افسانے کو کافکا کی کسی تحریر سے موازنے کی جہت دکھا کر حسین الحق کو آفاقی افسانہ نگار کہوں گا۔ مقصد بس اتنا ہے کہ حسین زندگی کے ناہمواری کو دیکھنے کی تیز حس رکھتے ہیں۔ اس عمل میں وہ میکانیکی نہیں بنتے۔ زندگی کی لایعنیت یا بے معنویت ان کے فکر کی ایک جہت ہو سکتی ہے لیکن وہ اس کے دوسرے رخ کی بھی خبر رکھتے ہیں دراصل حالات سے آشنائی کئی پہلو رکھتی ہے، منفی بھی اور مثبت بھی۔ وہ جو فلسفی ہوتے ہیں وہ کسی ایک شق پر اپنی گرفت رکھتے ہوئے اسی کے خوشہ چیں اور ہم نوا بن جاتے ہیں اور ساری زندگی اس کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن خالق کی فکر تو ہمہ جہت ہوتی ہے۔ حسین الحق بنیادی طور پر خالق ہیں اسی لئے ہمہ جہات ہیں۔ میں نے ابھی ابھی ان کے وجودی افکار کی نشاندہی کی تھی، لیکن اب دوسرے رخ کی طرف راجع ہوتا ہوں۔

حسین الحق کا ایک افسانوی انتخاب "بارش میں گھرا مکان" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک افسانہ ہے "بہ امید آں کہ روزے" کہا جاتا ہے کہ آج کا مغربی فکشن تلاش کا فکشن ہے، جس میں فنکار اپنی ذات کے حوالے سے تہذیب و ثقافت کی حقیقی تصویریں اتارنا چاہتا ہے اور اپنی ذات ہی کے منظر نامے میں کائنات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ روش بہتوں کو بھا گئی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی نگارشات پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے میں بہت دنوں سے اس پر اصرار کر رہا تھا کہ محترمہ کا فن پروستن ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ لیکن آخرش خود محترمہ نے ایک انٹرویو میں اس کا اعلان کیا کہ ان کا ادب پروستین ہے۔ دراصل ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ پروست کی تحریروں سے غایت متاثر رہی ہیں۔ میں اگر آج یہ کہوں کہ اس عمل میں حسین الحق بھی شریک ہیں تو کچھ مضحکہ خیز صورتیں سامنے آئیں گی اور بعض تو میرا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے حسین الحق کے بعض افسانے دراصل اپنی ذات کو ٹٹولنے کا عمل ہیں اور وہ خود اپنے حوالے سے زندگی کے رموز تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس افسانے کا میں نے حوالہ دیا ہے وہ چند صفحات پر محیط ہے۔ کوئی بہت اہم افسانہ بھی نہیں۔ لیکن

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسین الحق آہستہ آہستہ اپنی ذات سے ایک بڑا کینوس تیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن افسانے میں یہ عمل ہو نہیں سکتا۔ اس لئے انہوں نے اشارے کنایے میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے کے ساتھ ساتھ "بارش میں گھرا مکان" کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ حسین الحق اپنی مٹتی ہوئی تہذیب اور ثقافتی زندگی کے ایک غمگسار نباض اور مورخ ہیں۔ متعلقہ افسانے میں ایک خاندان کے حوالے سے تہذیبی زندگی کے زوال کی ایک ایسی موثر تصویر کشی کی گئی ہے کہ اختتام پر ایک عالم خیال روشن ہو جاتا ہے اور دل پر چوکا سا لگتا ہے کہ ہمارے مٹتے ہوئے نشانات کبھی کتنے اہم رہے ہوں گے۔ ہمارے بوسیدہ مکانات اب تاریخی حوالے ہیں جن کے اندر اور باہر کے حصے پرانی داستان سناتے رہتے ہیں۔ زوال کا ایسا منظر حساس ذہن و دماغ کو متاثر کرتا ہے اور کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کی طرف راغب بھی۔ افسانہ نگار کہیں کوئی ایسی تلقین نہیں کرتا لیکن متون میں ساکت اور معطل زندگی کے خلاف دبی دبی سی آواز بھی ابھرتی ہے، جو صرف ملتہب دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ایک جزوی منظر آپ بھی دیکھئے:

"اوپر...... کمرے کا دروازہ چوکھٹ سے بے نیاز تھا، اور آثار قدیمہ کا بیش قیمت سرمایہ، کمرے کا فرش اور در و دیوار کبھی پختہ رہا ہوگا لیکن اب تو اس کی حالت دروازے سے بھی بدتر تھی۔ کمرے میں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، معلوم ہوا کہ ایک پر صاحب خانہ کے والد، ایک پر والدہ اور ایک پر چھوٹا بھائی سوتا ہے۔ چھوٹے بھائی کے بستر پر نصابی کتابوں کے علاوہ روسو کی اعترافات، اور سارتر اور کامیو کی تخلیقات اور کچھ Absurd ڈرامے رکھے ہوئے تھے۔ والد کی پلنگ کے پاس والے طاق پر تسبیح، تیمم کی مٹی، بہت سارے تعویذ اور گنڈے اور ان کے والد کے زمانے کی ایک کاپی رکھی ہوئی تھی۔ جس میں خاندان کا نسب نامہ، ہر مرض کی دعا اور مجرب نسخے درج تھے۔

کمرے کی تین دیواروں میں پرانے طرز کی بے کواڑ کی الماریاں بنی ہوئی تھیں جن میں بڑی بڑی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ اوپر دیکھا تو کھونٹیوں پر کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ایک سمت جدھر الماری نہیں تھی، تین کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن سے شاید کبھی ٹھنڈی ہوا اور بارش کی پھوار آجاتی ہو، ایک دروازہ جو چھت پر کھلتا تھا، بند تھا۔ میں نے کھولنا چاہا تو قبضے سمیت دیوار سے نکل آیا۔ مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی، میں نے سمجھا شاید میں نے ہی توڑ دیا لیکن صاحب خانہ نے یہ کہہ کر میری شرمندگی کچھ کم کر دی کہ "یہ پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا ہے"۔

شاید اس منظر کو دیکھنے کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ہماری قدروں کے زوال کے بہت سارے پہلو اس افسانے کے اجزاء ہیں، جن سے کسک اور تڑپ کی کیفیت ابھرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں "خارپشت" کا مطالعہ کیجئے تو ایک نئی دنیا سامنے آئے گی۔ یہ مجموعہ "سوئی کی نوک پر رکا لمحہ" کا ایک افسانہ ہے۔ قدرے طویل ہے۔ بظاہر اس کے کلیدی اور مرکزی فکر تک رسائی آسان نہیں ہے۔ لیکن کچھ ایسا ابہام بھی نہیں کہ اس میں ترسیل کی ناکامی کا سوال اٹھایا جائے۔ افسانہ معمولی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔ چند دوستوں میں ایک شخص اپنی کھجلی کی وجہ سے مورد عتاب ہے۔ دوست اسے چھیڑتے ہیں۔ اسے شادی کر لینے کی تلقین کرتے ہیں اور وہ ہر بات پر نہ صرف خفا ہوتا ہے بلکہ ان دوستوں سے بیزار بھی رہنے لگتا ہے۔ انہیں دوستوں میں سے ایک دوست پامسٹری کا کچھ علم حاصل کر لیتا ہے۔ وہ خارش زدہ دوست کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ تیار نہیں، آخرش لوگ اسے پکڑ لیتے ہیں تب اس کی ہتھیلی ہی نہیں بلکہ جسم کے بعض اجزا ابھیانک صورت میں اس کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں۔ پھر وہ شخص اپنے مرض کا اس طرح شکار ہو جاتا ہے کہ اپنے ہی جسم کی گرمی اسے ہر لمحہ بے چین کئے رہتی ہے۔ وہ دوستوں سے کہتا ہے کہ اس نے سنا ہے کہ قبر کی مٹی ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ لہٰذا اسے قبرستان لے جایا جائے اور ممکن حد تک اسے دفن کیا جائے۔ دوست اس کی بات مان لیتے ہیں اور اب وہ قبر میں اس طرح مدفون ہے کہ صرف اس کی گردن سے اوپر کا حصہ دیکھا جا سکتا ہے۔ دوست جب اس کام سے فارغ ہو جاتے ہیں تو وہاں کتے یلغار کرتے ہیں اور پھر یہ عمل شدید ہوتا جاتا ہے۔ کتوں کے ساتھ دوسرے جانور بھی مل جاتے ہیں جو آپس میں پرخاش رکھتے ہیں۔ اب یہ دونوں مسلسل اس پر وار کرتے ہیں لیکن وہ گردن سے ہی اپنی مدافعت کرتا رہتا ہے۔ تشدد کی تیزی کے ساتھ مزاحمت بھی بڑھتی جاتی ہے اور آخرش وہ اپنے کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو کر شہری علاقے میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اس کی دہشت ہے، جہاں اس کے خوف سے سبھی پریشان ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں گشت کرتی رہتی ہیں اور اس کی ہیبت ناک کارکردگی کو لوگ پیش کرتے رہتے ہیں۔ پولیس تعینات رہتی ہے لیکن خوف کا عالم سارے شہر پر طاری ہے۔ تب اس کی ملاقات ایک دوست سے ہوتی ہے۔ ملاقات ہونے پر خارش زدہ اسے سخت سست کہتا ہے اور یہ صورت کئی بار سامنے آتی ہے۔ لیکن آخری مرحلے میں افسانہ اس طرح ختم ہوتا ہے:

"دیکھ لو غور سے دیکھو، میں ہوں ...... تمہاری بزدلی کا زندہ شاہکار، جو آج اپنے بھرپور تعفن اور ناقابل برداشت سڑاند کے ساتھ تمہارے درمیان ایک ایسا وجود بن کر لوٹ آیا ہے جسے نہ تم مار سکتے ہو، نہ بھوگ سکتے ہو، نہ اپنے سے پرے کر سکتے ہو۔"

میں چپکا اس کی باتیں سنتا رہا۔

کہتا بھی کیا؟

میرے پاس اس کی باتوں کا جواب ہی کیا ہے۔

اب تو صرف گھروں میں چھپ کر بیٹھا ہی جا سکتا ہے اور یہ مرض مزید جتنی بیماریاں پھیلائے گا وہ سب بھوگنا اور دیکھنا ہے۔

جب تک یہ زندہ ہے۔

سنا ہے کہ بعض ممالک میں Mercy Killing جائز قرار دے دی گئی ہے۔

لیکن ہمارے یہاں؟

ہمارے یہاں تو ابھی تک صرف خارش زدہ پاگل کتوں کو گولی ماردی جاتی ہے۔ اور بعض کا ہاتھ تو ایسے کتوں پر بھی گولی چلاتے ہوئے کانپنے لگتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ خارپشت کیا ہے؟ سبھی جانتے ہیں کہ یہ ایک جنگلی جانور ہے، جس کے جسم پر لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں یا وہ چوہا جو خاردار ہوتا ہے اور جنگل میں رہتا ہے، اسے بھی خارپشت کہا جاتا ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ یہاں خارپشت کیا ہے؟ کون ہے؟ اور اسے کیوں موضوع بنایا گیا ہے؟ کیا یہ پسماندہ قوموں کے وہ افراد ہیں جو نہیں جانتے کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے؟ کیسے استحصال سے نجات مل سکتی ہے؟ کیسے آزاد ہوا جا سکتا ہے؟ کیا خارپشت کوئی ایسا کردار ہے جو دوسروں کی بزدلی کو بھی نمایاں کر سکتا ہے اور خود بھی تمام مصائب کے باوجود آزاد ہو سکتا ہے؟ کیا مشرق و مغرب کی آج کی جو سیاسی صورت حال ہے جہاں مغرب اپنے استحصال اور کالونیل طریقہ کار سے مشرق کے بہت سے حصے کو خارش زدہ بنائے ہوئے ہے اور استحصال کر رہا ہے؟ حسین الحق جیسی بھی ترسیل چاہتے ہوں، ایک بات تو واضح ہے کہ وہ کمزور طاقتوں کو کمزور سمجھنے کے موقف کے خلاف یہ احساس دلاتے ہیں کہ ناتواں زیادہ دن تک ذلیل و خوار نہیں رہ سکتا۔ اسے آپ مریض بنا دیں لیکن اس کی کوشش رہے گی کہ وہ اسی مرض کو اتنا پھیلا دے کہ مرض کی وجہ سے طاقتور خود اس کی زد میں آجائیں۔ کسی ایک مرکزی خیال تک پہنچنا آسان نہیں، پھر بھی اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اس میں جو واقعات ہیں وہ کمزوروں اور بدحالوں کے ساتھ ہیں۔ ایسے کمزور اور بدحال کبھی نہ کبھی Terror بن جائیں گے بلکہ اس کی پراگندگی کے حصار میں آکر اپنا وقار کھو دیں گے۔ افسانہ بڑی بے تکلفی سے مرتب کیا گیا ہے۔ کئی واقعات دلوں کو برما سکتے ہیں، ذہنوں کو متاثر کر سکتے ہیں اور ایسی غلیظ صورت حال سے ابھرنے کا سبق دے سکتے ہیں۔ حسین الحق بڑی سے بڑی باتیں بڑی بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں اور اس کے لئے مختلف قسم کے

واقعات کا آمیزہ تیار کرتے ہیں۔ گویا ہر تاثر کے حصول کے لئے ان کے یہاں Objective Corelatives ہیں۔ ایسے جزوی واقعات شدتِ جذبہ کو تیز کر دیتے ہیں اور اثرات کو وسیع تر بنا دیتے ہیں۔ لیکن ایک سوال یہاں ابھرتا ہے کہ حسین الحق اپنے بیانات یا اظہار کے طریقہ کار میں کون سے ذرائع اختیار کرتے ہیں؟ جواب بہت آسان ہے۔ وہ کہانی کے کہانی پن سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے یہاں بیانیہ ترک نہیں ہوتا، چاہے وہ سیدھے سادے افسانے لکھیں یا تمثیلی اور استعاراتی۔ جہاں کہیں انہوں نے علامتی اظہار کو ضروری سمجھا وہاں بھی افسانہ پن غائب نہیں ہوتا۔ ڈھلے، ڈھلائے قصے سامنے ہوتے ہیں اور کبھی قصوں میں قصہ پرویا ہوا ہوتا ہے۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بڑی اور اہم اردو کہانی کی جو روایت رہی ہے اس کی حسین الحق کو خبر رہی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ پریم چند کے وہ اہم افسانے کس طرح لکھے گئے ہیں جو آج کی شہرت کی بنیاد ہیں۔ منٹو کے منتخب اور معیاری افسانوں کا کیا رنگ ڈھنگ رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بیدی کے افسانوں کی فنی صورت کیا ہے؟ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے معاصر افسانہ نگاروں کے وقیع طرز اظہار کی خبر بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب کے پیچھے وہ عظیم مغربی جدید افسانوی فکر ہے جو انہیں متاثر کرتی ہے۔ وہ معروف فلسفیوں سے آگاہ ہیں اور ان کے ادبی جہات سے بھی۔ یہ ان کے لئے کیسے ممکن ہو سکا میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انہیں بعض عظیم فنکاروں کی نگارشات کا علم ہے۔ وہ کہیں کہیں ایسا اظہار کرتے نظر آتے ہیں جو صرف باخبر فنکار ہی کر سکتا ہے۔

ایسے تمام مباحث کا ایک کلیدی نکتہ بھی ہے اور وہ ہے حسین الحق کی تخلیقیت۔ تخلیقیت کیا ہے اور کیسے پیدا ہوئی ہے؟ اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ اچھا ادب ''برہنہ حرف نہ گفتن'' کے اصول پر گامزن ہوتا ہے ادب اپنے Mimesis میں اصلاً متبادل تلاش کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کا عکس پیش کرنے کے لئے چیزوں کو نئے طور پر دیکھتا ہے ایک طرح سے وہ تشبیہات واستعارات کے وضع کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ ادب دو اور دو چار کا نام نہیں بلکہ وہ ایسے ہی حساب میں نئے نتائج پیدا کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ ممکن ہے ایسے نتائج غیر سائنٹفک ہوں، لیکن غیر سائنٹفک نتائج اعلیٰ ادب تشکیل کرنے کا باعث بھی ہیں۔ حسین الحق اپنی تخلیقیت میں وہ وضع اختیار کرتے ہیں جو ان کی تحریر کو کہیں سپاٹ بننے نہیں دیتی۔ اس میں تازگی اور سرشاری کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں ان کے بعض افسانوں کے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں:

''بہار کا زمانہ ہے اور باغ پھولوں سے لدا پڑا ہے، رات ٹی وی پر خبر آئی کہ ایک ذات کے ۳۷ افراد مار ڈالے گئے۔ باغ میں طرح طرح کے پھول ہوتے ہیں، یہاں افواہ ہے کہ مرنے والوں کی تعداد سو تک پہنچ گئی ہے، ہر پھول کا رنگ جدا،

خوشبو الگ، مگر سب مل کر باغ کے حسن کا سبب۔ ایسی گندگی کا احساس ہوتا ہے کہ جیسے کسی گٹر میں گردن تک نہیں ناک تک ڈوب گیا ہوں۔ صرف آنکھ بچی ہوئی ہے۔ باغ ایسے کیوں بجتا ہے، مرنے والوں میں سنا کہ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ کیا ہوتا اگر باغ میں صرف موتیا ہوتی، صرف بیلا ہوتا، صرف گلاب ہوتا، چاروں طرف نعرہ لگتا ہے، لوگ ہسٹریا کے مریض کی طرح چیختے ہیں، فلاں رہے گا، فلاں نہیں رہے گا۔ پہلے زمانے میں تو مالی کو کوئی ٹریننگ نہیں ملتی تھی۔ بس وہی علم سینہ جس پر کچھ لوگوں کو بہت اعتراض ہے، وزیر اعلیٰ بھی آئے ہوں گے، بہت دلاسا وغیرہ دے کر گئے ہوں گے۔ مالی کو اس کے باپ نے بتایا اور اس کے باپ کو اس کے باپ نے۔ جب کہیں پھول کھلتا ہے تو علاقے کا علاقہ خوبصورتی سے اور حسن کے شباب سے پٹا پڑتا ہے'' (ندی کنارے دھواں)

''پھر میں نے دیکھا...... آسمان کا بھیانک رنگ، فضا میں اڑتے تباہی کے ابخرات اور فضا پر چھائے بھیانک دھوئیں کی دھند میں پاگلوں کی طرح دوڑتا ایک غضبناک ناقہ...... اور ایک بھاری آواز...... وہ آرہا ہے...... وہ آرہا ہے !!! اور کتا، بلی، خرگوش اور بوڑھے کی دی آگ، چور چور مٹی سے جنم لینے والے اور میرے عزیز پرتمیش کمار سنگھ اور تہور علی خاں۔ اسامیوں کی اولاد کے غلبے سے مکدر۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک اجاڑ ویران گھر میں ایک بوڑھا اپنے جسم پر بھبھوت ملے، اپنے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتا اور اپنا خون پیتا...... وحشت زدہ بھیانک سناٹے کی آماجگاہ آنکھوں سمیت، آنگن کے بیچوں بیچ مادر زاد برہنہ کھڑا ہے اور آسمان کی طرف منہ کئے چیخ رہا ہے...... ندی کنارے دھواں اٹھت ہے! کامریڈ اکھلیش تھک کر سو چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے بتاؤں یا نہ بتاؤں کہ استعارے اس طرح علامت بنتے ہیں۔''
(ندی کنارے دھواں، ص ۱۰۹)

''مرد کے پاس اس پرشن کا جواب نہیں ہے اور گھنی رات سر پر کھڑی ہے...... اور عورت اس نگر کو بار بار بیاکل ہو ہو کر دیکھتی ہے جس میں اس کا گھر چھوڑ کر باقی سارا نگر بالکل ویسا ہی دکھتا ہے جیسا اس نے یگوں پہلے چھوڑا تھا...... اور مرد سوچتا ہے کہ وہ اب اس نگر کو کیا دیکھے جو اشمشان بن چکا ہے اور یاد کرتا ہے کہ پہلے تو تپسیاوی کی سانجھ بارہ برس پر ہوا کرتی تھی...... پر اب تو کلجگ ہے...... اب کئی یگ بیت جاتے ہیں تب ایک

سانجھ ملتی ہے۔ مگر باشی کو اس کے نگر کی سانجھ کب ملے گی؟''
(ایندھن، ص ۱۶۲)

''میں دریچوں کے شیشوں سے اپنا چہرہ ٹکا دیتی ہوں...... میری آنکھ سے پانی کی ایک لکیر شیشوں کو نم کر رہی ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ پانی کی اس لکیر میں میرا پورا وجود ہچکولے کھا رہا ہے۔'' (عکس عکس، ص ۴۲)

''اور پھر راوی یوں کہتا ہے کہ چشم زدن میں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی برسنے لگا۔ طوفان نوح سے بھی بڑا طوفان آچکا تھا، ہر طرف پانی ہی پانی۔ طوفانی جھکڑ مکانوں کی چھتوں کو اڑا کر انجانی سمتوں کی جانب پھینک رہے تھے اور راستے دلدل، دریا اور بھنور بن چکے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے بے چھت کے مکانوں میں سہمے بیٹھے تھے کہ سڑکوں پر ہواؤں کے دوش پہ ایک شخص نے ڈگی بجائی۔'' (منادی، ص ۶۴)

''تو شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک رکا اور بکھرا ہوا میں اور میرے چاروں طرف بے سر کے انسانوں کا اژدہام اور قے کئے ہوئے سکے اور پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر اور روشنی اندھیروں کی خالق اور بے سر کے لوگوں کی دوکانوں میں ان کے عزیز و اقارب کے جسموں کے کٹے پھٹے اجزا تو ایسے میں میرے سامنے ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بھاگ رہا ہوں اور کتے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔'' (آتم کتھا، ص ۵۸)

''میں نے اپنی جوانی کی نیم روشن دوپہروں میں جو خواب دیکھے تھے میں ان کی تعبیر جاننے کے لئے بے چین تھا۔ کلیوں کی خوشبو پھیلتی جا رہی تھی۔ شہد کی مکھیوں کا نغمہ فضا میں گونج رہا تھا اور وہ ایک جانب جنت اور دوسری جانب دوزخ لئے قریہ قریہ نگر نگر اور بستی بستی چیختا پھر رہا تھا کوئی ہے جو جنت خریدے!............ کوئی ہے جو جنت خریدے! اور لوگ 'رابعہ' آگئیں...... چلاتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور جب بابا نے انہیں سمجھانا چاہا اور بتایا کہ 'یہ دجال ہے'، رابعہ نہیں، تو دوسروں کا ذکر تو چھوڑئیے خود میں نے اور میرے چھوٹے بڑے بھائیوں نے بابا کے منہ کو ہری سوئی اور ہرے تاگے سے سی دیا کہ یہ ہمارے خیال میں ثواب کا کام تھا۔'' (امرتا)

میں نے اب تک حسین الحق کے چند افسانوں ہی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے افسانوں کی

تعداد خاصی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان کے یہاں Here is God's Plenty کی صورت ہے۔ اکثر سماجی ناہمواریاں، اقتصادیات کی زبوں کیفیات، سیاسی بازیگری، اخلاقی کمزوری نیز قدروں کے زوال، واقعات وحادثات، Partition اور اس کے عوامل وغیرہ ان کے موضوعات ہیں۔ لیکن حسین الحق ان کے سلسلے میں کوئی Statement نہیں دیتے بلکہ ان کی نئی جہتیں سامنے لاتے ہیں جو جابجا تازہ بکار اور ہمیشہ کے لئے دیدنی بن جاتی ہیں۔ یہی ان کا فن ہے۔ ان کی فکری اثباتیت کی فکر کیجئے تو یہ لایعنی سی بات ہوگی۔ اس لئے کہ اہم فنکار ہمیشہ مثبت طریقے سے ہی سوچتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کے بیان میں کچھ ایسے بھی پہلو آجاتے ہیں جو ناگفتنی بھی ہو سکتے ہیں۔ حسین الحق کے یہاں ایسا تو نہیں ہے لیکن وہ Patches لگانا جانتے ہیں جو ہمیشہ Purple ہوتے ہیں۔

میں نے حسین الحق کے فکر و فن کی چند بنیادی باتوں پر ہی توجہ کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے افسانوں کا باضابطہ فنی وفکری تجزیہ کیا جائے۔ ملکی وغیر ملکی افسانوی اثرات تلاش کئے جائیں ان کے انتخاب کو روشن کیا جائے، اس لئے کہ موصوف کے اکثر افسانے ان کی انفرادی سوچ کی خبر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے حالیہ معاصرین میں الگ سا علمی ذہن رکھتے ہیں اور اپنی تخلیقات میں پرانے تصورات کو نئے امکانات اور نئی بصیرت میں تبدیل کر دینے میں منفرد ہیں۔

«●»

اقبال حسن آزاد
کا
چوتھا افسانوی مجموعہ
اوس کے موتی
بہت جلد منظرِ عام پر

● **پروفیسر محمد حسن**

حسین الحق کے دو مجموعے

حسین الحق نے اپنے افسانوں کو عصری حقیقتوں کی تلخ کامیوں کا ترجمان بنا دیا ہے اور علامتوں کے ذریعہ ہندوستان سماج کے تشدد، سماجی ناانصافی، فرقہ وارانہ فسادات، مصلحت پرستی اور خوشامد پسندی پر بڑے مؤثر انداز سے روشنی ڈالی ہے، ان کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں جو تیکھے پن اور فنکارانہ نظم وضبط کے اعلیٰ نمونے کہے جاسکتے ہیں۔

پہلے افسانوی مجموعہ ''پس پردۂ شب'' کی اشاریت اور گہری معنویت سماجی استناد کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔

گو اس پورے مجموعے کے مکرررات یا مرکزی تصورات لاوارث لاش، کٹا ہوا سر نظر نہ آنے والے آدمی کا آسیب، سیلاب، منادی، حکم خدا کا جیسے الفاظ ہیں مگر ان کے پیچھے نہایت حساس فنکار کی روح کا کرب جلوہ گر ہے جو عصری واقعات اور صورت حال پر اپنے تخلیقی تجربات واحساسات کو نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ پیرایہ اظہار دیتا چلا جاتا ہے۔ شاید تلاش ذات کے متلاشی یہاں ان علامتوں کے مابعد الطبیعاتی اور اساطیری معنی ڈھونڈھ نکالیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حسین الحق اپنے اردگرد کی زندگی کو بہت ہی خوب صورت اور اشارتی انداز میں اپنے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

''چہرہ پس چہرہ'' نہایت خوب صورتی کے ساتھ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فساد کو عالمی تشدد، بے انصافی اور انسان کشی کے پس منظر میں بیان کرتی ہے اور اس قسم کے غیر منصفانہ تشدد میں اجڑے ہوئے لوگوں کا رزمیہ یا مرثیہ بن جاتی ہے۔

''منظر کچھ یوں ہے'' معاصر ہندوستان کی زباں بندی، خصوصاً ایمرجنسی کے دور کی بے بسی اور بے زبانی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، دیمک عوام ہیں، ڈائرکٹر ارباب اقتدار اور دوسرا ڈائرکٹر استحصالی طبقہ۔ اسی طرح ''منادی'' ہندوستان مسلمانوں کے پہلے پاکستان اور پھر بنگلہ دیش سے بھی ہجرت کرکے، عافیت کی ایک ناکام تلاش کی داستان ہے۔

''لخت لخت'' میں جاگیردارانہ نظام کا چہرہ بے نقاب ہوا ہے، خصوصاً صف ۸۴ کی دس سطریں تو ادبی حسن سے معمور ہیں اور اچھی نثر کی مثال ہیں۔ اس طرح ''وقتاً عذاب النار'' ایک بہت اچھی کہانی ہے جو پچھلے تیس سال میں یعنی آزادی کے بعد کے دور سے آج تک کے قومی زوال کی کتھا ہے جو لاش کی علامت

سے ظاہر ہوتی ہے۔

''الی حین'' اور ''امرلتا'' اپنے وطن میں اجنبیت کے احساس پر مبنی ہے اور علامتی کہانیوں میں سرِ فہرست قرار دی جاسکتی ہے، ''بلبلہ'' روایت پرستی پر گہری ضرب ہے تو ''سباویراں'' جبر کے اندھیروں میں روشنی کی تڑپ کا استعارہ ہے۔

غرض یہ مجموعہ علامتی افسانوں کے سبھی مجموعوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اس میں علامت، عصری حسیت اور وسیع تر آگہی تجربے کے ذریعہ اور اپنے احساس کے وسیلے سے بلیغ پیرایہ اظہار بن گئی ہے۔

دوسرے افسانوی مجموعہ ''صورت حال'' میں چپ رہنے والا کون'' بڑا بلیغ رواں اور خوب صورت افسانہ ہے، اور افسانے کا مقصد ومنہاج جس جمالیاتی کیفیت تک پہنچنا ہے وہ کیفیت ''چپ رہنے والا کون'' میں بڑی خوبی کے ساتھ موجود ہے۔ افسانے کی اس کیفیت کے حسین الحق تنہا رمز شناس ہیں، افسانے میں غزل کا سا حُسن، ارتکاز اور وجد آفریں کیفیت ہے۔

حسین الحق کی یہ کہانی ایسی فضا سے متعلق ہے جہاں ظلم وستم اپنی آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں، لوگ مارے جارہے ہیں مگر ظلم وستم سے بچنے کے لئے گٹر میں چھپا ایک کردار ایک بچے کے بچ جانے پر مسرت کا اظہار کرتا ہے کہ آخر یہ کمبخت ظلم وستم کے اجارہ دار چوک ہی گئے، ایک بچہ زندہ بچ گیا جو شاید نئی بصیرتوں کا امین اور استعارہ ہے۔

اقبال حسن آزاد
کا تحقیقی مقالہ

نثری اصناف ادب اور طنز و مزاح کی روایت

شائع ہو چکا ہے

صفحات 152 قیمت -/300

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر

● **ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی**

نئے اندازِ فکر کا افسانہ نگار

حسین الحق کے افسانے اپنے تکنیکی سانچے لب ولہجہ اور موضوعات کے اعتبار سے بغور مطالعہ کے مستحق ہیں۔ حسین کے افسانوں کے مطالعہ سے ایک واضح تاثر یہ پنپتا ہے کہ افسانہ نگار نے زندگی کے عصری حقائق کی تلخیوں اور تندیوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اور اپنے تمام ردعمل کو ایک مخصوص تہذیبی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ یہ تہذیبی پس منظر خانقاہی روایات کا حامل ہے، مگر یہ خانقاہی روایات وہ ہیں جو روبہ زوال ہوچکی ہیں، اور جن کی تمام کشش و برکت ختم ہوچکی ہے۔ افسانہ نگار گویا ان انحطاط پذیر روایتوں پر نوحہ کناں بھی ہے، اور اسے اس کا بھی احساس ہے کہ نئے عہد کی سنگین وسخت صداقتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ان میں قطعی نہیں ہے۔

مسائل حیات کی پیچیدگیوں، جمہوری معاشرے کی مفلوک الحالی اور مختلف النوع تضادات وتصادمات نے انسان کو آلام ومشکلات میں اس طرح محصور کردیا ہے کہ دور دور تک کوئی امکان نجات نظر نہیں آتا۔ حساس آدمی کے لئے کیفیت جنون میں مبتلا ہوجانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ انسانی قدروں کا شعور رکھنے والے افراد انسان کے سالم وصالح کردار کی جستجو میں دیوانگی کی حد تک مضطرب ہیں اور عام لوگوں کی بے حسی صورت حال کو اور سنگین بناتی جارہی ہے۔ شدتِ احساس کی ایک تصویر یہ ہے:

> ''سارا بھیانک پن، غلاظت کا احساس، اور صعوبت کا بھگتان میرا مقدر ہے کیوں کہ میں نے اپنے وجود میں ایک مرشد کی بلا پال رکھی ہے اور دوسروں کے اندر یا تو کسی مرشد کا وجود نہیں یا انہوں نے اپنے مرشد کو قتل کردیا ہے، اور فرد کی غفلت اجتماعی مصیبت میں بدلتی جارہی ہے...... سب اس سارے بھیانک اور بدبودار وقوعے کے صرف تماشائی ہیں، اور صورت حال دن بدن انتہائی غلیظ اور بھیانک ہوتی جارہی ہے۔''

(صورت حال)

''خار پشت'' میں واقعیت آمیز احساس کی یہ اشاریت کچھ اور تیز مزید براں سریع الاثر بن گئی ہے، انسان دردوکرب، آفات ومصائب اور عصری زندگیوں کی تلخیوں میں اس طرح محصور ہے، گویا اس کا پورا جسم تلخ الجھنوں اور سنگین اذیتوں میں دفن ہوچکا ہے محض گردن کا اوپری حصہ سلامت ہے اور اس پر تلخ حالات کی مسلسل یورش ہے:

> ''لاتعداد خوف ناک کتے اور سیار اس کی گردن پر حملہ کررہے ہیں اور وہ بچنے کے لئے چاروں طرف اپنی گردن جھٹک رہا ہے، چاہا تو میں نے بھی کہ اس کو اس مصیبت سے نجات دلاؤں لیکن کچھ کتے اور سیار غراتے ہوئے میری طرف دوڑے تو میں بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔''

معاشرتی پیکار وتصادم، فرقہ وارانہ فسادات اور خارجی ماحول کی انسانیت سوز ابتلاؤں کے ردِعمل کی واقعیت آمیز تصویریں حسین الحق کے افسانوں میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کی گئی ہیں، ان تصویروں میں نہ کوئی عصبیت ہے اور نہ منافرت۔ ان میں ایک انسان کے سچے احساس کی تڑپ ہے اور اضطرابِ قلب کی اثر انگیز مصوری بھی۔ بیانیہ اشاریت کی معنی خیزی نے ان تصویروں کی تاثیر وجاذبیت کو تہہ دار بنادیا ہے۔ ''چپ رہنے والا کون'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''سامنے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، لوگ بلبلا بلبلا کر گھروں سے باہر نکل رہے ہیں اور حتی الامکان جدھر سینگ سمارہی ہے، بھاگ رہے ہیں...... مگر چاروں طرف انہیں گھیر کر ایک بڑے میدان میں جمع کیا جارہا ہے، اور جو ذرا اِدھر اُدھر چھپ کر یا بچ کر نکلنا چاہتے ہیں لیکن نکل نہیں پاتے ہیں اور پکڑ لئے جاتے ہیں...... اُنہیں بوٹوں سے روندا جارہا ہے۔
>
> یہ افتاد جس علاقے پر پڑی ہے، اُس علاقے میں خام مکانات کی بہتات ہے۔ گلیوں میں چاروں طرف گندگی جمع ہے۔ شاید برسوں سے میونسپلٹی والوں کو یہ علاقہ یاد ہی نہیں آیا ہے، یا شاید خود علاقے والے صفائی اور گندگی کی حدود سے حسی طور پر بہت آگے نکل چکے ہیں۔''

یہاں عام انسانوں کی بے بسی اور انتظامیہ کے جبر کی نشان دہی بھی ہے اور متاثر علاقے کی حقیقت شعارانہ مصوری بھی۔ علاقہ کس فرقے کی آبادی کا حامل ہے، اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے مگر علاقائی رنگ ڈھنگ، رہن سہن، اور طور طریق سے خود بخود یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہاں کس فرقے کو لوگ آباد ہیں۔ مذہب کے سطحی تعصب کے جنون کے زیرِ اثر انسانی قدروں کی پامالی کی دردناک کہانی سلیقے سے بیان کی گئی ہے۔

حسین الحق نے اپنے اردگرد کے ماحول اور عصری حالات کی تلخ وتند سچائیوں کو اثر خیز ایمائی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ پرانے خیالات اور امن وتحفظ کے مسلسل منہدم ہوتے ہوئے تصورات کی عکاسی

بھی انہوں نے خلوص اور بیدار مغزی کے ساتھ کی ہے۔ اقدار معاشرت کے انہدام کو چپ چاپ دیکھنے والوں کی بے نیازی، بے حسی کے اس مرحلے میں داخل ہے جہاں لوگ مصلحت آمیز مفاہمت کے سائے میں زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ "بارش میں گھرا مکان" کی ایک کیفیت ملاحظہ ہو:

"ڈھڑ ڑڑڑرام۔" اچانک ایک بھیانک آواز سنائی دی اور میں چونک کر اُچھل پڑا
لیکن میرے میزبان اطمینان سے لیٹے رہے اور مسکراتے ہوئے کہا۔
"گھبراؤ نہیں ...... کسی حصے کی دیوار کی اوپری پرت گری ہوگی۔"
"تو دیوار کو بھی تو خطرہ ہوسکتا ہے؟"
"ہاہاہا۔" صاحبِ خانہ کا چھوٹا بھائی قہقہہ مار کر ہنسا۔
"آپ ڈر گئے؟ پچیس تیس برس سے دیوار کا کوئی نہ کوئی حصہ ہر لمحہ ڈھ رہا ہے۔
لیکن دیوار آج تک نہیں گری۔"

ماضی کی آسودگی اور خوش حالی کے قصے اب اپنی کشش سے محروم ہو چکے ہیں۔ عصری زندگی کی المناک اور کرب آمیز صداقتوں کی چبھن اتنی تیز ہے کہ ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا اب امر مشکل ہے۔ دورِ نو کے انتشار و خلفشار سے پنپنے والی اذیتوں نے پورے معاشرے میں اکتاہٹ، بےزاری، تردد اور خوف و ہراس سے بھری ہوئی بے چارگی پیدا کر رکھی ہے۔ حسین الحق نے اپنے افسانوں میں موجودہ صورت حال کو جس فنی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، اس کی وضاحت کے لئے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ہاں، ہاں ٹھیک ہے ...... پہلے ایسا ہوتا ہوگا۔ بہت بزرگ تھے میرے آباواجداد ...... ہوں گے ...... جائے نماز کے نیچے ہاتھ ڈال کر ہزار پانچ سو کسی کو بھی دے دیتے تھے ...... دیتے ہوں گے ...... دستِ غیب جب گھر ہی میں نہیں تو سارے عالم کے فیضیاب ہونے کی کہانی بے معنی۔"
(افسانہ: گھٹن)

"ہر گھر کا دروازہ بند ہے لیکن نیند شاید سب کی آنکھوں سے چھن چکی ہے، سڑک کے کنارے جو مکانات ہیں، ان کے مکین اور زیادہ بے چین ہیں، جب ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو یوں چونک اُٹھتے ہیں جیسے آسمان سے بجلی اب تاک کر انہی کو نشانہ بنانے والی ہے۔" (افسانہ: "کربلا")

"اس سے ملی ہو؟ یہ ۱۹۴۹ء میں پیدا ہونے والی ہماری سات پشت آگے کی

ایک آزاد خیال مگر بے چین روح ہے۔"

"بی بی صاحبہ مسکرایا کیں اور میں چھ سات پشت پہلے رہنے والوں کے کھنڈرات میں مارا پھرا۔

"یہاں سے محال وارث علی شروع ہوتا ہے ...... اور وہ ...... نصیر چچا نے بتایا ...... قاضی وارث علی کا مکان تھا ...... یہ ...... نصیر چچا نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا ...... یہاں سُنا ہے کہ قاضی صاحب کی بیرونی بیٹھک تھی ...... یہ ...... ایک اور طرف انہوں نے انگلی اُٹھا کر بتایا ...... یہ قاضی صاحب کی کچہری تھی۔"
"یہ زمینیں؟؟ بے ساختہ میرے منھ سے نکل گیا
"علاقے کے کرمیوں کے قبضے میں ہیں۔"
بغل میں حاجی رحمت اللہ عراقی کے پختہ مکان کے پختہ برآمدے میں قصبے کے کسی قضیے کا تصفیہ ہو رہا تھا (افسانہ: گھنے جنگلوں میں)

مجموعی طور پر حسین الحق کے افسانے دورِ نو کی زندگیوں کی محرومیوں اور الجھنوں کی آئینہ داری دل کش واقعیت آمیز مگر ایمائی و استعاراتی اسلوب میں کرتے ہیں۔

حسین الحق کے افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی اور معاشرتی سرگرمیوں کے تاثرات کو بھی شخصی اظہار کی خوب صورتی دے دی گئی ہے۔

حسین الحق کے چند افسانوں میں بعض ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو معیاری نہیں محسوس ہوتے، لیکن یہ الفاظ متعلقہ صورت حال کی صحیح اور سچی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ اشتعال انگیز نہیں ہیں، موزوں اور مناسب محسوس ہوتے ہیں اور ان کے استعمال کا موقع و محل بھی درست اور چست ہے۔ اس کی وجہ سے زبان و بیان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور ایسے کسی اعتراض کی تائید نہیں کی جاسکتی۔

میں نے حسین الحق کے فسانوں کے بغور مطالعے اور غیر جانب دارانہ جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حسین الحق کے افسانوں کا اگر ایمان داری سے مطالعہ کیا جائے تو اس مطالعہ سے نئے ذہن و شعور نئے انداز فکر، نئے طرزِ احساس، تاثراتی ردِ عمل کی عصری نوعیت اور افسانے کے تکنیکی اور اسلوبی سلیقے کے تازہ تر برتاؤ کی واقفیت ہو سکے گی۔

◄◄ ● ►►

● وارث علوی

ناگہانی ...... میری نظر میں

حسین الحق کی کہانی صحیح معنی میں ایک نابغہ کی نادرہ کاری ہے۔ اسے میں اردو کی چند بہترین کہانیوں میں شمار کرتا ہوں۔ اس کا اسلوب بے مثال ہے۔ کہانی کی تعمیر میں ایسے نازک نفسیاتی اور جذباتی مقامات آئے ہیں کہ قلم کی ایک معمولی سی لغزش بھی اس کے حُسن کو داغ دار کرنے کے لئے کافی تھی۔ عزت النساء کے لئے سب راہیں بند تھیں، وہ ایک بے حد دُکھی، بےبس اور بے سہارا عورت ہے۔ لالہ ہری ہر پرشاد ایک فرشتہ صفت آدمی ہے لیکن وہ فرشتہ نہیں آدمی ہے۔ اس کا سہارا عزت بی بی کے لئے گناہ کا دروازہ کھولتا ہے۔ افسانہ کا عروجی نقطہ وہ ہے جہاں عزت النساء لالہ کی تحفے میں دی ہوئی ساری پہن کر اُس کی چوکھٹ پر جاتی ہے۔ اب عزت النساء کے دل میں کوئی پس و پیش نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی احساس گناہ ہے۔ افسانے کا تعجب خیز انجام تو ماسٹر اسٹروک ہے۔ قاری کو سکتے میں ڈال دیتا ہے۔ عزت النساء لالہ ہری ہر پرشاد سے تنہائی میں مل کر اپنے گھر پہنچیں تو "محلے کی ایک عورت اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسی دن، مغرب بعد اُس کے یہاں محفل میلاد شریف تھی۔ میلاد شریف میں جانے کے لئے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی۔ زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں، اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح و زاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں:

خدا کے قہر سے روز جزا بچا لینا // بہت ہوں عاجز و لاچار، یا رسول اللہؐ

میلاد میں بالعموم پڑھے جانے والے عام سیدھے سادے پر عقیدت شعروں میں سے یہ بھی ایک شعر ہے، لیکن شعر کی وساطت سے افسانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا، اور خود افسانے کو اس شعر نے کتنا معنی خیز بنا دیا، اس کو اربابِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ افسانے کا انجام یہی شعر ہو سکتا تھا۔ اور اس شعر کے بغیر افسانہ اُس معنویت کا حامل ہو ہی نہیں سکتا تھا جو اسے اس قدر تہہ دار اور گراں مایہ بناتی ہے۔

اس افسانہ کو میں نے اپنے احباب کو بھی پڑھایا۔ سب ششدر رہ گئے۔ میں حسین الحق کے افسانے دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں لیکن اُن کے تخلیقی تخیل کے اعجاز کا قائل اس افسانے سے ہوا۔!!

◄◄ ● ►►

● ڈاکٹر افصح ظفر

ناگہانی ...... ایک مطالعہ

حسین الحق اب افسانوی دنیا کا ایک اہم نام ہے ان کے پاس کچھ ایسی کہانیاں ہیں جو اردو افسانے کے انتخابی عمل میں نظر انداز نہیں ہوسکتیں۔ جیسے "نیو کی اینٹ"۔

ان کی کہانیوں کا بیانیہ انداز اب اپنا تشخص قائم کر رہا ہے۔ حسین کی حالیہ کہانی "ناگہانی" کا رنگ و آہنگ بھی کچھ اسی قبیل کا ہے۔

"ناگہانی" بنیادی طور پر زمین دارانہ نظام کے اندر جنم لینے والے ایک ایسے طبقہ یا کلاس کو اپنے مطالعہ و مشاہدہ کا مرکز بناتی ہے جو بہ ظاہر کہیں نظر نہیں آتا مگر یہ کلاس بہر حال موجود تھا البتہ اس کلاس نے اپنی ضرورتوں اور سماجی مجبوریوں کے تحت اپنے آپ کو شعوری طور پر "مستور" رکھنے کی ایسی فن کارانہ کوشش کی تھی کہ سماجی ڈھانچے پر گفتگو کرنے والے بھی اس کا تذکرہ کرتے ہیں مگر اسے مرکزِ نظر نہیں کر پاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ مرکز گریز طبقہ تھا اس لیے اسے دریافت کرنا یا اس کے مراکز کی طرف اشارہ کرنا بھی تقریباً ناممکن سا رہا ہے

میری مراد سماجی ڈھانچے میں موجود "خانگی" طبقے سے ہے۔

خانگی عورتوں پر مشتمل طبقہ ہے جو طوائف، رنڈی، ڈومنی، ڈیرہ دارنی، کوٹھے والیاں، کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ انہیں ڈھونڈ نکالیں تو شاید یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ تھیں اور شائد آج بھی ہیں۔ ایک طوائف دوسری طوائف سے واقف ہو سکتی ہے مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک خانگی دوسری خانگی سے بھی واقف ہوگی۔ یہ تو ایسی عورتیں ہیں جو اپنا آپا سراپا خود اپنے آپ سے بھی چھپاتی رہتی ہیں۔ یہ ارادتاً خانگی نہیں بنتیں، کہا جا سکتا ہے کہ انہیں شاید خود بھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ آہستہ آہستہ ایک سماجی ڈھانچے سے دوسرے سماجی ڈھانچے کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔

یہ جون بدلنے کے ایک ایسے مرحلے سے گزرتی ہیں جس کی دھمک انہیں بہت بعد میں سنائی دیتی ہیں۔ "ناگہانی" میں قلب ماہیت کے یہ مراحل اور سماجی ڈھانچے کے تبدیل ہونے کے مناظر اور اسباب بہت آہستگی، خوب صورتی اور تخلیقی ہنر کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

ناگہانی ایک بہت خوب صورت اور لطیف بیانئے کی حامل کہانی ہے جس میں نظام کے تہہ و بالا ہونے اور نظام کے اندر سانس لینے والوں کے آہستہ آہستہ اور اندر اندر ٹوٹتے اور مرتے رہنے کا ایک

افسوس ناک سلسلہ جاری ہے۔

باوجود یکہ اس کہانی میں بعض جنسی مراحل مثلاً ''ماہ واری'' کے ذکر سے ایک قسم کے ایسے کھلے پن کا احساس ہوتا ہے جو اس کہانی کے مجموعی محتاط ،مہذب ،وضع دار،لطیف اور جمیل بیانیہ سے میل نہیں کھاتا اور یہ بھی کہ کہانی واقعات واحساسات کے بیان میں مجموعی طور پر اجمال پسند ہونے اور جزوی تاثر نگاری کے بجائے مجموعی تاثر پسندی یا وحدت تاثر کا نمونہ ہے مگر رنگوں اور پرندوں کے بیان میں جس تفصیل کو راہ دی گئی مجھے اس کا تخلیقی جواز نہیں ملا۔ پھر بھی بلا شک وشبہ فنی طور پر یہ ایک کامیاب اور خوب صورت کہانی ہے جس میں قاری کو کہیں دھچکے کا احساس نہیں ہوتا۔ حد یہ کہ پرانے اور خاص طور پر ترقی پسند افسانوں میں ایک چیز اینٹی کلائمکس ہوا کرتی تھی جو قاری کو دھچکے کا شکار کرتی تھی ، میں نے کہانی پڑھنی شروع کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لالہ ہری پرشاد اور بی بی عزت النساء کے درمیان تمام تر ''اسباب قربت'' مہیا ہونے کے باوجود حسین الحق شاید کسی آئیڈیل ملزم کے تحت دونوں کے درمیان صرف انسانی ہمدردی یا لالہ بنسی دھر کی بدنیتی کا تاوان بھرنے والی صورت حال پیدا کر کے پوری صورت حال کو الٹ پلٹ کر دیں گے مگر حسین الحق نے یہ نہیں کیا اور ایسے حالات میں کہانی کو جس منطقی انجام تک پہنچنا چاہئے تھا کہانی اسی انجام تک پہنچی۔

منطقی انجام کی گفتگو کے ذیل میں میلاد کا آخری منظر بھی قابل ذکر ہے۔ بی بی عزت النساء جس طبقاتی پس منظر کی نمائندہ ہے اسی میں گناہ وثواب کے تصور پر مرکوز اخلاقیات کا خاصا عمل دخل ہے۔ نتیجتاً عزت النساء عملی طور پر انحراف اختیار کرنے کے باوجود نظریاتی طور پر اس مدار سے خود کو باہر نہیں نکال پاتی اور کسی نہ کسی تصوراتی بارگاہ میں رو کر گویا اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے یا سہارا تلاش کرتی ہے۔

کہانی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی ابتدا سے انتہا تک قاری کو باندھے رکھتی ہے اور اپنے فنکارانہ اسلوب کے سحر سے باہر نہیں آنے دیتی ،کہا جا سکتا ہے کہ کوئی وقوعہ ،صورت حال ،منظر یا بیان ایسا نہیں ہے جو کہانی کے مجموعی بیانیے میں انمل ، بے جوڑ یا پیوند کاری کا عمل محسوس ہو، دوسری خاص بات یہ ہے کہ پوری کہانی عرض اور معروض ،داخلیت اور خارجیت شئی اور اشئی ،مادہ اور جوہر گویا مجموعی طور پر ہیئت اور موضوع کے فنکارانہ انجذاب کا نمونہ ہے، تیسری خاص بات یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے درمیان ہم رشتگی کی جو کیفیت ہے ، یہ کہانی بھی اسی کیفیت سے مکیف ہے کہ کہانی کے اندر موجود پوری کائنات مثلاً موسم ،وقت ،مناظر ،زمان ،مکان اور اشیاء ہر عنصر نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے بلکہ سب ایک دوسرے کو تعاون دیتے ہوئے کہانی کے پورے فنی سفر کو اپنے اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

انتہائی مختصر الفاظ میں ''ناگہانی'' کا قصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ بی بی عزت النساء ایک

انتہائی ظالم اور بدمزاج شخص جلال الدین کی بیوی ہے ، یہ شخص جلال الدین زمیندار تھا ،زمینداری ختم ہو گئی اس کو پورے بدن پر فالج مار گیا ،دونوں کے سارے رشتہ دار پاکستان چلے گئے ۔ بی بی عزت النساء کی کائنات فالج زدہ شوہر کے علاوہ اس کے تین بچے ہیں جن کی پرورش اور نگہداشت اس کے لیے ایک مسئلہ بن گیا ہے کیونکہ معاش کی راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی نہیں ہے ۔ تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے کرتے ایک دن وہ اپنے عہد زمینداری کے مختار عام لالہ بنسی دھر کے یہاں اپنی بچی کھچی جائیداد کا کچھ حال احوال لینے اس کے گھر جاتی ہے ۔ معلوم ہوا کہ بنسی دھر شہر چھوڑ کر جا چکے اور ان کا اتا پتا کسی کو معلوم نہیں ۔ وہیں بنسی دھر کے چھوٹے بھائی لالہ ہری پرشاد سے ملاقات ہوتی ہے۔

بعد کے دنوں میں لالہ ہری پرشاد اس کے گھر آنے لگے اور شروع میں تو تحفے تحائف تک خود کو محدود رکھا پھر ایک منزل وہ آئی کہ وہ ہر ماہ پانچ سو روپیہ بی بی عزت النساء کو دینے لگے اور بالآخر اس پرورش ونگہداشت کا بدل بھی مانگ بیٹھے ۔ شروع میں عزت النساء تیار نہیں ہوئی مگر آخری منظر یہ ہے کہ وہ ایک دن لالہ ہری پرشاد سے مل کر گھر لوٹتی ہے تو لالہ ہری ہر پرشاد کی دی ہوئی ساری پہنے دکھائی دیتی ہے۔ یہ آخری منظر افسانہ نگار کے الفاظ میں کچھ یوں ہے کہ:

> ''بی بی عزت النساء تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں ۔ وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئی تھیں ۔ گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کر رہی تھی ۔ اس دن مغرب بعد اس کے یہاں محفل میلاد شریف تھی ۔ میلاد شریف میں جانے کے لیے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی ،زیب تن کیا ،وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھایا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں ۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے ۔ بی بی عزت النساء روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں:
>
> خدا کے قہر سے روز جزا بچا لینا
> بہت ہوں عاجز وناچار یارسول اللہ

تخلیقی اور فنی لحاظ سے یہ بات قابل تعریف ہے کہ لالہ ہری ہر پرشاد اور عزت النساء کے درمیان کے تعلقات کے سلسلے میں حسین الحق کوئی وقتی فائدہ نہیں اٹھاتے ،لذتیت کو راہ نہیں دیتے ،جنسی معاملات کے اندر سے سر اٹھانے والی کہانی کو جنسی ہونے سے بچا لے جاتے ہیں اور صرف اتنا کہہ کر آگے

بڑھ جاتے ہیں کہ ''عزت النسا تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں تو وہ لالہ کی لائی ہوئی ساری پہنے ہوئی تھیں'' اس ایک جملے میں حسین الحق نے ایما اور کنائے کی زبان میں وہ سب کہہ دیا جسے بیان کرنے کے لئے ناپختہ افسانہ نگار پیراگراف پر پیراگراف لکھتا چلا جاتا ہے۔

اور پھر اس کے بعد کا جو منظر ہے وہ بھی حسین الحق کی فنی گرفت کا ثبوت ہے۔ ایک آدمی کے اندر جو کئی آدمی جیتے ہیں، کئی جذبے سانسیں لیتے ہیں۔ اشیاو مظاہر کی غیر تقدیسیت اور تقدس کے بارے میں جو ذہنی درجہ بندی وجود انسانی کا ناگزیر حصہ ہے۔ پھر حالات وحادثات انسان کے اندر موجود درد کے سوتے کو انجانے میں جس طرح رواں کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس آخری منظر سے عیاں اور نمایاں ہے۔

''ناگہانی'' حسین الحق کی فنی کائنات کا ایک منارہ ہے۔ ایسا میں سمجھتا ہوں!!

◀◀ ● ▶▶

افسانے اور شاعری کے قاری

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ گزشتہ برس میرے گھر پر ایک ادبی نشست جو محترم المقام جناب صفدر ہمدانی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ ہم سب نے مل کر افسانے بھی سنے اور سنائے اور شاعری کا بھی اہتمام رہا...... خاصے کی بات یہاں لکھ رہی ہوں جو انہوں نے اپنی تقریر میں کہی جو مجھے آج عزیز دوست نسترن فتیحی کے افسانے پڑھنے میں وقفہ لینے والی بات سے یاد آ گئی۔ محترم المقام جناب صفدر ہمدانی کہتے ہیں۔

''جس طرح افسانہ لکھنا ایک ڈھنگ اور تہذیب ہے اسی طرح افسانہ پڑھنا بھی ایک ڈھنگ اور تہذیب ہے کہ سطحی سوچ کا قاری افسانے کے کرداروں کی نفسیات، افسانے کے پلاٹ، افسانے کی بنت، افسانے کے پیغام تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں اپنی نظم نگاری اور افسانہ نگاری کے تجربے کے زور پر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاعری اور افسانے کے قاری الگ الگ ہوتے ہیں۔ شعر کا ردِعمل فوری ہوتا ہے جبکہ افسانے کو دیسی گھی کی طرح ہضم کرنا پڑتا ہے۔ ہیت، تکنیک اور تخلیق کے اعتبار سے بھی شاعری اور افسانے کا قلمی برتاؤ الگ الگ ہے۔ شعر کہنے والا کسی بھی صورتحال کو دیکھ کر یا محسوس کر کے فوری طور پر دس بیس شعر کہہ سکتا ہے یا طویل نظم لکھ سکتا ہے لیکن بڑے سے بڑے واقعے کا عینی شاہد ہونے کے باوجود افسانہ نگار موقع پر کھڑے کھڑے افسانہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ اسے اس سارے منظر، پس منظر اور کرداروں کو پہلے اپنی ذات میں سمونا اور پھر قلم کے ذریعے انہیں منکشف کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے جیسے افسانہ لکھنا انتہائی صبر آزما سفر ہے اسی طرح افسانے کی تلاوت بھی قاری کے لئے نعمت صبر کا تقاضا کرتی ہے۔''

ڈاکٹر نگہت نسیم (سڈنی)

● **کلام حیدری**

کربلا......ایک تجزیہ

حسین الحق کا یہ افسانہ موجودہ دور کے افسانوں میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

حسین الحق کے پاس روایتوں کا خزانہ ہے اور وہ اُنہیں جدید عہد کے لئے Relevent بنا کر پیش کرتا ہے۔ مذہب اس کی تربیت کا پس منظر ہے اور جدید دور میں اس پس منظر کو وہ افسانے میں Fade یا Out of focus بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ معمولی ہنر نہیں ہے۔ اس کے لئے تخلیق کی اعلیٰ سطح ضروری ہے۔

افسانے میں کہیں کرفیو کا لفظ نہیں آیا ہے مگر پڑھنے والے کی زبان پر یہ لفظ بار بار آتا ہے، بڑے سلیقے اور تخلیقی کرب سے گزر کر فرقہ وارانہ فساد (یہ فساد کہیں کا بھی ہو سکتا ہے، لندن کا، بہار شریف کا، اعلیٰ ہندو ذات اور ہریجنوں کا) کے تمام انسانی کرب کا عطر نچوڑ دیا گیا ہے۔

''میرے ہُنر مند دوست اپنے جوہر دکھار ہے ہیں۔''

یہ وہ دور ہے کہ مرشد دروازے تک نہیں پہنچاتا، جانے وہ کون سا دور تھا، تبھی کہ نہیں شک بار بار سر اُٹھاتا ہے پھر دبک جاتا ہے۔ اس عمل میں تشکیک کی پوری صورت اور عملی شکل نظر آتی ہے اور تشکیک میں مبتلا آدمی کی اذیت ہڈیوں کو چٹخا دیتی ہے:

''خواجہ مجھے واپس لے چلو...... خواجہ مجھے واپس لے چلو۔''

اور مرشد مجھے دروازے تک پہنچا کر خود واپس ہو چکا ہے اور میری راہ گم ہے
اور سینوں پر ہزاروں بوٹوں کی ٹاپیں گونج رہی ہیں، دوسروں کے لئے یہ اور اس جیسے
سارے وقوعات یا تو وقتی حادثہ ہیں یا سیاسی سازش یا قومی مسئلہ......''

تخلیق کار اور عام آدمی میں یہی فرق ہوتا ہے، افسانے کے ہر جملے سے یہ فرق خود بخود پھوٹتا ہے، جیسے زمین چاک کر کے کوئی چشمہ اُبل آتا ہے:

''ذکی بھائی! اتنا دور دیس کا سفر کرنے کے بعد بھی آپ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ آپ
کو صرف رونا چاہئے یا صرف قہقہہ لگانا چاہئے۔''

تو ذکی بھائی یوں کھڑے ہو گئے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو، اور بھرائے لہجے میں بولے:

''اتنا تیز مت بھاگو افسانہ نگار، ورنہ میرا ولی عہد بننا ہوگا۔''

بننا ہوگا...... ہر تخلیق کار ذکی ہوتا ہے، اس کا ولی عہد، ہر فنکار فہمیدہ ریاض ہوتا ہے۔ نام بدل جاتا ہے۔ سقراط سے حسین الحق تک۔ کیوں کہ فنکار وقتی حادثے کی رپورٹ تیار نہیں کرتا، کیوں کہ وہ اسمبلی پارلیامنٹ یا اپنی کسی سیاسی پارٹی کا ترجمان نہیں ہوتا وہ بے انصافی، ظلم اور شقاوت کی تلوار سے بہائے گئے ہر قطرہ خون کا امین ہوتا ہے۔

''لیکن اب وہی تالاب جو کبھی فقرا کی کرامتوں کے صدور کا منبع اور مخرج تھا،
بھولے بھٹکے بے جسم کے سروں اور بے سر کے جسموں کا خزانہ ہے۔''

اقتدار اور اعتماد کا یہ کیسا مہیب نظارہ ہے؟

کہانی خوب صورتی کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

''گھنے جنگلوں میں اگیا بیتال اپنے شکار کی تلاش میں ہے۔''

کہانی میں دو جگہ اشعار استعمال کئے گئے ہیں جو کہانی کی آزاد رو میں مُخل نہیں ہوتے۔

حسین الحق کا یہ افسانہ حسین الحق کو اوپر اُٹھاتا ہے!!

7=8

''ایک دن کسی سلسلہ میں علی گڑھ ریلوے سٹیشن پر موجود تھا دوسرے درجے کے مسافر خانے میں مولانا حسرت موہانی بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹین کا چھوٹا سا بکس، میلی دری میں لپٹا ہوا تکیہ، یہ دونوں چیزیں رسی سے بندھی ہوئی تھیں، جس کی ایک گرہ سے لوٹا بندھا ہوا تھا، میرا جی بہت چاہا کہ یہ سامان اٹھا کر ڈبے تک پہنچا دوں، مگر سوچتا ہی رہ گیا اور انہی ہاتھوں نے جو جیل میں چکی پیستے تھے یہ سامان اٹھا لیا۔ بھرے بھرے، بھدے ہاتھ جن میں کل رات ایک باریک نب والا قلم پکڑ کر اس باغی صفت، صوفی منش، غریب شہر، اور رئیسِ غزل نے میری آٹو گراف البم میں لکھا تھا! فقیر حسرت موہانی، 2 دسمبر 1934ء۔ فقیر کے نقطے نہیں، اور موہانی تو شوشے دار نصف دائرہ اور ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ نقطے نہ سہی وہ شخص نکتہ سنج تو تھا، لکیر سیدھی نہ سہی وہ خود تو ساری عمر صراط مستقیم پر چلتا رہا، دستخط بد خط سہی، وہ شاعر تو خوش نوا تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ فقیر لکھا ہے اور یہ بات برحق ہے۔ اس کی روشن ذات میں، فکر وفقر اور روایت وبغاوت یوں جمع ہو گئے کہ بے اختیار اسی کا مصرعہ یاد آتا ہے: اک طرفہ تماشا تھی حسرت کی طبیعت بھی۔''

☆☆☆

(آوازِ دوست از مختار مسعود)

● **صدیق الرحمٰن قدوائی**

ایک کہانی......کئی انداز نظر

فسادات کے بارے میں پڑھتے پڑھتے ایک عمر ہو گئی اور اب جب اس سے متعلق کوئی نئی تحریر سامنے آتی ہے تو اسے پڑھنے کی کوئی ایسی رغبت نہیں ہوتی جیسی کہ کسی نئے ادب پارے کو پا کر ہونی چاہئے۔ ہنگامی ادب اور اضطراری کیفیات کے زیر اثر ظہور میں آنے والی تخلیقات سے متعلق دانش ورانہ بحثوں سے فی الحال قطع نظر کرتے ہوئے اس بیزاری کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ جن تلخیوں میں ہم جی رہے ہیں اُن کے بارے میں اپنی کہتے کہتے اور دوسروں کی سنتے سنتے ہم تھک چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی تکرار مزید کوفت کا ہی سبب ہوگی، پھر یہ کہ اس طرح کے موضوع پر پڑھنے سے پہلے ہی عموماً معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے سامنے کیا آنے والا ہے، وہی بے دردی اور دردمندی وہی ظلم اور ترحم، انسانیت دوستی اور حیوانیت کی کشمکش اور کچھ پڑھ لینے کے بعد بالآخر رقیق القلب ہو جایئے یا غصے سے تھرتھرانے لگئے یا کسی اور مایوسی کے غار میں کھو جایئے یا پھر کہانی کے آخر میں اعلیٰ انداز کی فتح کی بنا پر حسین مستقبل کے خواب دیکھنے لگئے، کہانی اور اُس کا انجام معلوم اور سب سے بڑی کوفت یہ کہ ہمیں یہ بھی معلوم کہ ہم پر کیا کیفیت طاری ہوگی۔

مختصر یہ کہ ہمارے یہاں پچھلے پچاس برس میں فسادات سے متعلق ایک روایت وجود میں آ چکی ہے کرشن چندر کی ''ہم وحشی ہیں'' سے لے کر آج تک کی کہانیوں میں دلچسپی اور تاثر کا دارومدار عموماً مصنف اور قاری کی متوقع نیک نفسی پر ہوتا ہے۔ کہانی کی اندرونی ساخت میں تخلیق کاری کی اختراعات کے باوجود ہم کسی نئی صورت سے آشنا نہیں ہوتے۔ مگر اب اس روایت میں شگاف بھی پڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسے افسانے بھی سامنے آنے لگے ہیں جن میں غیر ضروری جذبات اور طنز و تلقین سے گریز کیا گیا ہے۔

حسین الحق کی کہانی ''نیوکی اینٹ'' مجھے اسی لئے اچھی لگی کہ اسے پڑھنے کے بعد نہ ہم پر رقت طاری ہوئی نہ بے کسی و مایوسی، اور نہ ہی غصے میں ہم تھرتھرانے لگے، ہمارے ملک میں مذہب پرستی کی جڑوں کے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب کو جس سہولت کے ساتھ روزمرہ کی زندگی میں اپنے تحفظ کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے، اس کا اچھا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ یہاں خاکہ اڑانے سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ یہ کوئی طنزیہ یا مزاحیہ تخلیق ہے بلکہ ایک Caricature بنانے کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ ٹریجڈی میں کامِک کا پہلو بھی ساتھ ساتھ رہتا ہے اور ملکی صورت حال کی حقیقی Irony اُجاگر ہوتی ہے جسے ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں مگر عموماً نظر انداز کرتے ہیں۔

کہانی دوکلرکوں کی زندگی کے بس ایک دن کی ہے،صورت حال نہ فسادکی ہے نہ کردارں میں کسی قسم کاذاتی تنازعہ ہے،بات بس اتنی ہے کہ اچانک خوف اور بے اعتمادی کی کیفیات جس کے لئے ملک کی فضا ہمیشہ تیاررہتی ہے ایک ان دیکھے گوشے سے ایک پرسکون بستی میں درآتی ہے اور اس شدت کے ساتھ آتی ہے کہ شیو پوجن اور سلامت اللہ دونوں ایک کے بعد ایک خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتے ہیں کہانی میں مذہب اسی حد تک ہے جہاں ایک عام انسان کی زندگی میں ہمارے یہاں ہمیشہ رہتا ہے۔ ہر شخص اپنے اعتبار اور مذہبی پہچان کے ساتھ زندگی کے مسائل میں بھی گھرا ہوا ہے مثلاً سلامت اللہ کو شکایت ہے کہ ''بس چائے پانی سے زیادہ رشوت نصیب نہیں ہوتی..........آمدنی والا ٹیبل اُسے آج تک نہیں ملا'' پڑوس کے لوگوں میں ہمدردی اور شک ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ کسی لمحے ایک جذبہ حاوی ہوتا ہے کبھی دوسرا مگر دونوں صورتوں میں تلاش ''تحفظ'' کی ہے۔

کہانی کا عنوان ''نیو کی اینٹ'' اُس عام حقیقت کا اشاریہ ہے کہ ہمارے ملک کی نیو میں مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان ایک خاموش ''معاہدہ رواداری'' چلا آرہا ہے جسے ہزاروں سال کے تجربے نے ضرورت اور مصلحت کی بناپر جنم دیا مگر اس صورت حال میں متضادعناصر بھی رہتے ہیں جو خلفشار پیدا کر کے چھپ جاتے ہیں ۔یہاں مصنف نے اس بات کو بڑی ذہانت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہماری پوری وابستگیوں میں مذہبی علامتیں بہت اہم ہیں چنانچہ مسجد کی اینٹ اور مندر کی اینٹ دونوں کی اہمیت ہے ،ایودھیا کی تاریخی عبادت گاہ جو دوفرقوں کے درمیان تصادم کا سبب ہے محض ملکیت کے دعوے کی بناپر دونوں فرقوں کے افراد کے درمیان ایک ایسی صورت حال کو ظہور میں لا سکتی ہے جہاں تقدس کا مشترکہ جذبہ اختلاف اور خوف کو بھی پھیلائے اور پھر زندگی کی مصلحت بن کر تحفظ کے بھی کام آئے۔

کہانی کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے کہانی وضع کرنے کے لئے کسی قسم کی میکانکی ترکیب کا استعمال نہیں کیا، نہ وہ کسی قسم کا آئیڈیلزم یا رسمی تلقین کا وظیفہ لے کر نکلے ہیں۔اس ملک میں مختلف اور اور متضادعناصر کے ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا سادہ طرز مصالحت اپنا وجود رکھتا ہے جو نشیب وفراز سے گذرتا ہوا قائم ودائم ہے۔

حسین الحق غیر ضروری تفصیلات سے بچتے ہیں۔کہانی کی منطق کا خیال رکھتے ہوئے گلی محلے کی ہمہ جہتی ،دفتر کے چھوٹے موٹے معاملات ،گھر کے اندر بیوی بچوں کی زندگی۔سب کو وہ کم سے کم لفظوں میں بیان کرجاتے ہیں۔اُنہوں نے جذباتیت کو کہیں بھی آڑے نہیں آنے دیا،جس کی خطرہ اس طرح کی کہانیوں کو ہمیشہ رہتا ہے ......!!

«●»

● فاروق ارگلی

زندگی کے رنگوں،آوازوں اورمنظروں کا آئینہ ساز

(پروفیسر حسین الحق)

آج کی دنیا میں جب حرص وہوس کے اندھیرے حق وانصاف کی روشنی کو نگل جانے کے درپے ہیں،محبتوں کے نورانی عقیدے، پریم اور بھگتی کی سچی آستھا ئیں نفرتوں اور عداوتوں کا روپ دھارن کر جدال وقتال میں مصروف ہیں۔حال کی ترقی یافتہ تہی دست اور برہنہ خواہشیں ماضی کی قباپوش پاکیزہ قدروں کو نوچ کھسوٹ کر بےلباس کیے دے رہی ہیں ،ایسے میں فکر وشعور کی محفل بھی آراستہ ہے،حسینۂ تخلیق حیات وکائنات کی تمام تر سچائیوں کی ہزار رنگ پشواز میں ملبوس ،وقت کے ستار پر محو رقص ہے اور ایک حساس فنکاران تمام رنگوں ،آوازوں اور منظروں کو سمیٹ کر ایسے آئینوں میں ڈھال رہا ہے جن میں اس کے عہد کا ہر روپ صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔صدی کے معتبر اردو فکشن نگار حسین الحق کی تخلیقی آئینہ سازیوں کو اسی سیاق میں دیکھا جاتا ہے ،آگے بھی دیکھا جاتا رہے گا اور جس قدر دیکھا جائے گا اس کی اہمیت ومعنویت میں اضافہ ہوتا جائے گا،اس لیے کہ ایسے فنکار کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

حسین الحق کو صرف کہانی کار کہنا شاید ان کے ساتھ زیادتی ہوگی ،درحقیقت وہ ایک مفکر،فلسفی تاریخ داں ،متصوف ،ماہرنفسیات،معلم ،مصلح اور عالمی ادبیات کے عارف بھی ہیں،ان کی شخصیت کے یہ پہلو ان کی کہانیوں اور ناولوں میں بخوبی نظر آتے ہیں۔یہی خصوصیت انہیں ہم عصر فکشن نگاروں سے الگ کرتی ہے اور ان کی کہانیاں صرف کہانیاں نہیں رہتیں وہ ہمارے ادب حالیہ کا اہم فن پارہ بن جاتی ہیں۔

حسین الحق کی افسانہ نگاری سے متعلق اب سے تین دہائی پہلے ڈاکٹر قیام نیر نے بڑا بامعنی تبصرہ کیا تھا:

''حسین الحق صاحب افسانہ نگاری کے تیسرے دور سے لکھ رہے ہیں،یہ وہ دور تھا جب افسانے میں نئے نئے تجربے ہورہے تھے،علامت نگاری کا بول بالا تھا،شعور کی رو پر کہانیاں لکھنا ایک فیشن بن چکا تھا،یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی اس رجحان اور اس رویے کو اپنایا،لیکن اس ڈھنگ سے اپنایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جدید افسانوں کی دنیا میں ان کا نام اہمیت کا حامل بن گیا۔وہ اردو افسانوں میں اظہار کی تیز ترین دھار نئے الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی تخلیقی سطح کی وجہ سے اپنے ہم عصروں سے کافی آگے

بڑھ گئے ہیں۔ وہ کسی مسئلے کو سننے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں اور بے باک ہوکر گفتگو کرتے ہیں۔یہی ایک ایسی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ پوری کائنات کو سانسوں میں اتار لینا چاہتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے ماہنامہ 'شاعر' بمبئی کے افسانہ نمبر(دسمبر ۱۹۸۱ء) سے طارق سعید کی یہ رائے بھی درج کی ہے:

''حسین الحق کا فن علامت،استعارہ اور تمثیل کے بوتے پر مہملیت سے کنارہ کشی اور ماورائی کائنات اور اقدار کی کہانی سے عبارت ہے۔ خارجی حالات کی نامساعد کیفیات کا لامتناہی سلسلہ ایک طرف اور ہزاروں خواہشات کی تکملیت دوسری طرف ایسی صورت میں انسانی زندگی میں تضاد کا پیدا ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔''

ڈاکٹر قیام نیر آگے لکھتے ہیں:

''حسین الحق نے ماضی کے حالات علامتوں کے پرپیچ تنوع کے ساتھ پیش کئے ہیں۔خصوصیت سے تقسیم ہند کے بعد ہونے والے ہولناک واقعات ،فرقہ وارانہ فسادات کے اثرات اور سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانی ،گندگی ،تہذیبی زوال اور جنوب مشرقی ایشیا کے سیاسی پس منظر کو پراسرار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کہیں کہیں فضا آفرینی اور تجریدیت کی بوقلمونی ان کے افسانوں میں موجود ہے۔''

قمرالتوحید صاحب کے خیال میں حسین الحق صاحب نے آدمی پر ہونے والے مظالم کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔خود ان ہی کے لفظوں میں:

''آدمی پر ہونے والے مظالم کمزور اقوام کے خلاف ظالم وجابر انسانی گروہوں کی سازشیں ،فنی اقدار کا پھیلاؤ،وحدت آدم،وحدت کائنات ،سماج میں پھیلی گندگی،تقسیم ہند کے ہولناک اثرات ،فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں انسانی زندگی کی روداد،اقتدار کے ذریعہ ہماری طاقت احتجاج ،مظلومیت کی حمایت کے بدترین نتائج ،وحدت وجود کی تہذیبی اہمیت ،کھوئے ہوؤں کی جستجو، 1947ء کے بعد جو جینے کا جذبہ رکھنے والی ہندوستانی مسلم قوم کی جدوجہد،انسانی درد کی یکسانیت وغیرہ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔'' (بہار میں اردو افسانہ نگاری ابتدا تا حال1996ء)

گزشتہ عشروں میں گنگا اور سون میں بہت پانی بہہ چکا ہے۔اس دوران حسین الحق فکروفن اور علم

وبصیرت کے اس بلند مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمہ شما ر نہیں پاسکے۔ڈیڑھ سو سے زیادہ افسانوں اور عہد ساز ناولوں کے خالق حسین الحق کے افسانوی مجموعے پس پردۂ شب (1991)صورت حال (1982) گھنے جنگلوں میں(1989) مطلع (1996)سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (1996)نیو کی اینٹ (2010) غور سے دیکھیں تو ایک سو سے زیادہ حسین الحق کے افسانے اردو فکشن کی آبرو قرار دیئے جاسکتے ہیں لیکن ''نیو کی اینٹ''،'چپ رہنے والا کون'،'ندی کنارے دھواں'،'استعارہ'،'ایندھن'،'مور پاؤں'،'جلیبی کارس'،'کربلا'،'زخمی پرندے'،'گونگا بولنا چاہتا ہے'،'سبحان اللہ'،'وقنا عذاب النار'،'احد'،'کہاسے میں خواب'، 'مردہ راڈار'،'لڑکی کو رونا منع ہے'اور'جلتے صحرا میں ننگے پیروں رقص'وغیرہ ایسی تخلیقات ہیں جنہیں افسانوی ادب میں دوام کا درجہ دیا جاتا ہے۔حسین الحق کی کہانیوں کے بارے میں یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ تاریخ ،کلچر،مذہب اور اساطیر سے کم آگاہ قاری ان سے پوری طرح محظوظ نہیں ہوسکے گا۔دراصل ان کا تخصص یہ ہے کہ انہوں نے ماضی کے واقعات اور اساطیر کے حوالے سے اپنے عہد کی سنگین حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔نامور افسانہ نگار،ناقد اور محقق کلام حیدری کے بقول:

''حسین الحق کے پاس روایات کا خزانہ ہے اور وہ انہیں عہد جدید کے لئے Relevent بنا کر پیش کرتا ہے۔مذہب اس کی تربیت کا پس منظر ہے۔''

پروفیسر وہاب اشرفی کلام حیدری کی یہ رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسین الحق کے یہاں حق وباطل کی کشمکش ایک خاص موضوع ہے،یوں اپنی گفتگوؤں میں وہ ایسے موضوعات چھیڑتے رہتے ہیں،لیکن یہ کشمکش تو ازلی ہے،بڑی بات ہے کہ حسین الحق اسے حالات حاضرہ پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔چنانچہ کوئی بھی تاریخی واقعہ نئے منظرنامے کا جزو بن جاتا ہے اس لیے کہ یہ کشمکش Unending ہے۔دیکھئے وہ کس طرح اپنے افسانے 'کربلا' میں تاریخی کرب کو نئے حالات سے وابستہ کرتے ہیں۔انسان ایک دہشت میں مبتلا ہے۔یہ دہشت ماورائی نہیں ارضی ہے۔ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کا پیدا کرنا انسانی سرشت کی ایک بدصورت تصویر ہے لیکن جو اس سے لڑتا ہے اس کا رد پیش کرتا ہے۔وہ انسان کی دوسری سرشت کا علمبردار ہے جو مثبت ہے،میں نے ایک زمانہ پہلے حسین الحق کی ایک کہانی وقنا عذاب النار دیکھی۔تیس برسوں سے ایک لاش کمرے میں گل سڑ رہی ہے،اب لوگوں کو اس کا احساس ہوا ہے،لوگ اس سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں ہیں کہ یہ لاش

غائب ہوجاتی ہے اور دوحصوں میں تقسیم ہوکر وقت بے وقت گھروں پر دستک دیتی ہے اور انھیں شکار بناتی ہے۔ ہوسکتا ہے حسین الحق ہندو مسلم نفاق کا استعارہ لاش کو بنائے ہوئے ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے درپے ہیں۔ یہ لاش ہندو مسلم فساد کی ہے۔ یہ لاش انسانیت کی ہے جو برسوں سے لوگوں کی بے حسی سے تنگ آکر اب خود انھیں جگانے چلی آتی ہے۔ ''نیو کی اینٹ'' میں مسلمانوں کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ خصوصاً اس نقطہ نظر سے کہ کس طرح ایک کمیونٹی کو فنڈا منٹلزم کی آڑ میں بدنام کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ یہ سازش مسلمانوں کی اہمیت پر ضرب لگانے کی ایک نامشکور کوشش ہے۔ حسین الحق نے اس موضوع کو کسی عامیانہ انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ ایک فنی صورت اس طرح دی کہ اثرات دوررس ہوجاتے ہیں۔ دراصل آج کے ہندو مسلم افتراق کی جوغیر فطری صورتِ حال پیدا ہوئی ہے وہ افسانہ نگار کو مسلسل پریشان کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ تخلیقی سطح پر بیدار ہوکر اسے برتنے کی سعی میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسی سلسلے کی کہانی 'مور پاؤں' بھی ہے جس میں غیر فطری طور پر جس طرح ہندو اور مسلمان کے درمیان دیوار کھینچنے کی کوشش کی جارہی ہے اور کلچرل طریقے پر ان کی تقسیم کا بگل بجایا جارہا ہے وہ حسین الحق کے کرب کی ایک صورت ہے جسے تخلیقی طور پر برت کروہ ایک طرح کی کتھارسس کرتے نظر آتے ہیں۔ گلوبل ایشوز میں عراق آج کے مبحث کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس کی ایک صورت 'گونگا بولنا چاہتا ہے' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح دوسری کہانیوں میں بھی بعض ایسے حالات کو کہانی کی شکل دی گئی ہے جس میں عالمی مسائل درآئے ہیں۔ خود مسلمانوں کی سطح پر عالموں کا ایک جم غفیر ہے جس میں چند عالم باعمل ہیں اور زیادہ تعداد بے عمل عالموں کی ہے۔ یہ حالات کا جبر ہے، باطل علماء مسلسل فروغ پارہے ہیں۔ ایسی تصویر دیکھنی ہوتو 'زخمی پرندہ' پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے۔''

(تاریخ ادب اردو جلد سوم)

بابری مسجد کی شہادت پر لاتعداد کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ حسین الحق کی لازوال کہانی ''نیو کی اینٹ'' بھی اسی المیہ پر مبنی ہے لیکن ''نیو کی اینٹ'' کو اس لیے بابری مسجد المیہ کے ضمن میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے کہ یہ واحد تخلیق ہے جو حیرت ناک طور پر اکثریتی اور اقلیتی طبقہ کے سماجی اور تہذیبی رشتوں کے روایتی استحکام کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ شیو پوجن اور سلامت اللہ کی دوستی کی کہانی ہے۔ بابری مسجد شہید ہوچکی ہے، فتح کی

علامت ڈھائی ہوئی مسجد کی اینٹوں کی شہر شہر نمائش ہورہی ہے۔ شیو پوجن کے یہاں بھی اینٹ آتی ہے، اس کے گھر پر بڑی رونق ہوگئی ہے لیکن جب اس سے نقص امن کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو سرکار پکڑ دھکڑ شروع کردیتی ہے۔ شیو پوجن پکڑے جانے کے ڈر سے مسجد کی اینٹ سلامت اللہ کے حوالے کردیتا ہے کیونکہ اس کے گھر پر چھاپہ پڑنے کا خطرہ نہیں تھا۔ کہانی کا یہ آخری حصہ دیکھئے۔ سلامت اللہ شیو پوجن سے پوچھتا ہے:

''اچھا یہ تو بتایئے یہ کس حصے کی ہے؟'' اچانک سلامت اللہ نے ایک بہت ہی عجیب سوال کرڈالا۔

''یہ......؟ یہ نیو کی ہے۔ اوپر کا تو زیادہ حصہ برباد ہی ہوچکا۔'' شیو پوجن نے بلا جھجک بڑی صفائی سے جواب دیا مگر جب وہ اسے لیے ہوئے اپنے گھر پہنچا تو بیوی بالکل بلبلا اٹھی اور شیرنی کی طرح جیسے اس پر جھپٹ پڑی۔ آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ کل اسی کو لے کر اتنا پریشان تھے اور آج اسی کو گھر اٹھا لائے؟''

''یہ بہر حال اپنی چیز ہے۔'' سلامت اللہ نے سمجھانا چاہا۔

''اپنی چیز؟'' بیوی غصہ میں ناچ ناچ گئی۔ ''کسی کو ناسور یا پھوڑا ہوجائے تو وہ بھی تو اس کی اپنی چیز ہوتا ہے تو کیا وہ سینت سینت کر اپنے پاس رکھے رہتا ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ'' سلامت اللہ بگڑا تھا۔

''کیا بیہودہ باتیں کرتی ہو؟ کہاں ناسور؟ کہاں یہ! ارے اس کی حفاظت کرنا اور اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔''

''اچھا ابا ایک بات بتایئے۔'' اچانک کالج میں پڑھنے والا بیٹا بول پڑا۔ ''آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے، تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر زمانے میں ہر آدمی کے لیے مسئلہ بن جاتی ہے، حد یہ ہے کہ اب شیو پوجن چاچا کے لیے بھی مسئلہ بن گئی۔ اسے اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ سلامت اللہ نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھا......وہاں اس کا بیٹا ہی تھا مگر دھند گہری تھی اس لیے پہچاننے میں دشواری ہورہی تھی۔''

پھر بیوی کی آواز سنائی دی، کورٹ، کچہری، تھانہ......ان کا کوئی ٹھکانہ! کہیں یہ شیو پوجن کے گھر جاتے جاتے ہماری طرف مڑ گئے تو؟ نا بابا......بیوی بالکل مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔

''دیکھو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔'' سلامت اللہ کو لگا کہ اب وہ اپنے

گھر میں بھی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

''ارے جایئے، جایئے بیوی غصہ میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''کسی اور کو جاکر سمجھایئے اور اس سے پہلے خود سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ دلی میں بیٹھے سورما تو اس آگ سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے ہم لاچار لوگ کس گنتی میں ہیں۔''

یہ بات سلامت اللہ کے جی کو بھی لگ گئی سچ مچ جب آگ لگی تو دلی میں بیٹھے سورما بھی تو صرف دور دور ہی سے آگ آگ کا شور مچاتے رہے۔

''مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ جب وہ باہر آیا تو دیکھا کہ شیو پوجن کے گھر والے کہیں جارہے ہیں۔

''کہاں جارہے ہو؟'' اس نے شیو پوجن کے لڑکے سے پوچھا جو گھر میں تالا لگا رہا تھا۔

''جی ہم لوگ موسی کے یہاں کاشی جارہے ہیں۔''

''اور شیو پوجن جی......؟''

وہ پہلے ہی اسٹیشن جاچکے، اتنا کہتے ہوئے لڑکا بھی رکشہ پر بیٹھ گیا۔''

شاید باپ کے حکم کے مطابق وہ بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ شیو پوجن کی اسٹریٹجی سلامت اللہ کی سمجھ میں آگئی۔ بال بچوں والا آدمی ڈر کے بھاگے نہیں تو اور کیا کرے۔

مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ شیو پوجن تو گیا سے نکلتا ہے اور کاشی چلا جاتا ہے۔ اور چاہے گا تو کاشی سے اپنے ماما کے گھر متھرا چلا جائے گا لیکن سلامت اللہ کیا کرے جس کو شیو پوجن نے زبردستی نیو کی اینٹ سونپ دی ہے۔

''مور پاؤں'' بھی ایک سینئر کانگریس کارکن لکشمی جی اور ان کے مسلمان دوست کی کہانی ہے۔ لوکیشن خواجہ کی نگری اجمیر ہے۔ کہانی کے فرسٹ پرسن میاں صاحب اور لکشمی جی کی گفتگو:

''کل آپ کی ایک بات نے مجھے بے چین کردیا ہے۔''

''کون سی بات بندھو؟'' انہوں نے حیرت سے مجھے تکا۔

''آپ نے کہا تھا بھارت ماتا کو ایک آبجیکٹ کے طور پر ہمارا ماڈل بننا چاہیے۔''

''ہاں کہا تو تھا۔''

''آپ تو کانگریس کے بہت ایکٹیو ممبر رہے ہیں۔ آپ کا Defination

سیکولرزم سے میل نہیں کھا رہا ہے۔'' لکشمن جی نے چھیلی ہوئی الائچی ٹرے میں رکھ دی اور بہت آہستگی کے ساتھ لیکن بہت پراعتماد لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولے، ''میں کانگریسی ضرور ہوں لیکن آپ نے مجھے سیکولر کیسے سمجھ لیا، یہ غلط بات ہے، میں ہندو ہوں۔''

اس کے بعد لکشمن جی بھی چپ ہوگئے اور میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اب میں آگے کیا بات کروں، لکشمن جی میرے سامنے بیٹھے تھے اور میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، پھر بھی مجھے محسوس ہورہا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان بھیانک لاتعلقی پھنکار مار رہی ہے۔ میں شاید چاہ کر بھی اچانک اُبھری اس لاتعلقی کو اکھاڑ پھینکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، لکشمن جی نے ہی پہل کی۔

''اور سنایئے کیا حال چال ہیں، آپ لوگ ابھی کہاں سے لوٹے؟''

''درگاہ سے۔'' میں نے اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے باہر آتی محسوس کی۔

''ارے تو ہمیں بھی کہا ہوتا، ہم بھی چلتے اجمیر میں تو آستھا کے دو ہی کیندر ہیں، پشکر ناتھ اور دوسرے کھاجا صاحب۔''

سیاست کے میدان میں کامیابی اور عہدوں کی آرزو میں ضمیر اور ناموس کا سودا کرنے والے کرداروں پر بہار کے کئی فکشن نگاروں نے بے نظیر افسانے اور ناول لکھے ہیں، لیکن حسین الحق کی کہانی 'جلیبی کارس'' اس موضوع پر دلچسپ، بالکل سچی سیاسی گلیاروں میں حرص و ہوس اور لالچ کا تعفن پھیلانے والے ایک اولوالعزم سیاسی کارکن کی کہانی ہے، جو ملکھیہ منتری کے بااثر سیکریٹری کو اپنی بیوی کے ساتھ اپنی خوابگاہ میں قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر اسے قتل کردینا چاہتا ہے لیکن جب وہ شخص اسے ایک بڑے عہدے کا تقرری نامہ تھماتا ہے تو وہ اس کے پاؤں چھونے لگتا ہے۔

حسین الحق نے ہندوستانی مسلمانوں کی قدیم روایات، سماجی اقدار، زوال اور تباہی کی کبھی نہ بھولنے والی کہانیاں تخلیق کی ہیں، انھوں نے زندگی اور ہندوستانی معاشرے کے جس پہلو پر بھی افسانہ لکھا وہ ناقابل فراموش بن گیا۔ انھوں نے دو ناول لکھے، پہلا ناول 'بولو مت چپ رہو' 1990ء میں منظر عام پر آیا۔ آج کی دنیا میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کے مسئلے پر یہ ناول اردو ادب کو حسین الحق کی فکر انگیز دین ہے۔ ناول میں جس فنکارانہ خلوص اور مفکرانہ اسلوب میں، ہندوستان کے تعلیمی نظام کا محاکمہ کیا ہے، اس کے بارے میں پروفیسر سید محمد عقیل کا یہ کہنا ناول کا بہترین تعارف ہے کہ 'بولو مت چپ رہو' اس موضوع پر اب تک کا سب سے اچھا ناول ہے۔ لیکن ان کا شہرۂ آفاق ناول 'فرات' اردو کی عصری ناول نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'فرات' کو ملک گیر سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس پر تبصرے اور تجزیاتی مضامین ادبی جرائد میں شائع

ہوئے ،انھیں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے 'فرات' مطالعہ ،محاسبہ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کردیا۔'فرات' کے بارے میں نامور دانشور ڈاکٹر جاوید حیات کا یہ تجزیہ صائب اور حقیقت پسندانہ ہے:

'فرات' عمل اور ردِ عمل کے مسلسل اور پیچیدہ دام میں گرفتار اور زندگی کا اعلانیہ ہے جو فرات کے مانند ہے اور جس کے کنارے کھڑی تشنہ لب انسانیت کرب و بلا میں گرفتار ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ کائنات کا انتہائی تسلسل ہر گزرے ہوئے لمحے کو کہانی بناتا چلا جارہا ہے اور نور و تاریکی کی آنکھ مچولی جاری ہے۔ حسین الحق نے نور و تاریکی کی اسی آنکھ مچولی کو صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے جہاں ان کا تجربہ اور اظہار گھل مل کر ایک عضویاتی کل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔''

مقتدر محقق ،نقاد اور دانشور پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنی تازہ ترین کتاب اردو ناول: تعریف اور تجزیہ میں عہد حاضر کے اس گرانقدر ناول کا تنقیدی مطالعہ 'فرات تشنہ لب انسانیت کا اعلانیہ' کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ فراہیم صاحب کے طویل و بسیط مقالے کا درج ذیل حصہ حسین الحق کے اس تاریخ ساز ناول کی تفہیم کا بہترین وسیلہ ہے:

حسین الحق نے تاریخ ،تہذیب ،ثقافت اور معاشرتی شعور سے اپنا تخلیقی نظام قائم کیا ہے۔ انہوں نے فکشن کے رائج سانچوں کو توڑ کر اظہار کے نئے رویوں کو فروغ دیا ہے۔ ناول 'فرات' اس کی واضح مثال ہے جو تشنہ لب انسانیت کا اعلانیہ ہے۔ دوسو چھیانوے صفحات پر مشتمل یہ ناول 1992 میں شائع ہوا۔ یہ سال صرف بابری مسجد کی شہادت کا سال نہیں بلکہ آپسی رشتوں اور اعتماد کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا سال ہے۔ 'فرات' کی اہمیت اور افادیت ہر پر آشوب دور میں اور تشنہ لب عصر میں محسوس ہوتی ہے لہٰذا حسین الحق نے وقار احمد کے توسط سے پانچ نسلوں پر مشتمل ایک کہانی قاری کے سامنے پیش کردی اور سوچنے ،سمجھنے اور عمل کرنے کے نئے در کھول دیئے۔ اس عبرت ناک کہانی میں مرکزیت وقار احمد کو حاصل ہے جن کی پشت پر ابا جان اور دادا حضرت کی یادیں ،سامنے بیٹے ،بیٹی پوتے پوتی اور درمیان میں خود وقار احمد اور ان کی پچھتر سالہ زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ ابا جان اور دادا حضرت تو پس منظر کا کام دیتے ہیں، پیش منظر میں بڑے بیٹے فیصل کا کنفیوز ڈ مگر قابل توجہ کردار ہے جو نہ تو پوری طرح جدید بن سکا اور نہ ہی قدیم روایات سے وابستہ ہو سکا۔ دوسرا بیٹا تبریز ہے جو ذہنی ہیجان میں مبتلا، مذہب سے بے بہرہ، گھر سے بیگانہ اور خود سے اکتایا ہوا نظر آتا ہے۔ تیسرا کردار بیٹی شبل کا ہے۔ پینتیس سالہ روشن خیال لڑکی شبل جمہوریت سیکولرزم اور کمیونزم کی دلدادہ ہے اور سب کو اپنے طور پر زندگی گزارنے کا حق دلانا چاہتی ہے مگر فسادیوں کی بربریت کا شکار ہوتی ہے اور جس کے بارے میں کمیشن آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ پولیس کی گولی سے مری یا حملہ آوروں کے وار سے۔ 'فرات'

کی کہانی بظاہر ایک خاندان کی کہانی کی طرح ابھرتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کا کینوس وسیع ہوتا جاتا ہے اور پھر اس میں ماضی کا چہرہ جزئیشن گیپ ،مذہبی رویے ،سیاست ،تہذیب ،ثقافت غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں کے در کھلتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی اس تخلیقی خوبی اور فنی چابک دستی کے ساتھ کہ قاری کی دلچسپی ناول کے آخری صفحات تک مسلسل قرار رہتی ہے۔ آئیڈیالوجیکل مسائل اور اقدار کے تصادم کی عکاسی کے علاوہ مذکورہ ناول اس کرب کا بھی شدت سے احاطہ کرتا ہے جس میں ہندوستانی مسلمان تقسیم وطن کے بعد سے آج تک عدم تحفظ کے حالات سے دوچار ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کس طرح صرف مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچاتے ہیں اور پولیس اس میں کس طرح برابر کی شریک رہتی ہے، یہ ناول اس کی نشاندہی کرتا ہے اور لاشعوری طور پر یہ بھی احساس دلاتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس یا تو عظمت رفتہ کی داستانیں ہیں یا حال کی بدحالیاں اور وہ ان ہی کے وسیلوں سے جی رہے ہیں، آگے بڑھ رہے ہیں کیونکہ زندگی کی چاہت بار بار انھیں ٹھونگے مار رہی ہے اور آگے بڑھنے پر اکسا رہی ہے۔

حسین الحق کا یہ ناول عمل اور ردِ عمل کے پیہم اور پیچیدہ دام میں گرفتار اس زندگی کا اعلانیہ ہے جو فرات کی مانند ہے اور جس کے کنارے کھڑی تشنہ لب انسانیت کرب و بلا میں گرفتار ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ اس ہمہ گیر علامت کی روشنی میں جو اہم پہلو ہمارے سامنے ابھر آتا ہے وہ یہ کہ قوم کو نہ صرف اپنی تاریخ سے واقف ہونا چاہئے بلکہ اس سے سبق بھی لینا چاہئے۔ ماضی کی طرف مراجعت کا سفر کل، آج اور کل کے پل کو پاٹنے میں معاون ہوتا ہے۔ اسی کے توسط سے وہ محرکات اُجاگر ہوتے ہیں جو ہمیں مہمیز کرتے ہیں، جدوجہد پر اکساتے ہیں اور ہمیں Nostalgic بھی بناتے ہیں۔ بس انتخاب کا اہتمام اور واقعات کی روح کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ حسین الحق تقسیم ہند کا ذکر کرتے ہوئے اس سائیکی کو بہت خوبصورت ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ مملکت خداداد اسلامیہ پاکستان اور سیکولر جمہوریہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون سے وہ ہولی کھیلی گئی کہ مہابھارت کی جنگ چھوٹا سا حادثہ محسوس ہونے لگی اور راتوں رات انسانی تقدیر کے کلینڈر کا ایک ورق زوردار ہوا کے جھونکے سے پھٹ کر کہیں دور پھینکا گیا اور اب مسلمان ہندوستان میں ایک نمبر کے شہری کا بلا لگائے ،دو نمبر کے شہری کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ ناول 'فرات' اپنی تنظیم کا احساس دلاتا ہے ،مسائل سے دوچار کرتا ہے اور حساس قاری کو دیر تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے تمام کردار اپنی اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کے باوجود نا آسودہ نظر آتے ہیں اور خود شناسی اور خود دریافتگی کے عمل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مثلاً تبریز اپنے اردگرد کے جس زدہ ماحول سے گھبرا کر خود سے پوچھتا ہے: میں کون ہوں؟.....

میں کیوں ہوں؟.....میں کب سے ہوں..... ؟ (اردو ناول تعریف تاریخ تجزیہ)

حسین الحق کا تعلق شیر شاہ کے شہر سہسرام کے ایک عظیم صوفی خانوادے سے ہے، ان کے والد حضرت مولانا انوار الحق شہودی نازش سہسرامی مشہور عالم دین ،خطیب شاعر اور ادیب تھے۔ حسین الحق 2 نومبر 1949ء کو سہسرام میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خانوادے کی روایات کے مطابق اپنے والد ماجد کے زیر سایہ دینی تعلیم سے ہوئی۔ انہوں نے مدرسہ کبیریہ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اور عالم تک درس حاصل کیا۔ اپنے تعلیمی ادبی اور تدریسی سفر کی روداد خود حسین الحق صاحب کے الفاظ میں:

''میں ۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو سہسرام میں پیدا ہوا۔ ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے بعد آرہ ضلع اسکول سے میٹرک کیا۔ ایس۔ پی جین کالج سے گریجویشن کیا اور یونیورسٹی میں فرسٹ کلاس فرسٹ آیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور اس میں بھی ٹاپ کیا۔ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے فارسی میں ایم۔ اے کیا اور فرسٹ کلاس سکنڈ پوزیشن پائی۔ اردو افسانوں میں علامت نگاری کے موضوع پر ۱۹۸۵ء میں پی ایچ۔ ڈی کا کام مکمل ہوا۔ ایم۔ اے کرنے کے فوراً بعد گرو گوبند سنگھ کالج، پٹنہ سیٹی میں عارضی طور پر بحیثیت لیکچرار جوائن کیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یو جی سی سے جونیر فیلوشپ ملی اور غالباً ۱۹۷۳ء تک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں ریسرچ کا کام بھی کرتا رہا اور آئی۔ اے سے ایم۔ اے تک کی کلاسیں بھی لیتا رہا۔ میرے اس زمانہ کے شاگردوں میں پروفیسر شاداب رضی ڈاکٹر ،انیس صدری ،ڈاکٹر نعیم فاروقی اور آج کے کانگریسی لیڈر شکیل الزماں انصاری کا نام قابل ذکر ہے۔ اسی درمیان کمیشن سے ایس۔ پی کالج دمکا میں بحالی ہوئی۔ ۱۹۸۱ء میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں تبادلہ ہو گیا اور اس وقت سے اب تک وہیں مصروف کار ہوں (اب سکڈوش) میری شادی نشاط آرا خاتون بنت سید محمد اسرار الحق ریٹائرڈ اسسٹنٹ رجسٹرار و سکریٹری ٹوبی سی سے ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ اہلیہ گیا کے ایک ہائی اسکول میں اردو ٹیچر ہیں۔ دو بیٹی اور دو بیٹے اللہ نے عطا کئے۔ (ماشاء اللہ سب اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں) لکھنے پڑھنے کا کام دس برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ پہلی کہانی 'عزت کا انتقال' صوفی بلیاوی کے نام سے ماہنامہ 'کلیاں' لکھنؤ میں غالباً ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ اسی زمانہ میں پہلا افسانہ 'پسند' ماہنامہ 'جمیلہ' دہلی میں چھپا۔ ۱۹۶۶ء میں شفق اور فخر رضوی کے ساتھ مل کر میں نے بچوں کا ایک رسالہ 'انوار صبح' سہسرام سے نکالا۔ میرا پہلا مضمون 'بہار کی خبریں'' پٹنہ میں غالباً ۱۹۶۹ء میں چھپا جس کا عنوان تھا 'اردو شاعری پر گاندھی جی کے اثرات' آج تقریباً دو سو افسانے ڈیڑھ سو مضامین، پانچ افسانوی مجموعے، دو ناول، چار نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں مطلع کو بہار اردو اکیڈمی نے پہلے انعام کا اور ناول 'فرات' کو دوسرے انعام کا اور افسانوی مجموعوں 'پس

پردہ شب' اور 'صورت حال' کو بھی دوسرے انعام کا مستحق سمجھا۔ وزارت فروغ انسانی حکومت ہند کی طرف سے جونیئر فیلوشپ اور سینئر فیلوشپ دونوں سے نوازا گیا۔ پچاسوں سیمینار، کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ حتی الامکان اور اپنی بساط بھر زبان و ادب سے جڑے رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ باقی آپ جانیں اور اردو والے جانیں۔'' (اردو دنیا دسمبر ۲۰۰۳ء)

درس و تدریس کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ تصنیف و تالیف میں وہ آج تک پوری ذہنی شعوری تخلیقی توانائی کے ساتھ مشغول ہیں۔ تصوف کا ذوق ان کے اسلاف کی وراثت ہے۔ انہوں نے تصوف و روحانیت کے موضوع پر مسلسل مقالات تحریر کیے۔ اس باب میں ان کی خدمات کا ارباب تصوف و معرفت نے اعتراف کیا ہے۔ آپ نے آثار حضرت وحید (تصنیف حضرت سرور اورنگ آبادی)، غیاث الطالبین (تصنیف حضرت مولانا غیاث الدین اصدقی) فوز و فلاح کی گمشدہ کڑی اور شرف آدم کا نقطۂ عروج (تصنیف مولانا انوار الحق شہودی) وغیرہ کی از سر نو تالیف و تدوین کی۔ برگزیدہ دینی و روحانی شخصیت حضرت وصی الحق مسکین اصدقی کی سوانح آثار حضرت وصیؒ اور عظیم مجاہد بزرگ حضرت قاضی علی حق کا تذکرہ ،آثار بغاوت، ان کی مشہور تالیفات ہیں۔ انہوں نے اپنے والد حضرت مولانا انوار الحق شہودی سہسرامی کے دو شعری مجموعے مرتب کر کے شائع کیے۔ انہوں نے قاضی علی حق اکیڈمی کے نام سے باقاعدہ اشاعتی ادارہ، آمڈاری ہاؤس سہسرام' میں قائم کیا، جہاں سے اپنی اور اپنے والد محترم کی نگارشات کے علاوہ دیگر شعراء و ادباء کی معیاری کتابیں بھی شائع کیں۔ شروع میں شاعری سے خوب لگاؤ رہا۔ نظموں کا مجموعہ' آخری گیت' بہت پہلے 1977ء میں شائع ہو چکا تھا۔ ان سب کے علاوہ 'اتحاد اساتذہ کی اہمیت' 'نثر کی اہمیت' اور 'اردو فکشن ہندوستان میں' ان کی گرانقدر تنقیدی کاوشیں ہیں۔ انجمن تصوف پسند مصنفین ایک تعارف ،دائرۂ حضرت وصی ، مقالات مولانا انوار الحق اور تفہیم تصوف ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان کا تازہ ترین ناول 'اماوس میں خواب' جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔

حسین الحق کے فن اور شخصیت پر یہ باقاعدہ مضمون نہیں، محض چند تعارفی جھلکیاں ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

25-Ganesh Park
Rasheed Market
Delhi-110051
9212166170

● ڈاکٹر منظر اعجاز

حسین الحق اور ''نیو کی اینٹ'' کے افسانے

حسین الحق نے ہرچند کہ ناول بھی لکھے ہیں اوران کے ناول ''بولومت چپ رہو'' اور ''فرات'' ادبی مذاکروں اور سیمناروں میں گفتگو کا موضوع بنتے رہے ہیں۔علاوہ ازیں ان پر بے حد اہم مضامین بھی لکھے گئے ہیں اور کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔اس کے باوجود حسین الحق بحیثیت افسانہ نگار ہی اردو فکشن کی تاریخ میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہی۔عبدالصمد ،شوکت حیات، شفق،شموئل احمد ، ساجد رشید،سلام بن رزاق ، طارق چھتاری ،اقبال حسن آزاداورسید محمد اشرف جیسے ہم عصروں کے مابین حسین الحق کی شخصیت ممتاز ومنفرد نظر آتی ہے ان میں کچھ تو ایسے ہیں جن کی سرگرمیاں سرد پڑ چکی ہیں اور بعض نے تو اس دنیا کو ہی خیر باد کہہ دیا ہے۔لیکن حسین الحق کی فعالیت لائق دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔بیس افسانوں پر مشتمل ان کا ساتواں افسانوی مجموعہ ابھی میرے پیش نظر اور زیرِ گفتگو ہے۔ان بیس افسانوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

ناگہانی ،مور پاؤں،سبحان اللہ ،انحد ،مردہ راڈرا ،جلیبی کارس ، ''زندگی اے زندگی''،آشوب، نجات......کوئی نجات!،بچاؤ بچاؤ،کب ٹھہرے گادرد اے دل!استعارہ،جلتے صحرا میں ننگے پاؤں رقص،کہاسے میں خواب،گونگابولنا چاہتا ہے،لڑکی کورونا منع ہے،غم زدہ،یہ آدمی،رام نگر کے رستے میں اور نیو کی اینٹ۔

درج بالا فہرست سے واضح ہے کہ ''ناگہانی'' پہلا اور ''نیو کی اینٹ'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے۔اور نیو کی اینٹ ہی سرنامۂ کتاب ہے۔اوراس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی دیباچہ یا پیش لفظ نہیں۔ویسے یہ بات بھی درج دفتر کی جاسکتی ہے کہ حسین الحق نے اپنی کسی کتاب پر کبھی کوئی پیش لفظ لکھا،نہ لکھوایا۔حسین الحق نے اس افسانوی مجموعے کو کسی فلک بوس ادبی کارنامے یا ہمالہ نما افسانوی معیار کے دعوے کے بغیر ہدیہ ،ناظرین وقارئین کردیا ہے۔ مجھے جہاں تک یاد آتا ہے کہ اس مجموعہ کے بعض افسانے پہلے بھی بعض موقر رسائل وجراید میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اس مجموعے میں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر سمجھا جاسکے کہ فلاں افسانہ فلاں جریدے میں پہلے شائع ہو چکا ہے۔یہ تفصیلات ہر چند کہ غیر ضروری ہیں لیکن ان سے حسین الحق کی فطری سادگی اور فنکارانہ بے نیازی کے آیات وآثار کا پتہ چلتا ہے۔جہاں تک زیرنظر افسانوں کے کیف وکم کا تعلق ہے،ہر افسانہ نہ صرف ماجرا نگاری اوراپنے شفاف بیانیہ نیز رواں اسلوب کی وجہ سے متاثر کرتا ہے بلکہ زندگی کے سوزوساز دردوداغ کی کیفیات میں قاری کو ہمیشہ شریک اور منہمک

رکھتا ہے اور یہ کیفیت پہلے ہی افسانہ ''ناگہانی'' سے شروع ہوجاتی ہے اور آخری افسانہ ''نیو کی اینٹ'' تک جاری رہتی ہے۔ پہلا افسانہ تقسیم ہند کے بعد کے ایک زمیندار گھرانے کی خستہ حال معاشی صورت حال کا نوحہ ہے تو آخری افسانہ چھ دسمبر کے پس منظر میں سیاست گزیدہ اکثریتی نفسیات کا غماز جواقلیتی طبقہ کے لئے خوف وہراس اور بے چینی کا سبب بن جاتا ہے۔ان افسانوں پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے،جس کی تکمیل ممکن ہو سکی تو آخری سطور میں ہو سکے گی۔اب جہاں تک دوسرے افسانوں کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ چند اشاروں سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ویسے چند خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔

حسین الحق کے تقریباً تمام افسانے معاشرتی زندگی اور سماجی حقائق کے عکاس ہیں۔ یہاں ہمارا واسطہ دیہی زندگی سے بھی پڑتا ہے اور شہری زندگی سے بھی۔شہری زندگی میں بھی عام اور خاص زندگیوں کا امتیاز واختصاص دکھائی دیتا ہے۔یہاں پوش کالونیاں بھی ہیں اور لوانکم گروپ (L.I.G)والی سرکاری کالونیاں بھی ۔ یہاں تک کہ ''جلیبی کارس'' میں اپارٹمنٹ کی کہانی پیش کی گئی ۔یعنی ان افسانوں میں دیہات سے شہر تک مختلف فرقوں اور طبقوں کی کہانیاں پیش کی گئی ہیں،زمانی اعتبار سے تقسیم ہند کے بعد کی صورت حال کا فنکارانہ ،تجزیہ ''ناگہانی'' میں دکھائی دیتا ہے ،وہیں بالکل موجودہ دور کے حقائق و واقعات ۔یعنی ان افسانوں میں دیہات سے شہر تک مختلف فرقوں اور طبقوں کی کہانیاں پیش کی گئی ہیں،زمانی اعتبار سے تقسیم ہند کے بعد کی صورت حال کا فنکارانہ ،تجزیہ ''ناگہانی'' میں دکھائی دیتا ہے ،وہیں بالکل موجودہ دور کے حقائق و واقعات کو بھی ''نیو کی اینٹ'' میں افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے ۔اس طرح موضوعات ومسائل میں بھی تنوع واضح ہے اوران کی پیش کش میں بھی رنگارنگی اور بوقلمونی دکھائی دیتی ہے. ان تمام افسانوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ سارے افسانے مشترکہ معاشرتی زندگی اور سماجی حقائق کے نشیب وفراز سے وابستہ ہیں۔

حسین الحق بظاہر کسی معمولی واقعہ کو بھی اپنی غیر معمولی فنی صلاحیت سے نہ صرف قابل توجہ بلکہ سنسنی خیز اور بصیرت افروز بنادیتے ہیں جیسا کہ ''مردہ راڈار'' میں۔پوش کالونی میں آبی جماؤ کی وجہ سے پیدا ہوجانے والی ''دلدل'' میں پھنس کر ایک کتے کے پلے کی موت ہوجاتی ہے یا اس سے قبل اسی دلدل میں پھنس کر کراہنے اور چلانے والی بکری اوراس پر جھپٹتے ہوئے کتوں کا منظر جس فنی چابکدستی سے ترتیب دیا گیا ہے ،وہ توجہ طلب بھی ہے اور سنسنی خیز وبصیرت افروز بھی ،رمزیت ،اشاریت اور ایمائیت حاشیۂ تاویل کو وسعت عطا کرتی ہوئی نظر آتی ہے یعنی قاری اگر تفکر اور تامل سے کام لے تو اس کے سامنے کئی سوالات ابھر آتے ہیں سیدھا اور سامنے کا سوال تو یہی ہے کہ کہاں پوش کالونی اوراس کے پارک نما میدان

میں آبی جماؤ اور کوڑا کرکٹ اور غلاظت کا انبار،رات کا تیرہ وتار ماحول بجلی گل اورا کثر کسی آدمی یا جانور کا اس دلدل میں پھنس جانا اوراس کی دل خراش چیخ وپکار!

''جلیبی کارس'' ہرچند کہ ایک اپارٹمنٹ کی کہانی ہے لیکن یہ بھی پوش کالونی کی طرح ہی پوش سوسائٹی کا منظر پیش کرتی ہے لیکن اپنی روح یا نفس مضمون کے اعتبار سے تمام تر سیاسی موضوع ہے۔اوراس میں بنیادی طور پر سیاست کے گھناؤنے پن کو پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ سیاست اوراس کا گھناؤ پن اب کہاں دیکھنے کو نہیں ملتے ۔اس سے تو مذہبی ،تہذیبی وادبی اور تعلیمی ادارے بھی پاک نہیں ۔دیر وحرم وقبرستان وشمسان تک اور مدرسہ سے خانقاہ تک سیاسی غلاظت کا انبار نظر آتا ہے ۔لیکن اس کہانی کا مرکزی کردار تو خاص طور سے اپارٹمنٹ کواور ایسے اپارٹمنٹ کو ترجیح دیتا ہے،جس میں حکومت کے اعلیٰ افسران اور حکام رہتے ہیں ۔ان سے قربت وموانست اوران کے وسیلے سے اعلیٰ سرکاری منصب کے حصول کا امکان روشن نظر آتا ہے۔روشن بہاری کی ساری تگ ودواسی نہج پر کارفرما دکھائی دیتی ہے۔وہ اپنا کام نکالنے کے لئے اپنی بیوی تک کوارباب اقتدار واختیار سے روشناس کراتا رہتا ہے، ایسے بااختیار لوگوں میں ملکھ منتری کی ناک کا بال ششی بھوشن بھی ہے۔روشن بہاری کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے کمرے میں اس کی بیوی ششی بھوشن کے ساتھ شب بسری میں مصروف ہے تو اس کا پارہ چڑھ جاتا ہے ۔اورایسا لگتا ہے کہ وہ اسے شوٹ کردے گا۔کسی غیر مرد کے ساتھ شب بسری کے سارے آثار وعلائم واضح ہیں جنہیں دیکھ کر وہ تلملا اٹھتا ہے لیکن اسی موقع پر ششی بھوشن اس کا استقبال کرتا ہے اوراسے صرف خوش خبری ہی نہیں سناتا بلکہ پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر کے پد کا پروانہ تھما دیتا ہے۔اس کے ساتھ ہی روشن بہاری کی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے اوروہ اظہار تشکر کے طور پر ششی بھوشن کے پاؤں پر گر جاتا ہے ۔اس طرح اس کی ایک دیرینہ آرزو تو پوری ہو جاتی ہے لیکن اس تمنا کی بساط پر روشن بہاری جو کچھ ہار جاتا ہے،اسے وہ دوبارہ جیت نہیں سکتا۔

''زندگی،اے زندگی'' میں ایک لکچرار کی شادی شدہ زندگی کے مسائل پیش کئے گئے ہیں۔لکچرار کی تنخواہ مصارف زندگی کے لئے کافی ہے لیکن اسٹرائک اوروقت پر تنخواہ کا نہ ملنا امید سے ٹھہری ہوئی بیوی کے علاج معالجہ اور بالآخر سیزیرین ڈلیوری کے مسائل اوراخراجات مجموعی صورت حال کو اندوہناک بنادیتے ہیں ۔اضافی آمدنی کے لئے لکچرار کا ٹیوشن کرنا اوراس کے باوجود غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر مصوری کے فن کو پیشے کے طور پر برتنا اوراس میں لکچراری کے منصب سے زیادہ دلچسپی لینا ایسے واقعات وواردات ہیں جو موجودہ دور کے اعلیٰ تعلیم کے خستہ حال نظام اور لکچراری کے پیشے کی غیر یقینی صورتِ حال کا وہ منظر نامہ پیش کرتے ہیں جواپنی واقعیت کے لحاظ سے افسانے سے زیادہ حقیقت کا اظہار قرار دئے جاسکتے ہیں۔

ان چند افسانوں کے حوالے سے حسین الحق کے افسانوں کے موضوعات ومسائل کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے ۔ایک طرف ارتقا پذیر سماج اور دوسری طرف اقداری نظام کی خستہ حالی ان افسانوں میں جن متضاد کیفیات سے دوچار کرتی ہے اور ہم جن ذہنی نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں ،بطور مجموعی یہ تاثر حسین الحق کے امتیاز واختصاص کا زائیدہ اور پروردہ ہے۔لیکن حسین الحق کے امتیازات واختصاصات کو روشن کرنے والے اور بھی کئی تشکیلی اور تخلیقی عناصر ہیں ،جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا البتہ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ان عناصر وعوامل کی نشاندہی بالتفصیل کی جاسکے ۔لیکن ''نیو کی اینٹ'' اور ''ناگہانی'' دو ایسے افسانے ہیں جو موضوعات ومضامین اور مسائل کے لحاظ سے بالکل نئے یا اچھوتے نہیں ہیں اس کے باوجود انہیں اردو کے اہم افسانوں میں اس لئے شمار کیا جاسکتا ہے کہ ان کا ٹریٹمنٹ بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ''نیو کی اینٹ'' چھ دسمبر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ۔یہ اپنی نوعیت اورفنی برتاؤ کے لحاظ سے منفرد قسم کا افسانہ ہے۔سلامت اللہ اور شیو پوجن اس افسانے کے دو مرکزی اور اہم کردار ہیں ۔ یہ دونوں ایک ہی دفتر میں سرکاری ملازم ہیں اور لوانکم گروپ (L.I.G.) کالونی میں ایک دوسرے کے آس پاس ہی رہتے ہیں ۔شیو پوجن کے اجودھیا جانے کی خبر سلامت اللہ کو نہیں۔لیکن جب شیو پوجن اجودھیا سے واپس آتا ہے تو اپنے ساتھ نیو کی اینٹ بھی لاتا ہے ۔جس کے درشن کے لئے شردھالوؤں اور درشن ابھلاشیوں کی بھیڑ لگنی شروع ہوتی ہے۔''جے شری رام'' کے نعرے کے ساتھ ساتھ کاشی متھرا پر دعوے کی آواز بھی گونجتی رہتی ہے،جس وجہ سے ماحول دہشت زدہ ہوجاتا ہے۔سلامت اللہ بھی اس صورت حال سے ذہنی اورنفسیاتی طور پر متاثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اپنی فیملی کو کہیں اور کسی محفوظ مقام پر شفٹ کردینا چاہتا ہے ۔لیکن حالات ایسی کروٹ لیتے ہیں کہ شیو پوجن خود اپنی فیملی کے ساتھ کہیں اورشفٹ ہوجانے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے دراصل نقص امن کے اندیشے کی وجہ سے پولیس حکام چھاپہ ماری کا پروگرام بناتے ہیں اوراس کی اطلاع قبل ازوقت شیو پوجن کو ہوجاتی ہے۔اب اس کے سامنے مسئلہ یہ کھڑا ہوتا ہے کہ اس نیو کی اینٹ کا کیا کرے،جس کے لئے چھاپہ ماری ہونے والی ہے؟ ایسے موقع پر اس اینٹ کو رکھنے کے لئے شیو پوجن کو سلامت اللہ کا کوارٹر محفوظ مقام (Safe Zone) معلوم ہوتا ہے اور بالآخر شیو پوجن سلامت اللہ کو بلاکر نیو کی اینٹ اس کے حوالے کردیتا ہے اور سلامت اللہ کو لامحالہ اس اینٹ کو قبول کرنا پڑتا ہے ۔شیو پوجن صاف صاف بتادیتا ہے کہ رمیش جی اور ہزاری پرساد اگروال نے اسے اپنے پاس رکھنے سے انکار کردیا ہے کیوں کہ میرے بعد ان لوگوں کے گھروں کی بھی تلاشی ہوسکتی ہے۔

''ایسے میں لے دے کر آپ ہی بچ جاتے ہیں، جہاں تلاشی کا چانس نہیں۔ کر پا کر کے اس کو آپ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔'' اسی تسلسل میں شیو پوجن کا یہ آخری جملہ بھی معنی خیز ہے: ''یہ تو آپ کے لئے بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے۔''

بہر حال سلامت اللہ جب اس اینٹ کو لے کر گھر آتا ہے تو اس کی بیوی بلبلا اٹھتی ہے اور شیرنی کی طرح جھپٹ پڑتی ہے۔ کالج میں پڑھنے والا بیٹا بھی مخالفت پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے، تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر زمانے میں ہر آدمی کے لئے مسئلہ بن جاتی ہے، حد یہ ہے کہ اب شیو پوجن چاچا کے لئے بھی مسئلہ بن گئی، اسے اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔''

یہ واقعاتی تشکیل اور پورا منظر نامہ نہ صرف یہ کہ نہایت ہی حساس اور سنسنی خیز صورت حال کا پتہ دیتا ہے بلکہ سنجیدہ غور و فکر کے لئے تحریک بھی دیتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مشترکہ تہذیب اور قومی وراثت کی بنیادتو آستھا اور عقیدہ کے ٹکراؤ کے نتیجے میں کھد گئی ہے اور اس کی دھجیاں (اینٹیں) بکھر چکی ہیں۔ بنیاد کھوکھلی ہو چکی ہے۔ مشترکہ قومی تہذیب اور مشترکہ قومی وراثت ایک مسئلہ بن چکی ہے جس کو سلامت اللہ کے بیٹے کے روپ میں نئی نسل شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ یہ مسئلہ کسی مسلمان ہی کے لئے پریشان کن نہیں ہے، اس مسئلے سے ایک ہندو بھی اتنا ہی پریشان ہے جتنا ایک مسلمان گویا کہ اس مسئلے نے ہندوستان کی پوری مشترکہ قومیت کو ہی بے چینی، پریشانی اور انتشار میں مبتلا کر دیا ہے لیکن اس کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ اس سوال کا جواب بھی کسی دھند میں کھویا ہوا نہیں۔ اس بات کو تو سلامت اللہ کی بیوی بھی اچھی طرح سمجھتی ہے جو ایک گھریلو اور سیدھی سادی عورت ہے اور جو بالکل مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔

''دیکھو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔'' سلامت اللہ کو لگا کہ اب وہ اپنے گھر میں بھی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

''ارے جایئے جایئے'' بیوی غصہ میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''کسی اور کو جا کر سمجھایئے اور اس سے پہلے خود سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ دلی میں بیٹھے سور ماتو اس آگ سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے ہم لاچار لوگ کس گنتی میں ہیں۔''

یہ بات سلامت اللہ کے جی کو بھی لگ گئی۔ سچ مچ جب آگ لگی تو دلی میں بیٹھے سور ما بھی تو صرف دور دور ہی سے آگ آگ کا شور مچاتے رہے۔

''مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ جب وہ باہر آیا تو دیکھا کہ شیو پوجن کے گھر والے کہیں جا رہے ہیں۔''

یہ ٹھیک ہے کہ شیو پوجن بھی اس مسئلے سے دو چار ہوتا ہے اور اس کی ساری اسٹرٹیجی سلامت اللہ کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ مان لیتا ہے کہ ''بال بچوں والا آدمی ڈر کے بھاگے نہیں تو اور کیا کرے'' مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ مسئلہ نہایت سنجیدہ، حساس اور سنسنی خیز ہے جس نے حسین الحق کو اس افسانے کی تخلیق پر مجبور کیا ہے اور اسی نے اس افسانے میں تخلیقیت کی رَو بھی پیدا کی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ:

شیو پوجن تو گیا سے نکلتا ہے اور کاشی چلا جاتا ہے۔ اور چاہے گا تو کاشی سے ماما کے گھر متھرا چلا جائے گا لیکن سلامت اللہ کیا کرے جس کو شیو پوجن نے زبردستی نیو کی اینٹ سونپ دی ہے۔'' اس اختتامی عبارت نے بھرپور بلاغت کے ساتھ جس معنوی کیفیت کا اظہار کیا ہے، اسے کوئی بھی سنجیدہ، باشعور اور احساس انسان پرت در پرت محسوس کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع پر افسانے تو بہت سارے لکھے گئے ہیں لیکن حسین الحق نے جس تخلیقی زاویے سے اس پر نظر ڈالی ہے اور فنی نقطۂ نظر سے اسے برتا ہے، وہ بے مثال بھی ہے اور ایک لازوال فن کا کمال بھی۔

حسین الحق کے اس افسانوی مجموعے کی پہلی کہانی ''ناگہانی'' کا موضوع بھی ایسا ہی ہے جس پر بہت ساری کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس موضوع کی کہنگی اور فرسودگی کے باوجود حسین الحق نے اس میں بھی ندرت و جدت کے امتزاج سے اپنی فکری بالیدگی اور فنی پختگی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ تقسیم کے بعد اکثر و بیشتر زمیندار گھرانوں نے ہجرت کی اور ''ملک خداداد'' میں جا بسے۔ اگر جلال الدین فالج زدہ نہ ہوتے تو شاید انہوں نے بھی ملک خداداد کا رخ کیا ہوتا لیکن وہ صحت سے معذور تھے اور بستر پر گندگی اور غلاظت پھیلانے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی بیوی عزت النساء کی دوسری گھریلو ذمے داریوں کے علاوہ ایک اہم ذمے داری اپنے میاں کی پھیلائی ہوئی غلاظت کو بھی صاف کرنا تھا۔

صاحب فراش ہونے کی وجہ سے زمینداری اور جائیداد کی دیکھ بھال کرنے کے لائق جلال الدین رہ نہیں گئے تھے چنانچہ مختار عام لالہ بنسی دھر جو کچھ دے دیتے اسی پر اکتفا کرنا پڑتا۔ لیکن اب تو لالہ بنسی دھر کے روپے میں بھی تبدیلی آنے لگی تھی۔ جوہر روز ڈیوڑھی پر حاضری لگایا کرتے تھے، اب اکثر غائب رہنے لگے تھے۔ الامحالہ عزت النساء کو لالہ کے گھر کا رخ کرنا پڑا۔ اور:

''پہلی مرتبہ عزت النساء نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا برقعہ پہن کر باہری

پھاٹک پر پہنچیں تو اتفاق سے اسی وقت خاندانی کہار گھورن سامنے آ گیا۔

''مالکن کہیں جانا ہے کیا؟''

''لالہ بنسی دھر کے یہاں جانے کو سوچ رہی ہوں۔''

''آپ کاہے جائیں؟ ہم بلائے لاتے ہیں۔''

عزت النساء ہلکے سے ہنسیں۔''زمانہ بدل چکا گھورن، مجھے ہی جانا پڑے گا۔''

ٹھیک ہے مالکن۔ آپ ڈیوڑھی پر ہی رہیں۔ ہم ابھی ڈولی لے کر آئے۔''

''رہنے دو پیدل چلی جاؤں گی۔''

واقعی زمانہ بدل چکا تھا، لیکن ایسا ویسا نہیں بدلا تھا۔ اس نے تو تاریخ کا اسلوب اور تہذیب کا پیرایہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ حسین الحق نے اسی انقلاب زمانہ کو اپنے افسانہ''ناگہانی''میں موضوع بنایا ہے اور کردار کے تقابل اور واقعات کی ہمکاری کے وسیلے سے ایسی فنکاری دکھائی ہے کہ افسانہ اپنی تمام تر سنسنی خیزی کے ساتھ عبرت ناک انجام تک پہنچا ہے۔

جب عزت النساء لالہ بنسی دھر کے حویلی نما مکان پر پہنچیں تو:

''مکان کے اندرونی حصے میں بڑے چھوٹے سب نظر آئے۔ سوائے بنسی دھر کے...... وہیں پہلی بار نظر آئے۔ لالہ ہری ہر پرشاد! سرخی مائل گورا رنگ، تیکھا ناک نقشہ، متناسب قد و قامت، لالہ ہری ہر پرشاد کی خوبصورتی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی تھی۔ اچانک سرسری طور پر عزت النساء نے سوچا:''یہ بنسی دھر سے چھوٹا ہے، مجھ سے برس دو برس بڑا ہوگا۔''

جس وقت کا ذکر ہے اس وقت عزت النساء ۳۲ برس کی نہیں ہوئی تھیں۔''اس موقع پر ہریہر پرشاد کس کیفیت میں مبتلا ہوئے، پتہ نہیں لیکن اب انہوں نے عزت النساء بی بی کے گھر آنا اور تحفے تحائف لانا شروع کر دئے۔ بظاہر ہمدردی اور غم گساری کے جذبے سے ہی یہ سلسلہ شروع ہوا لیکن یہ سلسلہ شروع ہوا تو دراز ہوتا چلا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لالہ نے کہہ ہی دیا:

''میں آپ کو......سورج کی روشنی میں...... ایک مرتبہ ......جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اور پھر اس سلسلے کے طول وعرض سے گزر کر واقعے کا وہ موڑ آتا ہے جب:

''اچانک لالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ان کا منھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں

ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

''بی بی! میں مر جاؤں گا...... مجھے تھوڑی سی سانس...... تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔''لالہ کی آواز کی گھٹنی میں آنسو کا احساس بہت طاقتور تھا۔ عزت النساء کو محسوس ہوا کہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا یہ آدمی لالہ ہریہر پرشاد نہیں ہے...... یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔ عزت النساء کا جی چاہا...... پہلی مرتبہ جی چاہا کہ......'' وہ بالکل بے خود ہو کر لالہ کے ماتھے کی طرف جھکیں...... ان کے دونوں ہاتھ لالہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے بیتاب تھے...... وہ کانپتی تھرتھراتی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔''

کرداروں کے تقابل نے جس صورت حال کو ابھارا ہے اور جن کیفیات و جذبات کی عکاسی کی ہے، اس میں ہر تصویر اپنے تیکھے روشن اور دھندلے نقوش اور سارے منظر و پس منظر کے ساتھ بالکل عیاں اور واضح ہے۔ کرداروں کی کیفیت اور ان کے جذبات کی شدت کا مزید احساس درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

''گھٹنوں کے بل بیٹھے لالہ کی آنکھیں اس انداز میں بی بی عزت النساء کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے بی بی کا چہرہ نہ ہو بادل کا وہ ٹکڑا ہو جسے برسات کو ترستا کسان حسرت سے تکتا ہے۔''

آخری جملے میں تشبیہ کی ندرت نے وقت و حالات کی نزاکت اور جذباتی کیفیات کی شدت کو پوری توانائی کے ساتھ ابھار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قاری کی متجسسانہ تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

''بی بی کا لالہ کی طرف جھکتا چہرہ اور لالہ کی پیاسی آنکھیں...... یہ منظر جھما جھم برستے اندھیرے نے دیکھا، ڈیوڑھی کی چاروں طرفوں نے دیکھا، آسمان کے اس ٹکڑے نے دیکھا جس کا ناموجود شامیانہ دونوں پر تنا ہوا تھا۔ مگر پھر منظر بدل گیا...... بی بی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتے جھکتے اچانک رک گئیں...... پھر بڑی مشکل سے......لالہ کی طرف جھکتی ہوئی عزت النساء...... آہستہ آہستہ کھڑی ہوئیں اور رندھی آواز میں بولیں۔''لالہ میرا جینا مشکل مت کیجئے...... میرے سر پر بڑا بوجھ ہے۔''

اس طویل اقتباس میں فنکاری کے وہ سارے اسرار و رموز مضمر ہیں جو حسین الحق کو اپنے معاصرین سے ممتاز و منفرد شناخت عطا کرتے ہیں۔

افسانہ یہیں ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی حسین الحق کی فنکاری یہاں منتہائے کمال کو پہنچتی ہے۔ حالات انگڑائی لیتے ہیں، واقعات کروٹ بدلتے ہیں، مناظر تبدیل ہوتے ہیں۔ حسرت و یاس اور تحیر و تجسس کی کیفیات سر ابھارتی رہتی ہیں۔ وقت کا بہتا دریا کبھی کبھی سُست اور کبھی تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ احساس اور جذبے کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے بھی قاری کا ذہن صورت حال کی جزئیات و تفصیلات اور واقعات و واردات کے مضمرات و ممکنات سے کسی لمحہ غافل نہیں ہوتا۔ ایک طلسماتی کیفیت کا اسیر قاری اس دوران اپنے خارجی ماحول اور گرد و پیش کے احوال و آثار سے بے خبر ہو جاتا ہے یعنی افسانہ ہر لمحہ قاری کے دل و دماغ کو اپنی مضبوط گرفت میں لئے رہتا ہے، ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتا، یہ بھی اس افسانے کی ایک بڑی خوبی اور اس کی کامیابی کی مضبوط دلیل ہے۔

میرے خیال میں افسانوں کا یہ مجموعہ تاثر سے بھرا پرا ایک مکمل غزل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ''ناگہانی''، مطلع تو''نیو کی اینٹ''مقطع کا تاثر دیتی ہے۔ درمیان کے افسانے اشعار غزل کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں ہر ایک کی اپنی گہری معنویت اور گہرا تاثر موجود ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے کا مجموعی تاثر مسرت سے زیادہ بصیرت کا حامل ہے۔

«●»

67/B,P.C.Colony
Kankarbagh
Patna-800020
9431840245

● ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

حسین الحق بحیثیت افسانہ نگار

معروف افسانہ نگار شفیع جاوید نے ایک بار اپنے افسانوں کے حوالے سے مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ دوستوں کے افسانے دشمن کی نگاہ سے پڑھا کرو۔ میں نے ان کے افسانے تو خیر کبھی اس انداز سے نہیں پڑھے کہ وہ بزرگوں میں ہیں لیکن حسین الحق میرے دوست ٹھہرے اس لئے ان کے افسانوں کا مجموعہ''نیو کی اینٹ''پڑھتے ہوئے میں نے شفیع جاوید صاحب کا یہ مشورہ سامنے رکھا۔ سب سے پہلا افسانہ''ناگہانی'' پڑھا تو اس کے مرکزی کردار کی طرح خود بھی بہت دیر تک بے نام جذبوں کے حصار میں گھرا رہا۔ پھر دوسرا، چوتھا، پانچواں، یہاں تک آخری افسانہ بھی پڑھ ڈالا اور بالآخر اس نتیجے تک پہنچا کہ شاید حسین الحق کی دکھتی رگ ہے ہی نہیں جس پر میں انگلی رکھ سکوں۔ یہ کہنا خاصا مشکل ہے کہ اس مجموعے میں برا افسانے کون سا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض افسانے اچھے ہیں اور بعض بہت اچھے ہیں۔

ان افسانوں کی سب سے پہلی خوبی میرے خیال میں یہ ہے کہ ان کی زبان بہت عمدہ اور دلکش ہے جو اپنی تراش خراش اور Crafted Ornamentation کے باوجود رواں دواں اور فطری محسوس ہوتی ہے۔ پہلی ہی کہانی سے ایک مثال پیش کرنے کا دل چاہتا ہے۔ برسوں سے شوہر کی مستقل بیماری اور افلاس کے لاعلاج روگ کے سبب زندگی کی سخت دھوپ میں چلتی ہوئی بی بی عزت النساء کو ہریہر پرشاد ایک شجر سایہ دار کی صورت میں ملتے ہیں تو وہ عجیب و غریب احساسات سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان کیفیات کا بیان افسانہ نگار کی زبان سے سنئے:

''اس رات عزت النساء پر رنگوں نے یلغار کی۔ نیلا، پیلا، لال، کاسنی، گلابی فیروزی، چمپئی، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی......رنگوں کی بھرمار تھی اور موسم سرد دھند میں ڈوبا ہوا، پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا۔ طوطا، مینا، بلبل، شیاما، کوئل، فاختہ، لعل، گوریا، ٹٹہری، مور، باز، ساری رات وہ کسی پرشور دریا میں اُب چُبھ کرتی رہیں، ساری رات تھپیڑے انہیں ایک تنکے کی طرح سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ بنائے رہے۔ ساری رات کوئی تھا جو انہیں دریا سے صحرا اور صحرا سے دریا کے درمیان گڑیے کی طرح اچھالتا رہا۔''

''پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النساء کے میکے کی طرف مڑا اور یوں مڑا کہ

خودانہیں اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستان سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں۔ وہ مائکے کے کمروں، دالان اور آنگنوں میں چوکڑیاں بھرتی رہیں بالا ریز سے گلی میں مداری کا تماشہ دیکھتی رہیں، باپ کی شفقت، ماں کی ممتا، بہنیں، بھابھیاں سکھی سہیلیاں، محبت کرنے والے بھائی اور ہلکی ٹھنڈی پھوار کی طرح انگ انگ میں اترتا اور سارے آپے سراپے کوشانت کرتا سمئے۔''

جذبوں کی فطری ترجمانی کی ایک خوبصورت مثال دیکھئے:

''رنگوں کی بھی شاید اپنی زبان ہوتی ہے اور ہر رنگ شاید کچھ نہ کچھ کہتا ہے......مگر وہاں شبیرہ بھی تھی...... ہرے رنگ کے ساٹن کا خوشنما بیل بوٹے والا گھیر دار فراک پہنے۔''

مجموعہ ''نیو کی اینٹ'' کے دوسرے افسانوں کی جو خصوصیت بیک نظر محسوس کی جاسکتی ہے وہ موضوعات کا تنوع ہے۔ مشاہدے کی نیرنگی اپنے آپ میں کوئی لازمی وصف نہیں جب تک وہ فنکار کے ذاتی محسوسات کا حصہ نہ بنے لیکن جب ہر افسانہ ایک نئی دنیا سے قاری کا تعارف کرائے اور یہ دنیائیں صدیوں پر نہ سہی، دہائیوں پر یقیناً محیط ہوں تو پھر افسانہ نگار کی انفرادیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ غور کیجئے تو اس افسانوی مجموعے میں شریک اشاعت کم از کم نصف افسانے ایسے ہیں جو افسانہ نگار کے دردمند اور حساس دل کے ساتھ ساتھ اس کے وسیع مشاہدے کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ عزت النساء ہوں یا مولانا سبحان اللہ، پیاسی چڑیا کی طرح زندگی گزارنے والی سیلے کی بھابھی ہوں یا کب ٹھہرے گا درد اے دل، کی شباہت، سب کسی نہ کسی دنیا کے نمائندہ کردار ہیں اور یہ دنیا جانی پہچانی ہونے کے باوجود ہمیں ان دیکھی لگتی ہے تو صرف اس لئے کہ افسانہ نگار اسے ایک نئے زاویے سے پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کے وسیع مشاہدے کی کارفرمائی سے بعض افسانوں میں یہ صورت بھی پیدا ہوئی ہے کہ افسانے کسی ایک جگہ Fix نہیں ہوتے۔ ان میں ایک مرکزی موضوع تو ہوتا ہے اور اس کے اعتبار سے نقطۂ عروج پر ایک تاثر بھی ابھرتا ہے مگر بعض دوسرے پہلو جن کا موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا وہ بھی کسی نہ کسی طور قاری کے سامنے سوالیہ نشان کی صورت میں آتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ خیالات کی ایک رو ہے جو افسانہ نگار کو اپنے ساتھ بہا کر لئے جارہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عراق پر امریکی حملہ ہو کہ اپنے ملک میں ہونے والے فرضی پولیس انکاؤنٹرز، ایودھیا کا سانحہ ہو یا درس گاہوں میں طلباء کی سیاست اور بے راہ روی، مذہبی رہنماؤں کی ریاکاری اور کم علمی ہو یا سیاست دانوں کی موقع پرستی اور بے ضمیری، صارفیت کا بڑھتا ہوا رجحان ہو یا روز افزوں مہنگائی، سب کا بیان کسی نہ کسی افسانے

میں موجود ہے اور ساتھ ہی افسانہ نگار کا ردعمل بھی۔

اس مجموعے کے چند اور افسانے اپنے ناسٹلجیائی طرز فکر کے سبب ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ انہیں پوری طرح ناسٹلجیا کی پیداوار تو نہیں کہا جاسکتا مگر ''یادوں کا نگارخانہ'' ضرور سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان افسانوں کے راوی نے پہلی سطح پر یہ نگارخانہ صرف اس لیے ترتیب دیا ہے کہ اسے دیکھ کر ایک نوع کی طمانیت اور مسرت حاصل کرسکے مگر دوسری سطح پر وہ اپنے قاری کو بھی ان احساسات میں شریک کرلینا چاہتا ہے۔ ان افسانوں کا طرز فکر یہ احساس دلاتا ہے کہ ''گمشدہ کی بازیافت'' یا ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' بھی حسین الحق کا ایک اہم موضوع ہے اور اس سلسلے میں وہ صرف ''آشوب'' یا ''غم زدہ'' جیسی کہانیوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ قدرے آگے بڑھ کر ''مور پاؤں'' جیسے افسانوں میں اس مشترکہ کلچر کی تلاش میں سرگرداں اور اس کے نہ ملنے سے ہراساں دکھائی دیتے ہیں جو ہماری صدیوں کی وراثت کا حصہ تھا۔ اس طرح ہمارے ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال بھی اپنے نئے Dimensions کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر میں کچھ اور بھی جذبوں کے روبہ رو ہوا جنہیں لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے مگر دوران مطالعہ آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

''نیو کی اینٹ'' کے افسانوں میں ماضی کی یادیں بھی ہیں اور روح عصر بھی، جذبوں کا سمندر بھی ہے اور دانشوری کا ساحل بھی، اضطراب بھی ہے اور سکون بھی، آگہی کے مناظر بھی ہیں اور بے خبری کے جلوے بھی، اگر نہیں تو بس پروٹیسٹ کا وہ انداز جو بعض افسانوں کی دلکشی میں مزید اضافہ کرسکتا ہے۔ ''استعارہ'' کا مرکزی کردار پھر بھی ''ممدو بھائی'' کا گریباں پکڑ لیتا ہے مگر شباہت جیسے کردار کے رویے کو کیا نام دیا جائے؟ یہ سوال مجھے برابر پریشان کرتا رہا اور اب بھی ذہن کے کسی نہ کسی شے میں موجود ہے کہ آخر حسین الحق کے کردار احتجاج کے جذبے سے عاری کیوں ہیں؟ یہ انداز خود افسانہ نگار کے اس مزاج کا آئینہ ہے ''جو صلح کل'' سے عبارت ہے یا پھر حالات کے جبر کا اشارہ ہے؟؟ اس کے باجود اس افسانوی مجموعے کا آخری افسانہ ختم کرتے ہوئے میں نے بس یہی سوچا کہ جب دشمن کی نظر سے پڑھنے کے باوجود ان افسانوں میں مجھے اتنی ساری خوبیاں نظر آگئیں تو دوستوں کی نگاہ کہاں ٹھہرے گی۔

◄◄ ● ►►

Nafees Colony
Near Shareef Colony
Patna-800005
9334107757

● **مشتاق احمد نوری**

حسین الحق کی افسانہ نگاری......ایک جائزہ

۱۹۷۰ء میں جب اردو فکشن ایک نئی راہ پر گامزن تھا اس زمانہ میں سب سے بڑا قافلہ بہار کے فکشن نگاروں کا ہی تھا۔ جس میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اس زمانے میں بھی سرداری حاصل تھی۔ اور آج تک وہ اپنی سرداری بچانے میں کامیاب رہے ہیں ان میں ایک اہم نام حسین الحق کا بھی ہے ان کے ساتھ شوکت حیات، شفق، عبدالصمد، علی امام، غضنفر، پیغام آفاقی، مشتاق احمد نوری، اقبال حسن آزاد اور بہار سے باہر سلام بن رازق انور خاں، سید محمد اشرف طارق چھتاری ساجد رشید اور ایک طویل وقفے کی خاموشی کے بعد شموئل احمد بھی، ان سب نے اپنے فکشن سے اردو دنیا کو مالا مال کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ۱۹۸۰ء میں بھی بہت سے فنکاروں نے اپنی پہچان بنائی۔ اس کے بعد سید احمد قادری اور قاسم خورشید نے بھی اپنے افسانوں سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ ناموں کی فہرست ادھوری ہے کیونکہ اس زمانہ کے فکشن نگاروں کے بجائے میں آج حسین الحق کی کہانیوں پر گفتگو کرنا چاہ رہا ہوں۔

۱۹۷۰ء میں جو کہانیاں سامنے آرہی تھیں وہ جدیدیت کی علمبردار تھیں اور یہ جدیدیت کا وہ دور تھا کہ ہر آدمی جدید بننے کے لئے اپنا سب کچھ تیاگ دینے پر آمادہ تھا اور کبھی کبھی ایسی کہانی بھی عالم وجود میں آجاتی تھی جو خود مدیروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور وہ اسے بڑے اہتمام سے اس لئے شائع کرتے تھے تاکہ ان پر ناسمجھ ہونے کا الزام نہ لگایا جائے۔ جس طرح کوئی فیشن بہت دیرپا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ فیشن بھی بہت دیرپا ثابت نہیں ہوا اور دھیرے دھیرے کہانی اپنے اوریجنل فارم میں لوٹ آگئی۔

حسین الحق بھی نہ سمجھ میں آنے والے جدید فنکار تھے لیکن ان کے یہاں ایک ایسا رکھ رکھاؤ تھا جو انہیں اوروں سے ممتاز بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ حسین الحق کے یہاں خانقاہی آداب اور مذہبی وراثت کے ساتھ الفاظ کی خوبصورت نشست و برخواست ایک ساتھ دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ ان کے سات افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہوچکے ہیں اور دو ناول بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہیں۔ ''بولو مت چپ رہو'' اور ''فرات'' کے بعد ان کا کوئی ناول سامنے نہیں آیا لیکن ''فرات'' کی دھمک اب تک محسوس کی جارہی ہے۔

ان کا ساتواں مجموعہ ''نیو کی اینٹ'' میرے سامنے ہے جس میں بیس کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ہر ایک کہانی کا الگ الگ پس منظر ہے لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جس میں خاص طور پر عورتوں کے اس

درد کو محسوس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے وہ اپنے وجود کی تاریکی اور تنہائی میں گھونٹ، گھونٹ پینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس مجموعہ کی پہلی کہانی ''ناگہانی'' ہے جس میں بی بی عزت النساء کی شادی ایک اڑیل زمیندار جلال الدین سے ہوجاتی ہے اور بقول حسین الحق جلال الدین کے اندر کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی بستر پر بھی عزت النساء کے ساتھ صحبت بالجبر ہی کرتا ہے صرف اس ایک جملہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عزت النساء کی زندگی کس طور پر گذر رہی ہوگی۔ جلال الدین کا سارا کاروبار ان کا خاندانی منشی بنسی دھر پرشاد سنبھالتے تھے۔ اور ان کا یہ حال تھا کہ ڈیوڑھی پر جب آتے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہے وہ احترام یا خوف سے ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اتار دیتے اور دھوتی کھول کر لنگی بنا لیتے اور ان کی یہ مجال نہ ہوتی کہ وہ اپنی آمد کی اطلاع اندر بھجوا سکیں۔ وہ تب تک بیٹھے رہتے جب تک انہیں جانے کی اجازت نہیں مل جاتی۔ لیکن جلال الدین پر جب فالج کا حملہ ہوا، اور منشی بنسی دھر پرشاد چپکے سے کھسک لئے تو عزت النساء کی زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی جسے چاٹ کر نہ تو وہ صاف کرسکتا ہے اور نہ ہی زخم سے مکھی اڑا سکتا ہے وہ ایسا زخم ہوتا ہے جس پر ہر گھڑی دشمن کتے کی نگاہ جمی رہتی ہے۔

جلال الدین کے جسم پر ہی فالج کا اثر نہیں ہوا بلکہ اس کی زبان پر بھی فالج نے اپنا اثر دکھایا۔ جب ڈاکٹروں نے بنسی دھر کو اس بات کی اطلاع دی کہ یہ فالج موت کے ساتھ ہی ختم ہوگا تو منشی جی جن کی حیثیت اس گھر کے مختار عام کی تھی اس نے چین کی سانس لی۔ کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اب نہ تو چپل کھولنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی دھوتی کو لنگی بنانے کی۔ اب منشی کی دلچسپی حویلی سے کم ہوتی گئی اور اس کا آنا بھی نہیں کے برابر ہوگیا۔ عزت النساء کو شوہر کے زمانے میں بھی کبھی محبت کی چاشنی نصیب نہ ہوئی بلکہ ان کا استعمال مال غنیمت کی طرح ہوتا رہا۔ مگر اب تو ان کے لئے اپنے وجود کو قائم رکھنے کا مسئلہ کھڑا ہوگیا تھا۔ دنیا کی ضرورتیں اپنی جگہ لیکن جسمانی ضرورت کنڈلی مارے ناگ کی طرح اندر اندر بیٹھی تھی اور جب نہ تب انہیں ڈستی رہتی تھی۔ ان کی خانہ داری کی ضرورت ہو یا کاروبار کا حساب زمین جائداد کے اندراج ہوں یا باغ باغیچے کی فکر ان سب نے انہیں بری طرح جکڑ لیا اور انہیں مجبوراً منشی بنسی دھر پرشاد کے گھر کا رخ کرنا پڑا جہاں جاکر انہیں محسوس ہوا کہ منشی کی حویلی اس کی اپنی حویلی سے کافی بڑی ہے۔ لیکن اس بڑی حویلی میں منشی بنسی دھر پرشاد کا وجود نظر نہیں آیا کیونکہ وہ جلال الدین کو اچھی طرح لوٹ کر شہر میں جاکر بس گئے تھے تاکہ کوئی ان سے پوچھ گچھ بھی نہ سکے اور وہیں بنسی دھر کے چھوٹے بھائی لالہ ہریہر پرشاد پہلی بار نظر آئے۔ جس کے تیکھے ناک نقشہ سرخی مائل گورا رنگ اور متناسب قد و قامت نے عزت النساء کو اس بات کا احساس دلایا کہ وہ ان سے دو برس ہی بڑا رہا ہوگا اور نہ جانے کیوں اسی وقت ان کے اندر کنڈلی مارے ناگ نے سر اٹھا کر اپنے وجود کا

احساس دلایااوراسے دیکھ کرانہیں رشتے کاوہ بھائی یادآ گیا جوان کے لئے بولایاپھرتا تھااورآج بھی جب نہ تب اس کاوجودان کے سامنے آجاتا تھااورعزت النساء پررنگوں کی یلغار ہوجاتی تھی جس میں نیلا، پیلا، لال، کاسنی، گلابی، فیروزی، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرااورنہ جانے کتنے رنگ اس کے سامنے بکھر جاتے تھے۔اس قیامت خیز لمحے میں وہ لڑکا انہیں بار بار یاد آتا رہااوراس کی آوازسمندر کی آخری سطحوں سے آتی سنائی دیتی رہی۔''بی بی آپ کیسی ہیں آپ کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔'' دھیرے دھیرے لالہ ہریہر پرشاد کی آمد پروہ بولایا لڑکا یادآتا رہااورایک لمحہ وہ بھی آیا جب اس لڑکے کی جگہ منشی ہری ہر پرشاد گھٹنے کے بل منھ اوپراٹھائے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے یہ کہتے نظرآئے کہ بی بی میں مرجاؤں گا...... مجھے تھوڑی سی سانس...... تھوڑی سے ہوا کی ضرورت ہے۔'' لالہ کی آواز کی سمفنی کی طاقت کوعزت النساء نے محسوس کیااورانہیں لگا کہ گھٹنوں کے بل جھکا یہ آدمی لالہ ہری ہر پرشاد نہیں ہے۔یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جوگرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹارہی ہے۔

لالہ کی آمد تحفوں کے ساتھ جاری رہی' عزت النساء آئینے میں اپنے وجود کونہارتی رہیں' جلال الدین اپنی ہی غلاظت میں پڑے رہے اوروقت کا پرندہ دھیرے دھیرے بغیرآواز کے خاموشی کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں تیرتا رہا۔حالات نے عزت النساء کوایک ایسے چوراہے پرکھڑا کردیا تھا جس کی ایک جانب زمیندار کی مخدوش عمارت اوراس کا غلاظت بھرا وجود تھا۔دوسری طرف لالہ بنسی دھر پرشاد کا ایسا وجود جوجلال الدین کے ہرسیاہ سفید کا جانکارلیکن اندھیرے میں سائے کی طرح غائب، تیسری طرف عزت النساء کی زندگی، اس کا مکمل پیاسا وجود، اوراس کے اندرخواہشات کی کنڈلی مارے ناگ اور چوتھی طرف لالہ ہری ہر پرشاد کا بولایابولایاوجود جواپنے ساتھ ایک چھوٹا سا سائبان بھی رکھتا تھا۔لالہ کی خواہش بھی عجیب۔رات کے اندھیرے میں آتا اوردن کے اجالے میں عزت النساء کے مکمل وجودکوجی بھر کے دیکھنے کی خواہش کرتا۔ایک بارایسا بھی ہوا کہ لالہ بہت جلد بازی میں آئے اوربغیر کچھ بولے ایک خط عزت النساء کے حوالے کرباہر نکل گئے۔عزت النساء نے لالٹین کی لوتیز کی اورخط پڑھنے لگی۔لالہ ہری ہر پرشاد نے لکھا تھا۔میں خودکومجرم محسوس کرنے لگا ہوں آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں۔مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے وہ تاحیات کئے جاؤں گا۔اس خدمت کا اجرصرف آپ کی خوشی ہے...... مجھے بس تھوڑی سی سانس...... تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔لالہ ہری ہر پرشاد پیلی کوٹھی بائی پاس روڈپر پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان، موجودرہنے کاوقت ۱۱ربجے دن سے دو بجے دن تک، بدھ اوراتوار۔''

دوسرے دن اتوار تھا بی بی عزت النساء سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئی وہ لالہ کی لائی

ساڑی پہنی ہوئی تھیں۔کہانی دراصل اسی جگہ ختم ہوجانی چاہئے تھی۔لیکن حسین الحق جیسے منجھے ہوئے فنکار نے نہ جانے کیوں عزت النساء جیسے کردار کومشرف بہ اسلام کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے ساڑی بدل کرمیلاد میں جانا اورجھوم جھوم کررقت بھرے انداز میں نعت کا شعر پڑھتے دکھایا اورکہانی یہاں ختم کی اس سے اس کہانی میں جو Force تھاوہ کم ہوگیا۔

اس کہانی میں حسین الحق نے ایک عبرت ناک مثال پیش کی ہے۔زمینداروں کی ایسی مثال جوصرف اپنی بیوی بچوں پرہی صبرنہیں کرتے بلکہ انہیں کوئی فکرنہیں ہوتی صرف منشی بنسی دھر جیسے ریاکاروفادارمختار کے سہارے ان کا کاروبار چلتا ہے اورجلال الدین جیسے شخص کواس بات کی بھی مکمل جانکاری نہیں ہوتی کہ ان کی کتنی جائداد کہاں ہے؟ فالج زدہ وجود دھرتی کا بوجھ ہی ہوتا ہے اورمنشی جی کا اپنا گھر حویلی سے بھی بڑا ہے۔وہ سب سمیٹ کرنکل جاتا ہے اورصرف رہ جاتی ہے عزت النساء جس کے پاس صرف عزت کی دولت ہی رہ گئی ہے جسے منشی کا چھوٹا بھائی اپنے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی ترکیب بناتا ہے اورکامیاب بھی ہوتا ہے۔

اگرعزت النساء کے ساتھ جلال الدین کی وفاداری محبت خلوص اورایثار کی کچھ بھی مثال ہوتی توشاید اس کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی یادوں میں توصرف وہ باؤلا لڑکا تھا جواس کی پرستش کرتا تھا جس کی جگہ لالہ ہری ہر پرشاد لے لیتے ہیں اورعزت النساء اس کے سحر میں خودکوگم کرنے پرمجبور ہوجاتی ہے کیونکہ شایداسے اس بات کا علم ہے کہ مجبوری کے سمندر میں ضرورت کے مگر مچھ سے بیرنہیں رکھا جاسکتا۔

اس کہانی میں وہ بولایا لڑکا اہم رول ادا کرتا ہے عزت النساء زندگی بھراس کے خیال سے باہرنہیں نکل سکی۔شوہرکی بے اعتنائی نے اس لڑکے کی یادبھی مندمل نہ ہونے دی اور ہری ہر پرشاد نے اس بولائے لڑکے کی جگہ حاصل کرلی۔

ان کے مجموعہ کی دوسری کہانی ''مورپاؤں'' جوآج کے فرقہ پرست ماحول میں آدمی کے اندر کے چورکوباہرنکالنے کا کام انجام دیتی ہے۔کہانی کاراوی اجمیر میں اپنی بیٹی کے یہاں ہے جوآس پاس کے لوگوں سے گفتگوکرتا ہے جس میں زیادہ ترہندو ہیں۔جس میں بی۔جے۔پی۔کا کٹرفرقہ پرست ہندویہ بتاتا ہے کہ ہندوکا مطلب کیول سبھیتا ہے دھرم نہیں پورے بھارت ورش کی سبھیتا ایک ہے ہندومسلمان صرف بھارت کی سنتان ہیں اور بھارت ماتا کوبچانے کے لئے سبھیتا کی سمانتا انیوار یہ ہے۔اروند جی جب اپنی گفتگوختم کرتے ہیں توراوی الجھ جاتا ہے۔ان کی الجھن کانگریسی نیتا لکشمن ترویدی دورکرتے ہوئے جب اپنی بات بتاتے ہیں تواسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کانگریسی نیتا بھی وہی بول رہا ہے جواروند جی بول رہے تھے اور جب وہ لکشمن ترویدی جی کے یہاں جاکر یہ کہتا ہے کہ آپ تو کانگریس کے بہت Active ممبرہیں آپ کا یہ

Defination سیکولرزم سے میل نہیں کھاتا تواس کے جواب میں لکشمن جی بہت پراعتماد لہجے میں کہتے ہیں:

''میں کانگریسی ضرورہوں لیکن آپ نے مجھے سیکولرکیسے سمجھ لیا۔یہ غلط بات ہے، میں ہندوہوں۔''

یہ سن کرراوی کے اندرکافی اتھل پتھل ہونے لگتی ہے وہ اپنے خوابوں میں بھٹکتا ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ آج کا دوروہ نہیں ہے جواس کے خوابوں کا حصہ رہا ہے۔آج کی ننگی سچائی اسے کافی پریشان کرتی ہے۔اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے اوروہ وہی برسوں پرانی ڈگر پرکھڑا ہونقوں کی طرح سیکولرزم کے معنی پرغور کررہا ہے۔اس کی بیٹی کے بچوں کومور بہت پسند ہے اس کی بھی خواہش ہے کہ ایک مور پال لیاجائے کیونکہ اسے نیشنل برڈ کا درجہ بھی حاصل ہے مگراس کا داماد دھیمے لہجہ میں اسے مذہبی پرندہ بھی بتاتا ہے اس کا کھلا ذہن داماد کی بات سمجھ نہیں پاتا وہ اپنی بیٹی کوسمجھاتا ہے کہ جب تم نے اپنے آنگن میں تلسی کا پودالگایا ہوا ہے تو پھرایک مور پال لینے میں حرج ہی کیا ہے۔لیکن بیٹی اپنی الجھن اورخوف سے باہرنہیں نکل پاتی۔اس کے اندرایک سناٹا پسرا ہوا ہے جوکسی بھی وقت ایک طوفان کا روپ لے سکتا ہے وہ اپنی بیٹی کی الجھن سمجھ نہیں پاتا لیکن اس پریشانی سے وہ خودبھی پریشان ہونے لگتا ہے۔جب وہ مورپال لینے کی ضد پراڑارہتا ہے تو بیٹی بے بسی اورخوف سے کہتی ہے:

''ابومورپال تولوں لیکن اگروہ مرگیا تو؟''

یہ سوالیہ نشان پھیل کر بہت بڑا ہوجاتا ہے جس میں اس کے ساتھ بیٹی داماداوراس کے بچے سبھی نظرآنے لگتے ہیں اوراس کانگریسی نیتا کاوہ اقبالیہ بیان بھی سنائی دیتا ہے۔میں کانگریسی ضرورہوں لیکن ایک سیکولرہونے کی بجائے میں ایک ہندوہوں۔خوف کے سائے میں زندگی کس طرح گذرتی ہے اور پل پل مرنے پرآدمی کیسے مجبورہوتا ہے۔اپنے سائے سے بھی کس طرح خوف زدہ ہونا پڑتا ہے یہ سب کچھ اس کہانی میں نظرآتا ہے۔

حسین الحق کی کہانیوں میں فلش بیک کی عمدہ مثال دیکھنے کوملتی ہے کبھی کبھی وہ اس کا استعمال ترپ کے پتے کی طرح بھی کرتے ہیں۔خاص طورپران کی کھوئی ہوئی جنت بھی چپکے چپکے ان کی کہانیوں میں اپنے وجود کا احساس کرادیتی ہے۔یہاں بھی......ایک ایسا ہی کردار ہے جوان کے ناسٹلجیا کا حصہ ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اب اپنے دوسرے خواب کی تعبیربھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔مگرحیرت اس بات پرتھی کہ اس خواب میں ان کی رخشندہ شامل نہیں تھی۔تودراصل وہ صرف اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ درخشندہ وجود کے اندرہی رہ رہی ہے۔

''مورپاؤں'' ایک ایسی سچائی ہے جس میں سبھی کردار سچے ہیں جوان کے اندر ہے اسے بڑی بے باکی سے ظاہرکردیتے ہیں لیکن راوی بھی اپنے آپ کوانتہائی سچا سمجھتا ہے اور مور کی طرح اپنے پنکھ پھیلا کران کے درمیان ناچنے لگتا ہے۔لیکن جب ناچتے ناچتے اُس کی نظراپنے پاؤں پرپڑتی ہے تب اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج کے دور میں اس کا وجود مورپنکھ جیسانہیں ہے بلکہ مور پاؤں بن کررہ گیا ہے۔

حسین الحق کی ایک کہانی ''انحد'' ہے اس میں بھی عورت پرہورہے ایک ایسے نادیدہ (Unseen) ظلم کی داستان نظرآتی ہے جوعام طور پرمتوسط طبقہ کی عورتیں جھیلنے پرمجبور ہیں۔ساتھ ہی اس کہانی میں دیوراور بھابھی کے درمیان ایک نامحسوس طریقہ سے پنپ رہی عجب سی محبت کا احساس بھی ہوتا ہے جس کی لوکبھی مدھم کبھی تیزہوتی ہے سبطین رضا جو Graduation کا امتحان دینے کے بعد M.A. میں داخلہ لینے جارہا ہے وہ اپنے رشتہ کے بھائی مظفر کی دلہن کودیکھ کراس پروارے نیارے ہونے لگتا ہے اوراس کی بھابھی بھی اس کودیکھ کرکافی خوش ہوتی ہے اورامتحان کے بعد اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتی ہے۔جب وہ برسات کے زمانے میں کشتی پرسوارہوکراپنی بھابھی سے ملنے جاتا ہے تواس کے اندرکی خواہش جس طرح اتھل پتھل مچاتی ہے اسے بڑی خوبصورتی سے حسین نے ان جملوں میں بیان کیا ہے۔

''مجھے ایسالگا جیسے یہ کشتی لنگرتوڑکر بدمست ندی سے ملن کی موہ مایا میں لت پت ہورہی ہے یہ کشتی مجھے ایسا پاگل محسوس ہوئی جس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہوں اورپاگل پابہ زنجیرہونے کے باوجود ناچنے کی کوشش کررہا ہو۔''

وہ جب مظفر بھیاکے گھر میں داخل ہوتا ہے تواس کی پھوپھی جن کا منھ پان کی سرخی سے لال ہورہا تھاوہ اسے کڑک خاں کی طرح نظرآئیں۔اورجب اس نے ہکلاتے ہوئے اپنانام سبطین بتایا تو ''ارے سبطے ہوجی'' کہتی ہوئی اس کی بھابھی چھلانگیں مارتی ہوئی اس کی طرف دوڑی اوراس سے کہنے لگی کہ تم نے اپنے بھیاسے وعدہ کیا تھا کہ Result نکلتے ہی آؤں گا تمہارے بھیانے تمہارا کتنا انتظار کیا تو بھیا کی گردان اورپھوپھی کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے اسے بہت کچھ سمجھ میں آگیا اوراس نے یہ محسوس کیا کہ جس خوبصورت بھابھی کواس نے شادی کے بعددیکھا تھا۔وہ توآگ کا شعلہ کے بجائے چولھے کی بجھی ہوئی لوہوکررہ گئی ہیں۔جس میں تپش کی بجائے صرف دھواں رہ جاتا ہے۔لیکن یہ ایک ایسا دھواں تھا جسے ہلکی سی پھونک بھی چنگاری میں تبدیل کرسکتی تھی اورکچھ ایسے لمحے آئے بھی جہاں بھابھی دیورکے رشتے نے اپنے محدوددائرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن پرندے کی اڑان میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اپنے بازو دیرتک پھیلائے رکھ سکتا۔اس دوران اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی پھوپھی خط لکھ لکھ کراس کے بھائی کوآنے سے روکتی رہتی ہیں۔انتہا یہ ہے کہ اس

کی بھابھی نے اپنی انتہائی افسوسناک خواہش کا بھی اظہار کیا کہ سطے اسے زہر لا دے تا کہ وہ اپنی اس بے کیف اور جبر بھری زندگی سے نجات پا جائے ۔اس کہانی میں حسین نے خوبصورت الفاظ کے سہارے جذبات واحساسات کا ایک خاموش اور دلفریب رقص پیش کیا ہے جسے بیان کرنے کے بجائے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ یہ ایک گھر کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ہزار گھروں کی کہانی ہوسکتی ہے ۔اس کی طرف اشارہ اس کہانی کا عنوان ''انحد'' بھی کرتا ہے ۔اس کہانی کا شمار حسین کی خوبصورت کہانیوں میں ہونا چاہئے ۔ کب ٹھہرے گا درد اے دل بھی حسین کی ایسی کہانی ہے جس میں ایک جوان بیوہ کے درد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شباہت ایک ایسی لڑکی ہے جس کے سامنے اس کی عزیز ترین سہیلی راگنی بیوہ ہوجاتی ہے ۔مرتے وقت اس کے شوہر نے وصیت کی تھی کہ راگنی کو ستی کرایا گیا تو اس کی آتما بے چین رہے گی مگر راگنی کو بھری جوانی میں شوہر کی چتا پر لیٹنا پڑا کیونکہ سوال خاندان کی پرمپرا کا تھا ۔شباہت کے ٹوکنے پر اسے جواب ملا تھا کہ تم خوش نصیب ہو بیٹی ہم اس سلسلے میں بدقسمت ہیں ۔اس درد کو بہت اندر تک شباہت نے محسوس کیا تھا ۔اور شوہر کی موت کے بعد اس کے سسرال والوں نے اسے اپنی مرحوم اولاد کی نشانی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا جو اوروں کے ساتھ ہوتا تھا ۔کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی گئی لیکن کسی نے شباہت کے اس درد کو محسوس نہیں کیا کہ رات رات بھر وہ جاگتی کیوں ہے اور اس کی ڈھلی ڈھلی ہر صبح کسی نہ کسی طرح میلی کیوں ہوجاتی ہے ۔ پہلی جنوری کو دوسروں کی طرح وہ بھی جب بچوں کو ساتھ لے کر ان کو گھمانے کے لئے باہر جانے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی ساس بہت محبت اور پیار سے اسے جانے سے روکتی ہے ۔مگر جب شباہت یہ بتاتی ہے کہ اس کی عدت تو پوری ہوچکی تو اس کی ساس بہت نرمی سے جواب دیتی ہے:

''ہاں بیٹی !مگر سال ڈیڑھ سال ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔'' تب اسے راگنی کے پتا کی بات یاد آتی ہے ''پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے بیٹی'' تب وہ سوچنے لگتی ہے کہ راگنی اور اس میں فرق کتنا ہے ؟اس کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کے بچے شرعی طور پر مجوب ہوگئے ۔ان بچوں کی خاطر وہ سارا درد سہنے پر مجبور ہے اور محبتوں کے درمیان بھی وہ خود کو درد کے ساغر میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتی ہے وڈمبنا تو یہ ہے کہ پاکستان میں اس کے رشتہ کی بہن شائستہ کی شادی ۳۴ ربرس کی عمر میں ہونے کی خبر آتی ہے ۔اور اس سے ۱۰ ردس سال چھوٹی شباہت ۲۴ رسال کی عمر میں بیوہ ہوگئی اس کے والدین اس بات سے مطمئن ہیں کہ اس کی بیٹی سسرال میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور سسرال والے اسے اپنے بیٹے کی امانت سمجھ کر حفاظت سے رکھے ہوئے ہیں لیکن اس کے اندر کے درد کو کوئی محسوس نہیں کرتا اس کے شوہر کی بیوہ پھوپھی اسے ایک شہزادی کی کہانی سناتی ہے جہاں برسات کا پانی چھاجھوں برس رہا ہے اور لڑکی جنگل کی اندھیری رات سے جوجھ رہی

ہے تب شباہت یہ سوچتی ہے کہ جنگل کی اندھیری رات میں شہزادے ایک ہی مرتبہ کیوں آتے ہیں ۔اپنے سارے حالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے شباہت یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی ہے کہ کاش !وہ راگنی ہوتی اور پوری زندگی تل تل مرنے کے بجائے ایک ہی بار چتا پر لیٹ کر سارے دکھوں سے آزاد ہوجاتی ۔

حسین نے اس کہانی کے ذریعہ سماج میں ہو رہے ایک ظلم کی طرف اشارہ کیا ہے جسے لوگ عام طور پر محسوس نہیں کرتے ۔ویسے تو ہر سماج میں بیوہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا ۔لیکن یہاں شباہت کے ساتھ بہت اچھے سلوک کے بعد بھی کس طرح تل تل مرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے ۔یہ سچائی اس کہانی میں ابھر کر سامنے آئی ہے اور فنکارانہ انداز میں عقدِ بیوگان کی افادیت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے ۔حسین الحق نے بہت فنکاری سے محبت کے اندر چھپے ظلم کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کم وبیش کچھ ایسا ہی معاملہ برجس کے ساتھ ہوتا ہے ۔جس کا رشتہ پاکستان میں رہنے والے اس کے پھوپھیرے بھائی عرفان سے بڑی خاموشی کے ساتھ طے کیا جاتا ہے لیکن اس کا اعلان نہیں کیا جاتا ۔وہ صرف عرفان کی ایک جھلک دیکھتی ہے عرفان اس کے کمرے میں آتا ہے اور خاموشی سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے ۔وہ صرف ایک جملہ کہہ پاتا ہے مگر مجھے پتہ نہیں تم کیا سوچتی ہو؟ یہی ایک جملہ برجیس کی کل کائنات ہے ۔عرفان کی نوکری عراق میں ہوتی ہے اور عراق کی جنگ میں وہ مارا جاتا ہے ۔برجیس کے والد اس بات پر مطمئن ہیں کہ برجیس کے رشتے کی بات عام ہونے سے بچ گئی ۔لیکن انہیں اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوتا کہ برجیس کے دل پر کیا بیتی ہوگی ۔اور اس کے آنسوؤں کی دھار نے اندر ہی اندر سے اُسے کس طرح بھگویا ہوگا جو شادی ہونے سے پہلے ہی خود کو بیوہ سمجھنے پر مجبور کردی گئی ۔اس کہانی ''لڑکی کو رونا منع ہے'' میں حسین نے برجیس کے کنوارے درد کو بہت خوبصورتی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے درد کی یہ کہانی صرف برجیس کی نہیں ہے بلکہ اس میں والدین کی بے حسی بھی ہمیں جھنجھوڑنے کا کام کرتی ہے ۔اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لڑکی کے اندر ہو رہے اتھل پتھل کی جانکاری والدین کو نہیں ہو پاتی اور لڑکی کی شادی کے فیصلے میں وہ صرف اپنی پسند اور ناپسند پر ہی توجہ دیتے ہیں ۔اس سے ایک نہیں سیکڑوں برجیس کا درد ہمارے سامنے آجاتا ہے ،اس کہانی کا ایک سچ یہ بھی ہے کہ عراق کی جنگ کا اثر صرف عراق پر نہیں پڑا ۔عراق تو ہر گھر آنگن میں گھس آیا ۔

اس مجموعے میں سیاست کے گلیارے کی کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں جس میں ''جلیبی کا رس'' آج کے سیاسی گلیارے کے اندھیرے کو ایک تلخ حقیقت کی طرح سامنے لانے کا اہم کرتی ہے ۔روشن بہاری آج کے سیاسی کارندے کا نمائندہ کردار ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ....اپنے ضمیر کا قتل کرتا ہے اور اپنی بیوی کی عزت کا بھی سودا کرنے پر شرمندگی محسوس نہیں کرتا ۔ششی بھوشن ،بکھ منتری کا قریبی

آدمی ہے اس نے روشن بہاری پر سیاسی احسانات کئے ہیں وہ شراب کے نشے میں اس کی بیوی کے ساتھ اس کے بیڈروم میں بند ہے مگر جب ششی بھوشن سامنے آتا ہے تو روشن بہاری کا غصہ دودھ کے اُبال کی طرح سرد ہوجاتا ہے اور وہ شکرانے کے طور پر ششی بھوشن کا پاؤں چھونے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے جلیبی کا رس میں آج کی سیاست کی ایک ایسی ننگی سچائی بیان کی گئی ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے لیکن پھر بھی بے ضمیر لوگ اس دلدل کی جانب بڑھنے سے خود کو نہیں روک پاتے ۔حسین نے تو ایک آئینہ سامنے رکھ دیا اگر لوگ چہرے کو نہ پہچان سکیں تو پھر اس میں فنکار کا کیا قصور ۔

مجموعے کی آخری اور سرنامہ کی کہانی ''نیو کی اینٹ'' پر بھی سرسری نگاہ ڈال لی جائے ۔یہ کہانی بابری مسجد کی شہادت کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے ۔یہ سب کو معلوم ہے کہ بابری مسجد کے شہادت کے بعد سبھی کارسیوک مسجد کی ایک ایک اینٹ اٹھا کر لے گئے تھے اسی میں ایک شیو پوجن بھی ہے جو اجودھیا سے نیو کی اینٹ لے کر آتا ہے اور سارے لوگوں کے درمیان وہ اچانک اہم ہوجاتا ہے پنڈال لگائے جاتے ہیں اور جئے شری رام کے نعرے چاروں طرف گونجنے لگتے ہیں ۔شیو پوجن کا پڑوسی سلامت اللہ اور اس کی بیوی بچے خوفزدہ ہوجاتے ہیں ۔شیو پوجن کی لائی ہوئی اینٹ ایک طرف کہیں پوجنے لائق ہوتی ہے تو دوسری طرف خوف کا ماحول بھی پیدا کرتی ہے ۔سلامت اللہ کی نگاہوں میں گذرے ہوئے فسادات کی تصویر گھومنے لگتی ہے اور اسے لوگوں کے نعرے اور تضحیک بھری سرگوشی بھی یاد آتی ہے تب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی جنگ میں ہارا ہے جس میں اس نے حصہ ہی نہیں لیا ۔

چونکہ سرکار اپوزیشن والوں کی ہے اور شیو پوجن کے گھر آئی ہوئی اینٹ کی خبر پر پرشاسن متوجہ ہوجاتا ہے نتیجتاً آن کی آن میں شامیانہ اور بھیڑ سب غائب بھجن بھی بند اور شیو پوجن سلامت اللہ سے زیادہ پریشان دکھائی دینے لگتا ہے ۔اسے اپنے یہاں پولیس کے چھاپے کا ڈر ہے اجودھیا سے لائی گئی نیو کی اینٹ کل تک اس کے لئے فخر کا اعلانیہ تھی مگر اب گلے کی ہڈی بن گئی ہے اور وہ اس سے نجات کی صورت تلاشنے لگتا ہے ۔وہ اس اینٹ کو اپنے گھر سے ہٹا کر کسی دوسرے کے گھر میں رکھنا چاہتا ہے لیکن کوئی بھی ہندو اپنے یہاں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ۔جبکہ کل تک سارے لوگ اس کی پوجا کر رہے تھے ۔اس اینٹ سے سب سے زیادہ خوف زدہ سلامت اللہ کا ہی خاندان تھا اور شیو پوجن یہ اینٹ یہ کہہ کر سلامت اللہ کو ہی تھماجاتا ہے کہ یہ آپ کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ہمارے لئے شیو پوجن اپنے گھر میں تالا لگا کر پورے خاندان کے ساتھ کاشی اور متھرا کی یاترا پر نکل جاتا ہے اور سلامت اللہ یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ اس نیو کی اینٹ کا کیا کرے ۔

حسین الحق نے نیو کی اینٹ کے بہانے بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے اندر ڈرے سہمے جذبات کی خوبصورت عکاسی کی ہے ۔دوسری طرف اس سچائی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کل تک جو اینٹ فخر کا باعث اور پوجنے لائق شئے تھی وہ اچانک انہیں لوگوں کے لئے کس طرح قابل نفرت اور معتوب بن گئی ۔انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تھوڑے سے خوف کے باعث لوگ کس طرح اپنے دھرم ایمان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں ۔وقت نے تھوڑا سا پلٹا کھایا یہ اینٹ ایسے شخص کو سونپ دی گئی جسے اس اینٹ سے چڑھایا جا رہا تھا ۔اس زمانے میں سماج اور دفتر میں جس قسم کے سرگوشی بھرے حالات تھے اس کی بہتر عکاسی حسین کی اس کہانی میں دیکھنے کو ملتی ہے ۔

حسین الحق ایک ایسا فنکار ہے جس نے سماج کے ہر طبقہ سے کردار کا انتخاب کیا ہے اور زمانے اور حالات کی بہتر عکاسی کی ہے سچا فنکار وہی ہوتا ہے جس کی کہانیوں میں زمانہ بولتا ہے اور زمانہ کے اعتبار سے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں حسین خوبصورت زبان کا استعمال کرتے ہیں جذبات کی عکاسی میں انہیں مہارت حاصل ہے ۔کبھی کبھی وہ رنگوں چاند ،ستارے ،ہوا ،سرگوشی ،ہاتھ پاؤں کے اشارے' چہرے کی تمتماہٹ' جذبات کے اُبال' آنکھوں سے بہتے درد اور سماج کی ننگی سچائیوں کو بڑے خوبصورت استعاراتی انداز میں بیان کرتے ہیں اور اپنے فن کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔حسین کی کہانیوں میں وقت بولتا ہے زمانہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے ہوا کی سسکیاں بھی کہانی سناتی ہیں اور مدھم سرگوشی میں بھی جذبات کا درد بیان ہوتا ہے ۔محبت کو حسین اپنی کہانیوں میں نیو کی اینٹ کی طرح استعمال کرتے ہیں ۔محبت ان کی کہانیوں میں لاشعوری طور پر محسوس ہوتی رہتی ہے کبھی اشارے کنائے میں اور کبھی کھل کر اس کا اظہار ہوتا ہے ۔وہ محبت کو چھپاتے بھی نہیں حسین کی کہانیوں میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ اس آگ کے دریا میں ڈوب کر پار اترنے کا ہنر جانتے ہیں ۔وہ فنکار بہت خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنے جذبات کو کردار پر حاوی نہیں ہونے دیتا ۔اردو فکشن کی جب بھی کوئی مستند تاریخ لکھی جائے گی حسین کی کہانیوں کا شمار کئے بغیر وہ ادھوری سمجھی جائے گی ۔

Nooristan
A/204-Hassan Plaza
Minhaj Nagar
Khalilpura Road
Phulwari Shareef-801505-Patna
9771276062
9431080070

● اظہار خضر

زخمی زخمہ

یہ معروف اور معتبر افسانہ نگار جناب حسین الحق کا تازہ ترین افسانہ ہے ۔ (مطبوعہ ''ذہن جدید'' شمارہ ۶۸ ، مارچ تا اگست ، ۲۰۱۴ء) افسانے کا عنوان ''زخمی زخمہ'' افسانہ نگار کی تخلیقی اشارتی گفتگو کا اشاریہ ہے ۔ زبان کی جدلیاتی تخلیقی فنکاری کے پیش نظر مطلوبہ ابہام پسندی کو عنوان میں جگہ دی گئی ہے ۔ پورا افسانہ بالواسطہ بیانیہ (Indirect Narration) کا تخلیقی مظہرہ (Phenomenon) ہے ۔ اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار، زبان کی تخلیقی فنکاری کے اسرار و رموز سے واقف ہے ۔ خیال رہے کہ آرٹ میں براہ راست طریقۂ اظہار سم قاتل کا درجہ رکھتا ہے ۔ زبان کے جدلیاتی عناصر......اشارے ، کنائے ، علامات ، تشبیہ واستعارات ادبی فن پاروں میں تخلیقی حسن کے ضامن تصور کیے جاتے ہیں ۔ ''زخمی زخمہ'' اپنی تمام تر ترسیلی پیچیدگیوں کے باوجود افسانے کے سنجیدہ اور ترقی یافتہ قاری کو فکر و فہم اور غور و فکر کی دعوت دیتا نظر آتا ہے ۔

زیر گفتگو افسانے کے بپھرتے ہوئے کلیدی کردار شہ زیب خاں یوسف زئی کی گفتگو، فکر اور سوچ تفہیم و تعبیر کی سطح پر عنوان کے لیے شاہ کلید (Master Key) کی حیثیت رکھتی ہے ۔ کیوں کہ ایک زخم خوردہ وجود کا رباب دل بھی زخم خوردہ ہی ہوتا ہے ۔ فی الحال اس سوال کو پس پشت ڈالیے کہ زخم خوردگی کی وجہ وجود کی معقولیت پسندی ہے یا غیر معقولیت پسندی! دونوں ہی صورتوں میں رباب دل (زخمہ) گھائل ہے ۔ اس نہج سے افسانے کا تخلیقی المیاتی حسن ہی اس کی جمالیات ہے ۔ افسانہ نگار کی جمالیاتی حس بہت ہی تحیر آسا اور برق آسا ہے ۔

تاریخ ، تہذیب ، ثقافت اور سیاست بالخصوص عصری فکر کے پیش نظر افسانہ نگار کی فکری اور تخلیقی بصیرت میں ایک کھلبلی سی مچتی محسوس ہوتی ہے ۔ یہی وہ فکری کھلبلی ہے جو فن المیہ نگاری کے راستے ، ٹوٹتی بکھرتی ، پامال ہوتی ہوئی عصری عالمی فکر و قدر کے پس منظر میں افسانے کے تخلیقی کینوس پر اپنا دستخط ثبت کرتی نظر آتی ہے ۔ ان امور پر تفصیلی گفتگو آگے کی سطور میں کی جائے گی ۔

عالمی دہشت گردی کے تناظر میں لکھا گیا یہ افسانہ ان نام نہاد سیاست دانوں اور دانشوروں کے ذہنی اور فکری دیوالیہ پن کا الم نامہ ہے جو اپنے آپ کو بہترین قدروں کا امین تصور کرتے ہیں اور جن کی پشت پناہی میں یہ دہشت گردانہ سرگرمیاں پھل پھول رہی ہیں ۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنی اس نام نہاد فکر و قدر کو منوانے

کی کوششوں میں مسلسل جٹے ہوئے ہیں ۔ زیر تجزیہ افسانے میں افسانہ نگار.......... حسین الحق ان سیاست دانوں اور دانشوروں کے کردار و عمل پر ایک سوالیہ نشان لگاتا نظر آتا ہے ۔ چنانچہ افسانے کا بنیادی موضوع سیاسی اور تہذیبی بکھراؤ ہے ۔ (Political and cultural turmoil) بالخصوص افغان بحران کو تخلیقی فکر و سوچ کے لیے Focus Point بنایا گیا ہے ۔ حالانکہ اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی گئی ہے ۔ لیکن بہر صورت افسانے کے فکری آمیزہ کی عقبی زمین اسی عصری عالمی سانحہ و واقعہ کو قرار دیا جانا چاہئے ۔ مزید یہ کہ اس کے ڈانڈے فکر و سوچ کی جہالت و تاریکی سے ملائے گئے ہیں موجودہ عالمی سیاسی اور تہذیبی معاشرہ ایک ظلمت کدہ بن کر رہ گیا ہے ۔ فکر و قدر کی پامالی علوم و فنون کی روشنی کو کھدیڑتی نظر آرہی ہے ۔ حالانکہ موجودہ عہد علم کی روشنی سے شرابور ہے ۔ اس کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں! لیکن المیہ یہ ہے کہ علم کی مادی توجیہہ پسندی سے اس کی چمک دمک ماند پڑتی جا رہی ہے ۔ آخر یہ وحشت خیزیاں کیوں؟

۱۱ ستمبر ، ۶ دسمبر اور نہ جانے ایسی کتنی تاریخیں ہیں جن سے انسانی ہلاکت خیزیوں کی داستانیں بھری پڑی ہیں ۔ میرے نزدیک یہی اس افسانے کا Thematic approach ہے! عرض یہ کرنا ہے کہ فکر و فہم اور مثبت شعور و آگہی کی حامل ، علم کی ایک ہلکی سی کرن بھی نظر آجاتی تو قرار آجاتا! فی الحال افسانے کی اس تخلیقی تناظراتی اور پس منظراتی گفتگو کو یہیں پر ختم کرتا ہوں ۔ اور فکر و قدر کے حوالے سے افسانے کی بنت کی طرف چلتا ہوں ۔

افسانہ کا بیان کنندہ ، راوی واحد متکلم کی صورت میں خود افسانہ نگار ہے ۔ راوی بڑا ہی ذہین اور ایک روشن قلب و نظر کی حامل تخلیقی شخصیت ہے ۔ وسیع المطالعہ ہے اور فکر و نظر کی دانشوری اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔

اب یہ دیکھیے کہ افسانے کی ابتدا نوبل انعام یافتہ ہندوستانی نژاد انگریزی ناول نگار وی ایس ۔ نائپال سے ہوتی ہے ۔ اور اس کی انتہا بھی نوبل انعام یافتہ نوعمر حوصلہ مند افغان لڑکی ملالہ یوسف زئی پر ہوتی ہے ۔ دونوں علم کی روشنی کی علامت! ملالہ یوسف زئی تو دہشت گردوں کے نشانے پر اس لئے رہی کہ یہ نوعمر اور نوخیز لڑکی تاریکی کی تہہ سے اجالے کی نمود کے لئے مسلسل جدوجہد کرتی تھی ۔ کہ شاید تشدد کا جنون کم ہو اور فکر و سوچ کی معقولیت پسندی کا فروغ ہو ۔

افسانہ نگار کی اس فکری اور تخلیقی جست پر غور کیجئے کہ وہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بانکی مون سے درخواست کر رہا ہے کہ ملالہ کو کشت و خون سے بھرے اس خطۂ ارض پر واپس بھیج دو کہ اب تو سر سید کا خواب بھی بکھر چکا ہے ۔ سر سید کے تعلیمی مشن کا خواب برصغیر کی سرحدوں تک ہی محدود نہیں تھا ۔ بلکہ وہ

سرحدوں کی حد بندیوں کو توڑنا اور پھلانگنا چاہتا تھا ۔ لیکن سر سید کا یہ خواب چکنا چور ہو گیا ۔

بیان کنندہ راوی کا تعلق برصغیر کے اس خطۂ ارض سے ہے جہاں سر سید کے تعلیمی مشن کی گونج اس کے کانوں میں ہمہ وقت سنائی پڑتی رہتی ہے ۔ اور اس کا فکر و شعور مہمیز ہوتا رہتا ہے ۔ تہذیبی اور سیاسی بکھراؤ کی افسانوی کرافٹنگ کے لئے سر سید اور اس کے تعلیمی مشن کو افسانہ نگار نے ایک Story telling tool کے طور پر برتا ہے ۔ بیانیہ کی اس تکنیک سے ہی افسانہ نگار نے افسانے میں دانشورانہ فکر و نظر کی تخلیقی فضابندی کی ہے ۔ جس میں اس کی Slective Ideology اور Glaring Fact کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ یوں سمجھئے کہ حقیقت مجاز کے پردے میں رقص کر رہی ہے ۔ اسی کو اعلیٰ درجے کی تخلیقی فنکاری کہتے ہیں ۔ افسانے کی ماجرا سازی میں چونکہ دہشت گردی ایک کلیدی کردار نبھاتی نظر آتی ہے لہٰذا، ۱۱ ستمبر کے واقعہ کو پیش نظر رکھیے اور یہ دیکھئے کہ افراتفری کے اس ماحول میں افسانے کا راوی اس وقت علی گڑھ میں ''باب سید'' سے ہوتے ہوئے مولانا آزاد لائبریری کی جانب جا رہا تھا ۔

افسانہ نگار کے پیش نظر علی گڑھ کو بیانیہ کا حصہ بنانے کا صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے یعنی علی گڑھ کے توسط سے سر سید اور ان کے تعلیمی مشن کو پروجیکٹ کرنا ، چنانچہ راوی ''سر سید ہاؤس'' کے پاس رک جاتا ہے اور دروازے پر دستک دیتا ہے تو سر سید کے بدلے مولانا الطاف حسین حالی نمودار ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ سید تو ویزا اضبطی کی وجہ سے افغانستان میں پھنسے ہیں ۔ خیر اس سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ راوی ''زوال آدم خاکی'' کی نوحہ خوانی کی غرض سے سید کے حضور میں حاضر ہوا تھا ۔

سید کی باریابی سے مایوس راوی کو حالی کے توسط سے سر سید کا ایک نوشتہ ہاتھ لگا ۔ اس کے بعد افسانے کے بیانیہ میں حالی ، خواجہ حسن نظامی اور راہی معصوم رضا کے حوالے سے تفصیلات کا ایک سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے جو میرے خیال میں بیانیہ کو مزید دراز کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے ۔ البتہ بیانیہ کے اس حصے میں ایک Turning Point یہ ضرور ملتا ہے کہ اس افراتفری اور بے اماں صورت حال کی گھڑی میں سوائے راوی کے کسی نے ''سر سید ہاؤس'' کی جانب رُخ نہیں کیا ۔ بلکہ سبھوں کا رُخ یونیورسٹی کے تھیولوجی ڈپارٹمنٹ کی جانب تھا ۔ کہ شاید علم و عرفان کی مذہبی روشنی میں سکون و قرار نصیب ہو جائے ۔ لیکن اس نکتہ پر غور فرمایئے کہ اس بے اماں گھڑی میں آخر لوگوں نے سید کو کیونکر Ignore کیا ۔ شاید افسانہ نگار کہنا چاہتا ہے کہ سید کی فکر کا پس پشت پڑ جانا Prospective Ideology سے لوگوں کی بیزاری وانحراف کا اعلانیہ ہے ۔ فکر و سوچ کے اس رجحان کا Climax تو حد درجہ حیران کن نظر آتا ہے ۔ جب راوی کے ہاتھ آیا سید کا نوشتہ ان پڑھا ہی رہ گیا ۔ یہ افسانے کے پہلے مرحلے کا اختیاری مکالمہ ہے ۔ اختیاری

مکالمہ کا دوسرا Step ملالہ یوسف زئی کی واپسی کے حوالے سے ہے کہ شاید نوخیز اور نوعمر ملالہ ، سید کی جگہ لے لے ۔

عرض یہ کرنا ہے کہ اس ناخواندہ نوشتہ کو محض افسانے کے راوی کے ساتھ Tag کرکے دیکھنا اور سمجھنا صحیح نہیں ہوگا بلکہ اس کا اطلاق تو مجموعی طور پر پوری ملت اور قوم پر ہوتا نظر آتا ہے ۔

''کتاب میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ اسکول ہسپتال بند کرا کے ہتھیار خریدے جائیں ۔''

کہنا یہ ہے کہ زیر گفتگو افسانہ تہذیب ثقافت اور سیاست کے حوالے سے ایک تخلیقی دستاویز تو ہے ہی ساتھ ہی اس میں فکر و قدر کا عصری عالمی منظر نامہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے ۔ یاد رکھئے کہ ادب اور فنون لطیفہ کا تخلیقی فنکار زمانے کا نبض شناس ہوتا ہے وہ زمانے کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر مسائل کو اجاگر کرتا ہے ۔ مسائل کا مداوا کرنا اس کا کام نہیں ۔ البتہ تاریکی کی تہہ سے اجالے کی نمود کا خواہاں ضرور رہتا ہے ۔ اس کا تخلیقی اور فکری سفر تاریکی سے اجالے کی جانب رواں دواں رہتا ہے ۔ چنانچہ زیر گفتگو افسانے کا راوی بھی فکری اور ذہنی سطح پر جہاں نظر آتا ہے ۔ اس کی جہاں گردی کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے ۔

''میں عبداللہ عامر حاکم بصرہ کے پاس تھا یہ زمانہ ۳۱ ہجری کے آس پاس کا تھا ۔''

حالانکہ راوی جسمانی طور پر بزم موسیقی کی اس محفل میں موجود تھا جہاں خان نغمہ سرا تھا ۔

خیز دا زوئے شعلہ ہائے سینہ سوز...... با مزاج تو نمی سازد ہنوز

لیکن راوی کو خان کی نغمہ سرائی سے کیا لینا دینا ۔ وہ تو فکر و نظر کی دانشوری کی سطح پر مسائل و معاملات سے ہمہ وقت جوجھتا رہتا ہے ۔ راوی واقعتاً علم کا جویا اور متلاشی ہے ۔ چنانچہ وہ ۳۱ ہجری کے گہوارہ علم و فن بغداد و بصرہ میں فکر و نظر کی دانشورانہ سرگرمیوں کو مزید فعال و متحرک کرتا نظر آتا ہے ۔ عرض یہ کرنا ہے کہ افسانے کی کرافٹنگ میں افسانہ نگار نے حصول علم کے بامعنی منطق و جواز کو ایک Dominating Factor کی صورت جگہ دینے کی کوشش کی ہے ۔ گفتگو کی ابتدائی سطور میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ عالمی معاشرہ تشدد کے جس بحران سے گزر رہا ہے اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں فکر و سوچ کی جہالت و تاریکی سے ملتے نظر آتے ہیں تجزیہ کے پہلے زینہ کی قدم پیمائی یہیں پر ختم ہوتی ہے!

اب افسانہ کے دوسرے پہلو پر چند باتیں سن لیجئے جو موضوع اور تھیم کو Carry کرنے کے لیے Tool کی حیثیت رکھتا ہے ۔

افسانے کا آغاز اس کے راوی پر نازل ہونے والی اس مضطرب و بے چین الہامی کیفیت سے

ہوتا ہے ۔ جب غیب سے ایک شخص نمودار ہوااور مجھ تک یہ پیغام پہونچایا کہ ''ہوالڑکھڑانے لگی ہے'' ۔اس اشاراتی واستعاراتی تخلیقی گفتگو کی گونج افسانے کے بین السطور میں جا بہ جاسنائی پڑتی ہے ۔خیال رہے کہ افسانہ نگارنے پورے افسانے میں چار مرتبہ وقفہ وقفہ پر یہ Symbolic Signalling Fictional کی ہے ۔اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ''ہوا کا رُخ بتاتا ہے کہ آندھی اٹھنے والی ہے۔'' جب جب ہوامیں لڑکھڑاہٹ پیداہوئی ،آندھی اٹھتی چلی گئی۔

شہ زیب خاں یوسف زئی اس افسانے کاایک Agressive کردار ہے ۔جس کو ہوا کی لڑکھڑاہٹ اوراٹھتی آندھی کوکوئی پرواہی نہیں ۔یہ افغان اپنے آپ میں مست ہروقت بزم موسیقی کی محفل میں نغمہ سرانظر آتا ہے ۔لیکن جب جاگتا ہےتو اس کی آواز سے پہاڑوں کے درّے لرزنے لگرتے ہیں ۔اس جانب آگے کی سطور میں گفتگو کی جائے گی۔

ہاں تو اس لڑکھڑاتی ہوامیں ہندوستانی وقت کے مطابق رات کے نو بجے ایک جھما کا ساہوا۔

''نو بجے کاوقت ''بھی افسانے میں وقفہ وقفہ پرچارمرتبہ استعمال ہواہے ! چونکہ W.T.O پرتھوڑے تھوڑے وقفے سے دہشت گردوں کے حملے ہورہے تھے ۔اور ہر حملے میں تباہی وبربادی الگ الگ نوعیتوں کے ساتھ نمودار ہوتی رہی ۔حالانکہ افسانے میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی بلکہ مجموعی طور پر ہلاکت خیزیوں اور تباہیوں کاایک تاثر پیداہوتا نظر آتا ہے ۔فکروفن کے پیش نظر بیانات کی اس تکنیک کواپنانا ضروری تھا! اگر ایسا نہ ہوتا تو افسانہ بے جااورلا طائل بیانوں کاایک ملغوبہ بن کررہ جاتا ہے۔

ہاں تو عرض یہ کرنا ہے کہ شہ زیب یوسف زئی واقعتاً افسانے کاایک بڑاہی جری اور چنگھاڑتا ہوا کردار ہے ۔لیکن ہے بڑاہی معاملہ فہم اور بردبار ۔ اس کی نغمہ سرائی دراصل اس کی بردباری اور معاملہ فہمی کااشاریہ ہے! لیکن جب وہ اپنی اصل صورت میں واپس آتا تو لوگ دہل جاتے ۔یوں سمجھئے کہ کسی گہرے کنویں کی سطح آب سے اس کی چنگھاڑتی آواز Echo بن کراطراف کی فضا کولرزہ اندام کررہی ہے۔

اب ذرا خان کے اس مکالمہ کوملاحظہ فرمایئے۔

''یہ علاقہ ان کا قبرستان بنے گا۔''

''شہ زیب خاں یوسف زئی جامے سے باہر ہواجارہا تھا۔''

اتنا ہی نہیں ''خوشہ کافر کا بچہ'' تو خان اپنی زبان پرورد کی طرح گردانتا رہتا ۔خان کی جری شخصیت کے اس Agressive پہلو کو پیش نظر رکھیے اور یہ دیکھیے کہ .W.T.O پر دہشت گردوں کا حملہ اور پھر اس کے بعد کی بڑی تباہ کن جوابی کاروائی ،وقفے وقفے پرخان کی نغمہ سرائی کو Interrup کرتی رہتی ۔اور جب

خان جاگتا تو ''خوشہ کافر کا بچہ'' کے ورد سے فضا کو دہلا دیتا ۔اس مزاحمتی ذہنیت کااطلاق پورے افغانیوں پر ہوتا محسوس ہوتا ہے ۔سرسید کا ناخواندہ نوشتہ ادھوراہی رہ گیا ۔خواب ادھورے رہ گئے ۔شہ زیب خاں یوسف زئی تو اسکول ،کالج ،اسپتال بندکراکے ہتھیار خریدنے میں مگن تھا ۔ عرض یہ کرنا ہے کہ .W.T.O پر حملہ افغان بحران کا کلائمکس ہے ۔اس کے بعد تباہی وبربادی کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

''کینیااور تنزانیہ سے نیویارک تک ......کابل اوردہلی سے حیدرآباد تک......

خیزداز وۓ شعلہ ہائے سینہ سوز۔''

تشدد سے بھرایہ عصری عالمی منظر نامہ افسانہ نگار کی تخلیقی اور فکری سرگرمیوں کامظہر ہے ۔شاید افسانہ نگار اپنے اس خواب کوحقیقت میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہے کہ ادب کے توسط سے تشدد اور جنگ کوروکا جاسکتا ہے ۔لیکن خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں ۔حقیقت میں بدل بھی سکتے ہیں اورنہیں بھی ۔البتہ ہرزمانے میں علم ودانش کی سطح پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ قوموں کے مزاج اوراس کی فکروسوچ کوایک صحیح سمت عطا کی جائے ۔ہرزمانہ میں زمانہ ساز شخصیتیں پیداہوتی رہی ہیں جن کی فکری سرگرمیاں اسی سمت اورنہج پر کام کرتی رہی ہیں ۔لیکن آج کے اس پرآشوب اور پرفتن دور میں محسوس ہوتا ہے کہ ایسی شخصیتیں عنقا ہوتی جارہی ہیں۔

جبھی تو افغانستان کے مقابلے میں امریکیوں کے پاس علم کی بے پناہ روشنی اور چمک دمک ہوتے ہوئے بھی وہ تاریک راہوں کے مسافر بن کررہ گئے ہیں ۔افسانے کی زیریں لہروں میں علم ودانش کی سطح پرافسانہ نگار کی یہ فکرونظر حد درجہ متحرک وفعال محسوس ہوتی ہے ۔میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ افسانہ نگار امریکیوں کوکوس رہا ہے یا افغانیوں کو ۔البتہ افسانہ نگار جہالت کی اس پھیلتی وبائی صورت حال سے فکرمند ضرور نظرآتا ہے ۔جبھی تو اس کی یہ فکرمندی سرسید اورملالہ یوسف زئی کی صورت میں دیکھنے کوملتی ہے۔

سرسید اورملالہ دوایسے Fictional Notations ہیں جن کی Coding اور Dcoding کا تخلیقی عمل افسانے میں بڑی ہی چابکدستی کے ساتھ وقوع پذیر ہوا ہے ۔مزید یہ کہ مختلف تخلیقی وقوعوں کے توسط سے افسانہ نگارنے بیانیہ کوتحیرآسا بنانے کی کوشش کی ہے ۔بالخصوص ''ہوا کی لڑکھڑاہٹ'' کی Coding اور Decoding اس انداز سے کی گئی ہے کہ ماجرا سازی میں واقعات کا Sequence بگڑنے نہ پائے۔

مختصر یہ کہ شہ زیب خاں یوسف زئی بہ ظاہر تو ہمہ وقت نغمہ سراہی رہتا لیکن دراصل وہ مملکت افغان کے جذبۂ قومیت سے سرشار تھا ۔مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے جذبۂ قومیت میں جس قسم کی تندی

وتیزی تھی، اسی کے سبب وہ ذہنی اور فکری سطح پر حد درجہ متشدد نظر آتا ہے۔ تہذیبی سیاسی اور سماجی بکھراؤ اپنے عروج پر آچکا تھا۔ ایسے میں خان ٹرانس (Trans) کی کیفیت سے گزرنے لگا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی قلب ماہیت تھی۔ کیا خان نغمہ سراہی رہنا چاہتا تھا۔ یا پھر موجودہ افغان بحران اس کے اندر کھلبلی مچائے ہوئے تھا۔ ذرا غور فرمایئے کہ خان ٹرانس میں آرہا تھا کہ اچانک گرجدار آواز کے ساتھ نغمہ سرا ہوا۔

''بے گذشت کہ انتظار زخمہ وریست ...... چہ نغمہ ہا کہ زخوں شد بہ ساز افغانی۔''

افسانے کا بیانیاتی سلسلہ ''زخمہ'' کے اشاراتی اور استعاراتی Turning Point پر آکر ختم ہوتا ہے:

''اور پھر یہ عجیب بات ہوئی کہ دور دور تک کوہ درکوہ، غار درغار، وادی دروادی، ایک آواز بگولے کی طرح چکر کاٹتی رہی، صدائے گنبد کی طرح گونجتی رہی، سر پٹختی رہی، چہاردانگ عالم میں اس آواز کی بازگشت دور دور تک سنائی دی۔ یہ ساز افغانی...... یہ ساز افغانی۔

غور فرمایئے کہ ''یہ ساز افغانی'' کی صدائے بازگشت، سرحدوں کو پھلانگتی ہوئی چہاردانگ عالم میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ افغانیوں کا یہ جذبہ قومیت امریکیوں کے نزدیک صدا بہ صحرا ٹھہرا۔ فی الوقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ اس بحران و بکھراؤ کا ذمہ دار کون ہے؟ البتہ افسانہ نگار کے اس تخلیقی موقف پر یہ تجزیاتی گفتگو ختم کیا چاہتا ہوں کہ:

''سید کا ناخواندہ نوشتہ میرے ہاتھ میں مرغی کے نوزائیدہ بچے کی طرح دھک دھک کرتا گرم لوتھڑا بن گیا ہے۔''

اختتامیہ: تخلیقی فنکاری میں بالواسطہ طریقۂ اظہار بیانیات (Narrotology) کی بنیادی تکنیک ہے۔ افسانہ نگار نے اس تکنیک کو اپناتے ہوئے مطلوبہ ابہام پسندی کو اعتدال و توازن کے ساتھ برتا ہے۔ ورنہ افسانہ ترسیل کی سطح پر فکر و فلسفہ کی ژولیدہ بیانی کا ایک ملغوبہ بن کر رہ جاتا۔ پھر بھی افسانے کے بیانیہ میں زمان و مکان کا تیزی سے بدلنا (Quick Shifting) اس کی شدت تاثر کو متاثر کرتا ہے۔

افغان نژاد انگریزی ناول نگار خالد حسینی نے کابل بحران پر (۲۰۰۳ء) The Kite Runner کے نام سے ایک ناول لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ افسانہ نگار جناب حسین الحق کی نظر سے یہ ناول گزرا ہو!

«●»

● ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

اماوس میں خواب......معاصر ہندوستان کا استعارہ

جدید اردو ناول نگاروں میں حسین الحق ایک اہم نام ہے مگر انہوں نے افسانے پر زیادہ توجہ دی اس لئے ان کے ناول کم اور طویل وقفے کے بعد آئے۔ حسین الحق نے اب تک تین ناول لکھے ہیں۔ پہلے ناول ''بولو مت چپ رہو'' (۱۹۹۰) کا موضوع پرائمری و مڈل اسکول کی تعلیم اور سکنڈری لیول پر ایجوکیشن افسر کی نوکر شاہی ہے جس میں اسکول لیول پر بہار میں تعلیمی بدنظمی اور تعفن زدہ تعلیمی نظام کو اکسپوز کیا گیا ہے۔ دوسرا ناول ''فرات'' (۱۹۹۲) نئی زندگی اور نئی Sensibility کا اچھا ناول ہے جس میں ہم عصر ہندوستان کی تہذیب کے مختلف رنگوں اور ان کے ٹکراؤ کو سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ طویل گیپ کے بعد حسین الحق کا نیا ناول ''اماوس میں خواب'' (۲۰۱۷) آیا جو ایک بڑے کینوس پر لکھا گیا ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کی سیاسی، سماجی صورت حال بھی ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں پیش آئے تغیرات و انقلابات بھی۔ تعلیم کی کساد بازاری بھی ہے اور سیاست کی عیاری بھی۔ اس میں بھیونڈی، مالیگاؤں، بھاگلپور، بابری مسجد، گجرات، لوجہاد، گئو رکچھا سب کچھ موجود ہے اور ان سب کو خوبصورتی سے قارئین تک پہنچانے کے لئے اسماعیل، قیدار، نائلہ اور رمیش جیسے مضبوط کردار بھی تراشے گئے ہیں۔ آزادی کے بعد سے اب تک کی ہندستانی تاریخ کو ایک سیکولر اور غیر جانبدار نقطہ نگاہ سے دکھانے کے لئے ایک بڑے کینوس اور ہزاروں صفحات کی ضرورت تھی مگر حسین الحق نے ایک ماہر فنکار کی طرح استعارے، تمثیل اور علامت کی زبان دے کر بڑی خوبی سے ۳۴۷ صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ یہاں ماضی اور اس کی قدریں، اسلاف کی تہذیب، مشترکہ ثقافت خواب کی صورت جلوہ گر ہوتی ہیں جسے تعبیر کی صورت میں اسماعیل سے نائلہ تک تین نسلیں پانا چاہتی ہیں، مگر کیا کیجے کہ ملک نے اپنے اوپر نفرت، سیاست اور دشمنی کے اماوس کی وہ چادر تان رکھی ہے کہ تعبیر کا چاند نکل ہی نہیں پاتا۔ حسین الحق نے اس ناول میں بیانیہ کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اس کا ڈکشن استعارے اور تمثیل کو نئی جہتیں دیتا ہے اور بیانیہ کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

۳۴۷ صفحات پر مشتمل اس ناول میں جیسا کہ میں نے کہا آزادی کے بعد سے آج تک کی ہندستانی تاریخ کے بین السطور کو پیش کرنے کوشش کی گئی ہے۔ آزادی کے بعد کا یہ عرصہ ملک کے لئے جیسے بھی تغیرات سے بھرا رہا ہو، انسان کے لئے ذہنی انتشار، قلبی خلفشار اور فکری اضطراب کا عرصہ رہا ہے جس کا تعلق آج سے ہے اور آنے والے کل سے بھی۔ جمہوریت کے خوشنما لبادے میں قید فرد کی چھٹپٹاہٹ، بے چینی اور جھنجھلاہٹ

مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ آج کا انسان جس کی زندگی آزادی کے بعد سے مسلسل عذاب کا شکار ہے، جس بے یقینی کا شکار ہے اور جن ناہمواریوں میں سانس لینے پر مجبور ہے اس کا تخلیقی اظہار اس ناول کا وصف ہے۔ اردو میں ہم عصر صورت حال پر ناول کم کم لکھے گئے ہیں۔ یہ ناول موجودہ سیاسی، سماجی، تہذیبی صورت حال کی عکاسی تاریخ کے بجائے تجربات کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس میں ہر لحظہ بدلتی زندگی، ہر پل انقلاب سے دوچار معاشرے اور ہر گھڑی چونکانے والی حسیت کے اتنے مناظر سامنے آتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے ہم ناول کے بجائے وقت کے ساتھ سفر کر رہے ہوں۔ اپنے آس پاس کی صورت حال کو حسین الحق نے جس جذباتی قوت اور غیر معمولی حسی شدت کے ساتھ محسوس کر کے اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے وہ اس ناول کو situation local based novel کے ساتھ ساتھ عالمی صورت حال کا آئینہ بھی بنا دیتی ہے۔ دم توڑتی انسانیت، عصری سیاسی حسیت اور قدروں کا بکھراؤ ایسے عناصر ہیں جو اگرچہ مقامی تناظر میں ناول کا حصہ بنے ہیں مگر بڑی آسانی سے قاری کے فکری منطقے کو عالمی صورت حال تک بھی پہنچانے کا وصف رکھتے ہیں۔

ناول کا انتساب ''مادر وطن ہندستان کے نام'' کیا گیا ہے اور نیچے شعر درج ہے:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے ...... وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

یہ شعر ہی ناول کی روح ہے۔ اسماعیل ایک استعارہ ہے اس سماج کا جو آزادی کے بعد سے مسلسل منزل کی تلاش میں پل صراط سے گزر رہا ہے مگر دوسرا سرا دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ اس سفر میں اس کے دل و دماغ میں ایک محشر بپا ہے۔ وہ گرتا ہے، زخمی ہوتا ہے، مگر ہمت نہیں ہارتا۔ شکست کھا کر بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اسے وہ قرض اتارنے ہیں جو نہ ہوتے ہوئے بھی اس پہ واجب قرار دے دیئے گئے ہیں۔ دراصل گزشتہ نصف صدی کا عہد ہی قیامت جیسے انتشار اور افراط و تفریط کا ہے۔ اس عہد میں جنم لینے والی بیشتر ناہمواریاں مصنف کی نگاہ میں رہی ہیں اور وہ اپنے عہد کی ہر تصویر کا گواہ ہے۔ اس لئے سیاست، سماج، کرپشن، فساد، مذہب، فلسفہ اور عہد حاضر کے تمام تغیرات جب اس کے قلم کی زد میں آتے ہیں تو زندہ مناظر کی صورت سامنے سے گزرتے ہیں اور قاری کے لئے یہ مناظر صرف ماضی کی بازیافت نہ رہ کر موجودہ صورت حال اور اس کی معنویت کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ناول سے کہانی اخذ کرنا مقصود ہو تو وہ چند سطروں میں بیان کی جاسکتی ہے کہ اسماعیل مرچنٹ فسادات کے بعد دربدر بھٹکتا ہوا بالآخر جائے اماں کی تلاش میں 'بہار' پہنچتا ہے اور زندگی کی آزمائشوں سے جوجھتے ہوئے بم دھماکے کا شکار ہو جاتا ہے اور تقریباً یہی انجام اس کی اولاد کے ساتھ بھی پیش آتا ہے اور بس۔ مگر کہانی کے ساتھ ماضی قریب سے حال تک کا تہذیبی اور معاشرتی سفر کرنا ہو تو بات چند سطروں سے نہیں بنتی۔ پھر اس کا ہر صفحہ، اس کا ہر باب ایک نیا منظر

لئے سامنے آتا ہے اور آپ کو مٹی کی محبت میں قرض اتارنے والے آشفتہ سروں کا سامنا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس منظر نامہ کو پیش کرتے ہوئے مصنف کی نگاہ عہد حاضر کے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات پر رہی ہے، اس لئے گاؤں سے ممبئی جیسے شہر تک کے مناظر اس سفر کا حصہ بنے ہیں۔ ناول کے ابتدائی تین ابواب گویا قصہ کی تمہید کا درجہ رکھتے ہیں، جس میں اماوس کا اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور جس سے جوجھنے، لڑنے اور باہر نکلنے کی چھٹپٹاہٹ، بے چینی و اضطراب کی علامت۔ مگر یہیں سے کسی فلم کی سین کی طرح مناظر دامن پکڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ آیئے کچھ دور ہم بھی ان سچویشنز کا سامنا کریں۔

پہلا منظر۔ دربدر بھٹکتا ہوا اسماعیل جب بہار میں پناہ لیتا ہے تو اسے پٹنہ یونیورسٹی اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے۔ جہاں دوستوں میں ایک طرف فیضان رسول میرانی تو دوسری طرف انیل شرما۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بہار میں ایم۔وائی کی جوڑی سیاست میں دھوم مچا رہی ہے تھی۔ ایک دن انیل شرما اور شوبھا کی لو اسٹوری میں رقابت کی جنگ ہوتی ہے اور وہ گوالا کے بجائے اپنے دوست انیل شرما کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔

''اس سالے کو دیکھو، یہ میاں ہے سالا؟ یہ بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے؟ سالا بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے۔''

فیضان اُس وقت وہاں نہیں تھا، بعد میں پہنچا۔ اسماعیل نے تفصیل بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ اسماعیل پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔'

'اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ارے یار! وہ سالا عشق کا معاملہ ہے، اس میں تم بلاوجہ کود گئے۔''

''مگر وہ لڑکا بھومیہار بھومیہار کیا کر رہا تھا؟''

''وہ لڑکا گوالا ہے، بہار میں مسلمان گوالوں کے ساتھ ہیں اور گوالا بھومیہار کے خلاف ہے۔ اب تم گوالے کے خلاف جا کر اور بھومیہار کے ساتھ ہو کے لڑنے لگے تو اُس پر جھلاہٹ تو طاری ہونی ضروری تھی۔''

یہ ایک نیا منظر نامہ تھا اور اسماعیل کو جگہ جگہ اس کا سامنا کرنا پڑا۔'' (ص۔۹۴)

یہ وہ منظر نامہ ہے جسے بہار کی حالیہ سیاست میں مرکزیت حاصل تھی۔ مسلمان اقتدار میں حصہ داری کے نشے میں جھوم رہے تھے۔ کالج کے ریزلٹ سے نوکری تک گوالوں کی حصہ داری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے لئے جواز یہ دیا جا رہا تھا کہ جب تک برہمنوں، راجپوتوں اور بھومیہاروں کی چلی، گوالوں کو تیسرا درجہ بھی نہیں دیا گیا، اب موقع ملا ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھائیں؟ اور رہی مسلمان کی تو وہ اسی

میں خوش تھا کہ وزیر اعلیٰ اس کے بنائے کباب کھا رہے ہیں، بی جے پی کو کھری کھری سنا رہے ہیں اور خانقاہوں، مزاروں کی تقریبات میں ٹوپی پہن کر شریک ہو رہے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہ کر سکا کہ وہ ٹوپی پہن رہے ہیں یا پہنا رہے رہیں۔

دوسرا منظر: جو کاسٹ لائن گوالوں اور مقابل اعلیٰ ذات کے درمیان پیدا ہوئی تھی وہ بڑھتے ہوئے اس منزل تک پہنچ گئی کہ گوالہ گردی اور نکسل تحریک سے مقابلہ کے لئے سن لائٹ سینا، ایم سی سی اور گولڈن آرمی جیسی سینائیں وجود میں آ گئیں۔ اسماعیل فیضان رسول کے ساتھ 'میران بیگہ' کا سفر کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک اور دنیا آتی ہے جہاں ہندستان کی ۸۵ کروڑ جنتا دلت ٹولے میں ملتی ہے، شیو چرن سنگھ کا قتل چونکاتا ہے، ایم سی سی اور گولڈن آرمی میں پسماندہ بنام اعلیٰ نسب اقوام کا مقابلہ جنگ کی صورت اختیار کرتا ہے اور اس جنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے منہ میں زبان آ جاتی ہے جو صدیوں سے گونگے تھے۔ اور اس طرح اپنا ہندستان بدل رہا تھا:

> ''کمیونزم کے بارے میں وہ سنی سنائی باتیں افصح صاحب پر پٹخنے لگا تو وہ بولے، دیکھو، موجودہ منظر نامے کو تم صرف کمیونزم کے واسطے سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہندستان میں کچھ اور فکری دھارائیں بھی زیریں لہر کی طرح کام کر رہی ہیں، لوہیا جی نے سماجی انصاف پر جو تھیوری پیش کی ہے اس میں انہوں نے بہت صاف صاف لکھا ہے کہ ہندستان میں طبقاتی جدوجہد کو کاسٹ اوریئنٹڈ ہونا ہی پڑے گا۔''
>
> 'آپ کھلم کھلا ذات پات کی حمایت کر رہے ہیں۔ اسماعیل نے بہت زور سے بدک کر کہا۔ تس پر وہ ہنسے اور بولے۔' گاندھی میدان کے ایک بڑے جلسے میں جیپر کاش نرائن نے کھلے عام کہا تھا۔''سوال سماجی انصاف کا ہے، وہ جس راستے سے آ سکے، اسی راستے سے اُسے لانا چاہیے۔''

تیسرا منظر: سیاست جب رنگ بدلتی ہے تو اس کے اثرات دور پا اور دیر پا ہوتے ہیں۔ بہار کی سیاست نے جہاں سماج کو فکر سطح پر بدل دیا وہیں انتظامی سطح پر بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ساتویں باب میں ناول نگار نے مثال کے طور پر تعلیمی اداروں میں پیدا ہونے والی صورت حال کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ حکومت نے ۱۹۷۰ سے پہلے کے قائم کئے ہوئے کالجوں کو کنسٹی چوینٹ کرنے کا اعلان کر دیا تو ایک طرف انتظامی مسائل پیدا ہوئے اور دوسری طرف رشوت خوری، اقربا پروری کا بازار گرم ہو گیا۔ صلاحیت کی بجائے طاقت، غنڈہ گردی، پیسہ اور سیاست نے آگ پکڑ لی۔ پچھلے دروازے سے تقرری، فرسٹ

پوسٹ، سیکنڈ پوسٹ کی لڑائی میں رشوت دینے والے کی فتح تنخواہ میں کٹوتی کی تلوار، پروفیشنل کورسز کو بڑھاوا دے کر پیسہ اگاہی کا راستہ بنانا اور دھیرے دھیرے کالجوں سے علم کا غائب ہو جانا، اس منظر نامے کے اہم حصے ہیں:

> ''اُس رات اسماعیل کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ پہلی مرتبہ اُس کو اپنے پیشے سے اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ کیسی نوکری ہے جس میں غنڈہ بدمعاش جاہل لفنگا سب گھس جاتا ہے۔ اگر اسی طرح لکچرر پروفیسر بنا جا سکتا ہے تو اتنی محنت، اپنے سبجکٹ کے بارے میں حاصل کی جانے والی مہارت، برسہا برس سے دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر کے سارا شوق مار کر، کوڑی کوڑی بچا کر، اپنے سبجکٹ میں آنے والی نئی نئی کتابیں خریدنے کی اور گئی رات تک جاگ جاگ کر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب محنت کرنے والے گدھے ہوئے، ارون بھائیہ جیسے لوگ ہی عقلمند ہوئے نا، کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ آیا چوکھا۔'
>
> (ص۔۱۳۹)

چوتھا منظر: ہم عصر ہندستان کو ایک نئے رنگ میں رنگنے والا خوفناک واقعہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو وقوع پذیر ہوا جب بھیڑ جمع کر کے بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ یہ ایک زوردار جھٹکا تھا اُن لوگوں کے لئے جو ملک کی جمہوری قدروں کے امین تھے۔ مگر مصنف نے کمال فنکاری سے شہادت کا واقعہ بیان کرنے کے بجائے معاشرے کی فکری صورت حال پر توجہ دی ہے۔''ایسی فضا کو کیا کہا جائے جس میں حبس ہو نہ کشادہ ہو''۔ ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے جب یہ ثابت ہو جائے کہ کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔'' یہ جمہوریت ہے یا جمورے کا تماشہ؟۔ کسی نے اسے مسلمانوں کی بداعمالی کا نتیجہ قرار دیا تو کسی نے مذہبی منافرت کے شعلوں کو ہوا دی۔ بات آستھا، عقیدے سے ہوتی ہوئی مذہب اور تصوف تک پہنچ گئی مگر نتیجہ یہی نکلا کہ نجات۔۔ سیاست، مذہب، عقیدہ اور تصوف کے بجائے بھگتی اور تصوف کی آمیزش میں ہے جو بت پرستی اور خدا پرستی سے زیادہ انسان پرستی کی راہ دکھاتی ہے۔ اور جو کہتی ہے مجھ سے کہا جبریل جنوں نے، یہ بھی وحی الٰہی ہے مذہب تو بس مذہب دل ہے، باقی سب گمراہی ہے۔ مگر کسی کو یہ بات آسانی سے کب سمجھ آئی ہے۔ عام آدمی نہ تالا کھلوانے سے فکرمند ہوا اور نہ دیواروں کے ٹوٹنے سے متاثر ہوا، پن چکی چلتی رہتی ہے۔ اور لوگوں کے پاس اپنے مسائل کم ہیں کہ وہ پیٹ بھرے نیتاؤں، واعظوں اور مقرروں کی طرح مذہب، زبان اور تہذیب کے نام پر اپنی روٹی سینکیں؟ وقت کے ساتھ سب بھول گئے اور صورت حال یہ ہے کہ:

> '' عمارت گری پڑی ہے، کچھ لوگ تو دب کر مر ہی گئے، باقی گرتے ہوئے

> ملبے سے چوٹ کھا کر زخمی ہوئے، اور بہت سارے عمارت کے گرنے سے دُکھی ہوئے، کچھ زخمی ابھی تک کراہ رہے ہیں، بہتوں کا ہاتھ عمارت کے نیچے دبا ہے، کچھ کا پیر پھنسا ہے اور کچھ کی املا کتباہ ہو گئی ہیں۔ مگر صورت حال جیسی تھی ویسی ہی ہے کیوں کہ مالکان اصلی اور کاشت کاران اصلی دونوں کو کسی نے سمجھا دیا تھا کہ عمارت کے نیچے خزانہ دفن ہے۔ اس لئے دونوں ہی اس عمارت کی ملکیت کے دعوے دار ہیں اور وہ منہدم عمارت، عمارت کے درجے سے آگے بڑھ کر ماں بن گئی ہے۔ حیات اللہ انصاری کی 'آخری کوشش' والی ماں!''
>
> (ص۔۲۷۳)

پانچواں منظر: بہار میں انتخابات کا موسم بڑے برے موسم کے روپ میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرے صوبوں میں ہو سکتا ہے یہ صورت حال نہ ہو اور لوگ بخوشی الیکشن ڈیوٹی کرتے ہوں، مگر بہار میں یہ عذاب سمجھی جاتی ہے اور پرائمری اسکول سے کالج کے پروفیسر تک سب اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے جیسے بھی ممکن ہو اس ڈیوٹی سے نجات حاصل ہو جائے۔ غیر تدریسی ملازمین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سارے کام ٹیچروں سے ہی کروا لیے جائیں۔ ڈیوٹی سے نام کٹوانے سے انتخاب کے بعد ووٹوں کی گنتی تک جتنے مراحل ہیں وہ پل صراط سے کم نہیں۔ حسین الحق خود پروفیسر رہے ہیں، اور دوران ملازمت انہیں اس جہنم زار سے گزرنا پڑا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے الیکشن ڈیوٹی، ووٹ اور ملازمت کی مجبوریوں میں پھنسے ایک شریف انسان کی بے بسی، ذہنی کرب اور اذیت کو بڑے حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سیاست، ووٹ بینک اور بوتھ قبضے کے ذریعہ فتح حاصل کرنے کے سیاسی کھیل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ ایک منظر دیکھئے:

> ''اسکول کے باہر لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ہر پارٹی والے اپنے دو چار سورماؤں کے ساتھ موجود تھے۔ رکشہ والے عورتوں کو اور کبھی کبھی بوڑھوں کو بھی لے کر آتے اور اسکول سے ذرا دور پر اُتار کر پھر محلکیے اندر چلے جاتے۔ اسماعیل کو یاد آیا کہ پارٹی والوں کی طرف سے ووٹروں کو آنے جانے کی یا کسی قسم کی سہولت دینا اب الیکشن کمیشن کی طرف سے غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ مگر اسماعیل دیکھ رہا تھا کہ رکشے آ جا رہے تھے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا...... وہ ایک پولنگ ایجنٹ سے پرچی بنوانے لگا۔ اچانک اسکول کے اندر سے پہلے تڑاتڑ لاٹھی چلنے کی آواز آنے لگی، اور پھر ہوائی فائر ہوا۔''(ص۔۲۰۴)

بوتھ کیپچرنگ، قتل و غارت گری، گالی گلوج یہاں الیکشن کے لازمی عناصر ہیں جن کے درمیان عام انسان، شریف انسان خاموشی کے ساتھ پستا رہتا ہے۔ یہ منظر اشارہ ہے اُس صورت حال کا جس میں زباں بندی کا غیر اعلان شدہ حکم جاری ہو چکا ہے۔ آدمی کتابی، قانونی اور اصولی باتیں دماغ میں دہرا تو سکتا ہے، زبان پر ہرگز نہیں لا سکتا۔

> ''میں اسماعیل رضا ولد ابراہیم رضا بابری مسجد کے گرنے پر کچھ نہیں کر سکتا۔ شاہ بانو کیس کی بے معنویت پر اپنے ہم مذہبوں سے کوئی مکالمہ نہیں کر سکتا، الیکشن (ووٹ) دیتے ہوئے بلا وجہ گرفتار کر لینے پر اور دن بھر کے لئے حراست میں ڈال دینے پر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں اجماع چاہئے۔ بھیڑ، جاہلوں کی یا ایسے پڑھے لکھے لوگوں کی جنہیں جاہلوں کی بھیڑ پڑھا لکھا مان لے۔ یہاں ایک آدمی کی تنہا رائے کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے۔''
>
> (ص۔۲۰۶)

چھٹا منظر: یہ منظر وہ ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے کا حصہ بن چکا ہے۔ رشوت خوری، اقربا پروری اور فرقہ پرستی سرکاری دفتروں اور وہاں کی ہر فائل سے جونک کی طرح چمٹ کر رہ گئی ہے۔ گپتا جی ہوں یا یادو جی، سنگھ صاحب ہوں یا اسماعیل صاحب، سب اسی جونک کا شکار ہیں۔ دفتروں میں معمولی سی فائل بھی بغیر چائے پانی کی آگے نہیں کھسکتی۔ جسے چاہا اور جب چاہا، حکومت نے پروموشن دے دیا اور جب چاہا جسے چاہا ڈیموٹ کر دیا یا برطرف کر دیا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ مگر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ حکومت اور سیاست نے مداری اور اس کے کھیل کی شکل اختیار کر لی۔ کانگریس کی مخالفت کے بعد اقتدار کی ہوس نے جگلروں کو پیدا کیا جنہوں نے مذہب اور فرضی ہندو مسلم تہذیب و تشخص کا شوشہ چھوڑ کر تمام ہندستانیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا ایسا کھیل شروع کیا جس نے سماج میں ایک خوفناک اور بھیانک صورت حال پیدا کر دی۔ ایسے میں زندگی سے انسان کا سروکار صرف جینے کی حد تک رہ گیا اور وہ اسی میں مطمئن ہے کہ کم از کم غیر فطری موت سے تو دور ہے:

> ''سیماب نے اسی جوکھم کا ذکر کرتے ہوئے توفیق کی وہ بات بھی دہرائی تھی کہ ''اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا''۔ اور اس بات پر اسماعیل کو ممبئی کا وہ ملنگ
>
> ''سیماب نے اسی جوکھم کا ذکر کرتے ہوئے توفیق کی وہ بات بھی دہرائی تھی کہ ''اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا''۔ اور اس بات پر اسماعیل کو ممبئی کا وہ ملنگ دوست یاد

آیا،جس نے بہار لوٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''بہار ایک پرسکون صوبہ ہے۔وہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا۔کیا انسانی سروکار میں سب سے بڑا عنصر جینا ہے؟ پاگل،مفلوج اور مند بدھی والے بھی تو جیتے ہیں۔'' (ص۔۲۱۸)

اوراس مفلوج اور مند بدھی سماج میں اگر کوئی اپنا سروکار ذہن وفکر سے قائم کرتا ہے تو اسے اس قسم کے سوالات پریشان کرتے ہیں۔کیا زندگی کا مقصد صرف سانس لینا ہے؟ کیا انسان کی منزل صرف روٹی ہے؟ کیا کسی ایک ہی پھول سے باغ بن جاتا ہے؟ کیا آدمی کو رنگ برنگے پھولوں کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیا سچ مچ کسی ایک پھول اور خوشبو کے علاوہ باقی سارے پھول اور خوشبوئیں صرف باہر سے برآمد کی ہوئی ہیں؟ کیا اس رویے کے بغیر بھی جینے کی کوئی راہ ہے؟ مگر موجودہ صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے ایسے سوالوں سے جوجھنے والے ذہنوں کو قید کرلیا ہے۔

ساتواں منظر:اس منظر کے کئی شیڈز ہیں جو ہمارے معاشرے کی مذہبی،تعلیمی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔زوال روس کے اثرات،مذہبی جماعتوں کے فروغ اور مدارس کے دقیانوسی نظام تعلیم وغیرہ پہ مصنف نے نہ صرف بحث کی ہے بلکہ اس سے وابستہ قوم کی ذہنی ومعاشی پسماندگی سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔مدرسے میں عام طور پر غریب طبقہ تعلیم حاصل کرتا ہے،جو وہاں نہ جاتا تو پاکٹ ماری،چوری چکاری کرتا یا رکشہ چلاتا،بیڑی بناتا اور مزدوری کرتا۔یہاں خوش حال طبقے کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔صدیوں پہلے فٹ بال کا کھیل وہاں بچوں کی تفریح کا سامان تھا،وہ اب بھی بے ٹھیک ویسے ہی جیسے صدیوں سے ان کا نصاب تعلیم۔کرکٹ،بیڈمنٹن وغیرہ سے وہ اب تک کیوں متعارف نہ ہوسکے؟ بہار سے مہاراشٹر تک پورے ہندستان میں ایک ہی طرز تعلیم کیوں ہے؟ سالہا سال سے اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی گئی؟

''اسے درخت یاد آئے جو ہر سال اپنی چھال بدلتے ہیں،پرندے یاد آئے جو اپنے پر جھاڑتے ہیں،جاندار جسم یاد آیا جو اندر سے باہر تک لگاتار اپنے کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔مگر یہ لوگ؟ اسے شترمرغ یاد آیا،جو ریت میں سر چھپا کر سمجھتا ہے کہ طوفان ٹل گیا۔یا وہ مینڈک جو کنویں میں رہتا ہے اور کنویں کو ہی سمندر سمجھتا ہے۔'' (ص۔۲۴۴)

آٹھواں منظر: یہ منظر آج کا ہے جس میں نتیش مودی کی دوستی،سوشاسن بابو اور بی جے پی کی حکمت عملی،پردھان منتری کی آمد،گاندھی میدان کا بم دھماکہ،افضل گرو،جے این یو،موب لنچنگ،اخلاق کی موت اور وہ سب کچھ ہے جو ہماری زندگی،سماج اور ملک کے بدلتے منظرنامے کی علامت ہے۔۲۴ویں

باب سے ۳۳ویں باب یعنی اختتام تک ناول ہمیں اپنے آپ سے ملواتا ہے۔یعنی آج کے موجودہ منظرنامے سے جہاں پٹنہ،بہار اور ملک کی صورت بدل چکی ہے۔بے روزگاری منہ بائے کھڑی ہے،نوجوان باہر بھاگ رہے ہیں،فارورڈ بیک ورڈ اور ریزرویشن نے معاملہ اور پیچیدہ کردیا ہے،فرقہ وارانہ عصبیت شہر سے بڑھتے ہوئے گاؤں کی مسجد،خانقاہ اور قبرستانوں تک پہنچ گئی ہے،ذات پات کی لعنت نے غیرمسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے،نکسل مومنٹ میں پسماندہ مسلمان بھی شامل ہورہے ہیں اور بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب گاؤں میں ان کی میٹنگیں بھی ہورہی ہیں۔اور اس سب کے درمیان ایک نعرہ امید کی طرح شہرت حاصل کررہا تھا کہ اچھے دن آئیں گے۔مگر اچھے دن کے لئے جو راستہ اختیار کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ نعرہ عوام کے لئے نہیں خود کے لئے لگایا گیا تھا۔عوام کو تو اُس آگ میں جھونک دیا گیا جس کا شکار اسماعیل،فیضان،اخلاق اور جنید جیسے لوگ ہوئے۔

''گئو رکچھا......وندے ماترم......رام مندر......انہی آوازوں میں کچھ اور آوازیں گڈمڈ ہورہی تھیں۔۔۔اسلام واحد راہ نجات۔۔۔کافروں سے قتال کار ثواب......پھر فضاؤں میں جھنڈے لہراتے ہیں۔ہندوواہنی......بجرنگ دل......گئو رکچھا سمیتی......شیوسینا...... آر ایس ایس......جھنڈوں کے چیختے چلاتے رنگوں میں......بیچ بیچ سے کچھ مدھم ہم رنگ سر اٹھاتے...... مجلس اتحادالمسلمین......سیمی......انڈین مجاہدین......قیدار ایک طرف سے نظر چراتا تو دوسری سمت کچھ ایسا تھا جو راستہ روک کے کھڑا ہوجاتا......ہر طرف اونچی اونچی دیواریں......ہر دیوار پر جھنڈے......ہر دیوار کی ہر اینٹ سے گندا خونا چھلتا کودتا باہر آتا۔ (ص۔۲۶۹)

صورت حال پہلے بھی خراب ہوئی تھی مگر اُس زمانے میں خون خرابے کی نوبت کم آتی تھی،دلوں میں دیواریں قائم نہیں کی جاتی تھیں۔جنگ کے بعد بھی دل ملے رہتے تھے یہاں تک کہ رشتے داریاں قائم ہوجاتی تھیں۔ہولی،دیوالی سے مسلمان اور شب برات محرم سے ہندو الگ کب اور کیسے ہوگئے یہ کوئی محسوس نہ کرسکا۔صورت حال کے بھیانک پن میں اضافہ ہی ہوتا گیا،یہاں تک کہ تاریخ،تہذیب اور عشق کی ساری داستانیں بدل دی گئیں۔

مذکورہ بالا مناظر سے سب سے پہلے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے گذشتہ پچاس برسوں کے دوران ہمارے عہد اور معاشرے کو متاثر کرنے والی بیشتر ناہمواریوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔کبھی تجربے کی

صورت میں اور کبھی مشاہدے کا سہارا لے کر انہوں نے صوبہ بہار کے اُن چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جن کا تعلق ہمعصر علاقائی صورت حال سے تو ہوسکتا ہے،قومی یا عالمی تاریخ سے قطعی نہیں۔مثلاً کالجوں کا کنسٹی ٹیوینٹ ہونے کا معاملہ،رنجن یادو کا سیاسی عروج،کوچنگ کلاسز کا کھیل،بوتھ کیپچرنگ،الیکشن ڈیوٹی کی بوالعجبیاں اور شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی منتقلی وغیرہ۔مگر ناول محض ان واقعات کا بیان نہیں۔یہ مصنف کے گہرے سماجی،سیاسی اور تہذیبی شعور کا عکاس بھی ہے۔یہ اُس قوم کی داستان بھی ہے جو گذشتہ کئی دہائیوں سے نفرت،فرقہ پرستی اور دشمنی کا عذاب جھیل رہی ہے۔وہ عذاب جو اُس پر صدیوں سے شکلیں بدل بدل کر نازل ہوتا رہا ہے کیوں کہ محبت اور نفرت،ظلم اور رحم میں ازل سے جنگ جاری ہے،بس ان کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔تقسیم ہند کے بعد عذاب کی ایک اور صورت سامنے آئی اور اس نے محبت کرنے والوں کے لئے زمین تنگ کردی۔مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس صورت حال کو انہوں نے تاریخ کے بجائے فلسفے کی زبان دی ہے جو فکشن کو بڑا بناتی ہے اور بلیغ علامتوں،استعاروں اور اشاروں کے سہارے فلسفۂ حیات کی سفاکیوں اور نزاکتوں کو دل پذیر انداز میں پیش کرتی ہے۔

مرکزیت بہار اور مسلمان ہونے کے باوجود اس ناول کو علاقائی یا مخصوص معاشرے کا ناول نہیں کہا جاسکتا۔صرف اس لئے نہیں کہ اس میں بھیونڈی،ایودھیا اور ممبئی کا بھی ذکر ہے یا مرکزی کردار اسماعیل،فیضان،قیدار اور نائلہ ہیں۔ان کے ساتھ بہت سارے کردار اپنے تفاعل کے ساتھ موجود ہیں۔مبشر رجائی،میاں والا،بنسی دھر،رمیش،رکمنی،دلبیر سنگھ،انیل شرما،مجمدار،ٹوپو اور شوبھا وغیرہ سب کے سب ناول کا ناگزیر حصہ بن کر سامنے آتے ہیں۔اسماعیل،فیضان،قیدار اور نائلہ کے ساتھ ساتھ ان میں سے بھی اکثر اپنے فکر وعمل کے ذریعہ ایک اچھا ہندستان بنانے میں مصروف ہیں۔اس لئے یہ ہندستانی معاشرے اور معاشرت کا ناول ہے۔اس ہندستانی معاشرے کا جس کی معاشرت کو آزادی کے ستر سال کے بعد اس طرح بے جان کردیا گیا ہے کہ اس کی حالت منٹو کے افسانہ 'کھول دو' کی سکینہ جیسی ہوگئی ہے۔یہ دردناک مگر بلیغ علامتی منظر دیکھئے:

''وہ آیا،کھانا کھایا،دیر تک بلو فلم دیکھی،گندے گانے سنے اور اس کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔اس نے سکینہ کی طرح اپنا ازار بند کھول دیا۔یہ آزادئ وطن کے بعد کی سترویں رات تھی۔'' (ص۔۳۲۸)

اس معاشرے میں انسانوں کے انسان پر مسلط ہونے اور اقتدار پانے کا جنون ہے جس نے اسے وحشی بنادیا ہے۔وحشی انسان طبقاتی ٹکراؤ،مذہبی شدت پسندی اور تاجرانہ ذہنیت کا سہارا لے کر سماج پر

راکشش کی طرح حاوی ہوگیا ہے،جس کے نیچے انسانیت،عشق،دردمندی،محبت دبی کراہ رہی ہے۔

''اماوس میں خواب'' موضوع کے علاوہ اپنے بیانیہ کی وجہ سے بھی قابل توجہ ہے۔اس کا بیانیہ بہت عام،سپاٹ اور سادہ نہیں ہے۔کہیں شعری بیانیہ متاثر کرتا ہے تو کہیں استعاراتی اسلوب دامن دل کھینچتا ہے۔کبھی تجریدیت ملتی ہے تو کبھی سفاک حقیقت نگاری ہیجان پیدا کرتی ہے۔ناول کا اسلوب ابہام اور صراحت کا آمیزہ ہے۔شروع سے ہی ناول نگار دو متوازی بیان لے کر آگے بڑھتا ہے۔ایک بیان عشق کا ہے اور دوسرا تاریخ وسیاست کا۔کبھی ایک میں آگے بڑھتا ہے اور دوسرے میں پیچھے،کبھی ایک کو چھوڑتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔مگر وہ رکتا نہیں ہے۔کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو بات چھوٹ گئی وہ شاید ادھوری رہ گئی مگر دوسرے یا تیسرے باب میں جاکر اس کا سرا مل جاتا ہے اور بیانیہ کے ساتھ پلاٹ کا ادھورا پن بھی تکمیل کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔یہ بیان کا انوکھا انداز ہے جو مطالعے کے لئے ذہین قاری کا تقاضا کرتا ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھئے:

''اور پھر تمکنت جس نے مرنے سے پہلے خط لکھا تھا،مجھے کینسر ہوگیا ہے،میری کیموتھیراپی ہوئی ہے،میرے سب بال اڑ گئے ہیں......مجھے بھولنا چاہتے ہو تو ایک بار آکے دیکھ لو......کہتے ہیں پہلا پیار اور آخری پیار سانس ٹوٹنے تک ساتھ نباہتا ہے۔کانگریس ہندستانی مسلمانوں کا پہلا پیار ہے،کانگریس بھی جانتی ہے کہ ہندستانی مسلمان لاکھ بدکیں مگر جائیں گے کہاں۔انہیں بھی شاید یقین تھا کہ اسماعیل نامی شخص اُن سے چھٹ کر زندہ نہیں رہ سکے گا۔اور سچ بھی یہی تھا،وہ تو ساری زندگی ان کے ناز سہتا رہا۔غیر کانگریسیوں نے تو مسلمانوں کو کانگریس کی داشتہ تک کہہ دیا۔اور تمکنت؟ جو مرگئی۔اور پاکستان جو صرف مرا نہیں،اس کی لاش کو بیچ سے دو ٹکڑے کردیا گیا۔''
(ص۴۳)

مگر مکمل ناول اس ایک بیانیہ پر منحصر نہیں ہے۔واقعات جس صورتحال سے گذرتے ہیں،بیانیہ بھی اسی کے مطابق بدل جاتا ہے۔آزادی کے بعد سے بھیونڈی کے فسادات تک چونکہ اسماعیل فکری اور عملی دونوں اعتبار سے اضطراب،کشمکش اور بے یقینی کی صورت حال سے گزرتا ہے اس لیے بیانیہ بھی پیچیدہ اور پریشان کن ہے،مگر جیسے ہی اسماعیل پٹنہ پہنچ کر مطمئن ہوتا ہے بیانیہ بھی سادہ،پرسکون اور عام فہم ہو جاتا ہے۔شاید اسی لیے ناول کے ابتدائی ۵۷ صفحات سے گزرنا آسان نہیں،اور اگر اس سے گزر گئے تو پھر اسے چھوڑنا ممکن نہیں۔اسی طرح تمکنت،شوبھا اور نائلہ کے عشق کے مناظر بھی بیانیہ کے مختلف رنگ پیش

کرتے ہیں۔شعری بیانیہ کی ایک مثال دیکھئے......

''وہ آرہی ہیں......ایک وہم ساہوا......کہیں نظر نہیں آرہی تھیں مگر ایسا لگ رہاتھا کہ وہ آرہی ہیں۔برف یاروئی کے گالے سے تیار کی ہوئی فضا میں سنہرے گل بوٹے ٹکے ہوئے تھے اور جگنوؤں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم سارے میں جگمگاتے پھرو اور چاند نے منادی کی تھی کہ ابد الآباد تک میں اسفعا پر چاندنی بکھیروں گا اور غیب الغیب سے ایک فرمان جاری ہوا تھا کہ سورج اپنی تپش کو اس جلسے سے دور رکھے۔الٰہی یہ جلسہ کہاں ہورہا ہے،جہاں حوران بہشتی کا مجمع دف پر گاتا تھا۔چوں پردہ برافتد......چوں پردہ برافتد......اور پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا۔حریری پردوں کی نرم سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی،پردے ساکن نہیں تھے،مگر اُٹھ بھی نہیں جارہے تھے۔اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے،کچھ جھلملاتا بھی رہے،ایسے ستر پردوں کے پرے وہ ساعد سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور سرشار کیفیت میں مکیف ہوئیں کہ ماتھے پر ان کے شکنیں صف تشنگاں تھیں اور بھویں طلب کی آگ میں جل کر زلف زلیخا کی مانند سیاہ اور آنکھوں کی تپلی میں سیاہی تھی،سفیدی تھی،شفق تھی،ابر باراں تھا۔'' (ص۔۳۱)

اس ناول میں جہاں موجودہ زمانے کی حسیت یعنی روح عصر ہے وہیں وہیں بھرپور جذباتیت اور مادیت وروحانیت کے درمیان پھنسے ہوئے فرد کی چھٹپٹاہٹ بھی ہے۔اور ان دونوں کے درمیان سے ناول نگار کا مخصوص نقطۂ نظر سامنے آتا ہے کہ زندگی کو جذباتیت،حقیقت،عصریت،علیت،فلسفہ یا کسی قسم کے نظریے کی ضرورت نہیں۔اسے صرف ہم سفر کی ضرورت ہے جو عشق سے حاصل ہوتا ہے۔گویا عشق زندگی کی طرح اس ناول کا سرچشمہ ہے۔

آزادی کے بعد کا عرصہ واقعات وحادثات کے اعتبار سے ہنگامہ خیز رہا ہے۔ہر دن نیا سورج اور ہر شب نئی تاریکی کے ساتھ آئی ہے۔حسین الحق کا حوصلہ قابل قدر ہے کہ انہوں نے حالات کو نظر انداز کرنے کے بجائے اس کی سچائی سے ہمیں روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔مذہب،تصوف اور ترقی پسندی جیسے تمام نظریات وافکار کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے قاری کو جو دعوت فکر دی ہے وہ فوری طور پر اثر پذیر ہو یا نہ ہو،اسے غور وفکر پر ضرور مجبور کردیتی ہے۔اور اس لحاظ سے یہ ناول ہم عصر فکشن میں اپنا انفرادو امتیاز قائم کرلیتا ہے۔

اوپر جو مناظر پیش کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اور

شاید پورے ہندستان کا احاطہ کرتا ہے۔ناول نگار نے مالیگاؤں،بھیونڈی،دہلی،ممبئی اور پٹنہ کا ذکر کرکے اس کے کینوس کی وسعت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ازموں کا ٹکراؤ،ذات پات کی جنگ،مذہبی تفریق اور سیاسی ریشہ دوانیاں کسی ایک جگہ تک محدود بھی نہیں۔مگر ناول کا بڑا حصہ صوبہ بہار کی عکاسی کرتا ہے۔لالو پرساد کا عروج،کالجوں کے حالات،الیکشن کے مناظر،الیکشن ڈیوٹی کی دہشت،کالجوں میں ریگولر کلاسز کا نہ ہونا،کوچنگ کی طرف توجہ کا بڑھنا،پٹنہ کالج اور ساحلِ گنگا کے مناظر،دربھنگہ ہاؤس،کالی مندر اور پٹنہ کے مختلف علاقوں کا تفصیلی ذکر اور شعبۂ اردو کی منتقلی وغیرہ اس طرح ناول میں در آئے ہیں کہ بین الاقوامی تہذیب وفلسفہ یا کم از کم قومی تغیرات کے پس منظر میں لکھے گئے ناول کے کینوس کو کچھ حد تک محدود کردیتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ مقامیت آفاقیت میں پوری طرح تبدیل نہیں ہو پاتی اور پرسنل اُس طرح امپرسنل بن کر نہیں آپاتا جیسا حسین الحق کے ماقبل ناول 'فرات' میں سامنے آیا تھا۔مگر کسی بھی عہد کے تہذیبی،ثقافتی،مذہبی اور سیاسی مزاج کی تلاش کے لئے ارضی حوالہ تو ضروری ہے۔غالباً مصنف نے سہولت کے کے لئے اپنی دیکھی اور بھوگی ہوئی زمین کو منتخب کیا ہے۔اسی طرح روشنی سہائے اور قیدار بن اسماعیل کی یکجائی اس بات کا اشارہ ہوسکتی ہے کہ مصنف کی نظر میں ہندستان کے محفوظ وخوبصورت مستقبل کے لئے ہندو مسلمان کے درمیان محبت یا کم از کم رواداری کا رشتہ ہی راہ نجات ہے مگر نائلہ اور رمیش سے وابستہ میلوڈرامائی واقعات کی پیش کش کا جواز کیا ہے؟ نائلہ کا دردناک انجام بھی تو اسے نمونۂ عبرت نہیں بنا سکا۔شاید یہاں مصنف کا منشا یہ بتانا ہے کہ اس پرخطر راہ میں ہر مسافر قیدار بن اسماعیل اور روشنی سہائے ہو یہ ضروری نہیں۔

مختصر یہ کہ 'اماوس میں خواب' دور حاضر کا منفرد اور نمائندہ ناول کہا جائے گا کہ اس میں آزادی کے بعد سے آج تک کی ہر لحہ تغیر پذیر تہذیب،تحریک اور ہر طرح کے بے معنی تماشوں کا مکمل منظرنامہ تخلیقی انداز میں موجود ہے۔اس میں سیاست،مذہب،دانشوری،تصوف،نظریات اور جبر کی قید میں پھنسے آج کے انسان کی چھٹپٹاہٹ اور ہم عصر صورت حال کی وہ چلتی پھرتی تصویر پیش کی گئی ہے جسے ہم معاصر ہندستان کا استعارہ یا آئینہ کہہ سکتے ہیں۔

◆ ● ◆

Associate Professor
Department of Urdu
Patna University,
Patna800005

● عشرت ظہیر

حسین الحق کے افسانے کی پذیرائی

دی نیو پریس نیویارک(امریکہ)نے امیتابھ کمار کی Husband of a Fanatic نامی کتاب شائع کی ہے جو کہ مصنف کے ہندوپاک کی سیاحت کے دوران ان کے ذہن وقلب پر مرتسم ہونے والے حساس واقعات وواردات کی نادر اور دلکش بیان پر مشتمل ہے جس کی توضیح کتاب کے ٹائٹل پر لکھی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے:

A personal Journey Through India Pakistan Love and Hate Zero point

کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔اس کے دوسرے باب کے تحت صفحہ نمبر ۸۰ پر مصنف نے اردو کے معتبر اور ممتاز فکشن نگار حسین الحق کے شاہکار افسانہ ''نیو کی اینٹ'' کی توصیفی انداز میں تشریح کی ہے۔افسانہ کے مرکزی کردار سلامت اللہ کے فکروتردد اور تشویش وتذبذب کی کیفیت کو اپنی تحریر میں جذب کرتے ہوئے لکھا ہے''کیا چھ دسمبر آیا اور گیا؟ کیوں چھ دسمبر آتا ہے؟''مصنف نے حسین الحق کے تخلیق کردہ کردار کی ذہنی کیفیت اور اس کی سراسیمگی اور خوف کا اظہار کرتے ہوئے افسانے کے تھیم کو خوبصورتی کے ساتھ رقم کیا ہے۔مذکورہ کتاب میں حسین الحق کے افسانہ ''نیو کی اینٹ'' کی جس انداز میں پذیرائی ہوئی ہے یہ امر لائق تحسین بھی ہے اور باعثِ افتخار بھی کہ گویا اردو میں عالمی نہج اور معیار کو متاثر کرنے والے فکشن تخلیق کئے جارہے ہیں۔جہاں تک حسین الحق کے فکشن کا تعلق ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں فنکاری کو بطریق احسن بروئے کار لایا ہے۔وہاب اشرفی کہتے ہیں:''حسین الحق اپنے افسانوں میں منفی سلسلوں کو ایک وسیع اور شفاف آئینے کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔اب اپنی بصیرت ہے کون کیا دیکھ سکتا ہے اور کیا حاصل کرسکتا ہے۔''جی چاہتا ہے اس تناظر میں حسین الحق کے افسانوں پر تفصیلی گفتگو کی جائے مگر افسوس فی الحال یہ ممکن نہیں۔میری نظر میں ''عکس عکس''،''مردہ راؤاز''،''سد حیشور بابو حاضر ہوں''،''کہرا''،''گونگا بولنا چاہتا ہے''،''نیو کی اینٹ''،''ناگہانی''اور''اثاثہ''ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

◆ ● ◆

"MALAZ"
New Colony, New Karimgunj,Gaya-823001-823001(Bihar)
9801527481

● انتخاب

● حسین الحق

ناگہانی

بی بی عزت النساء اپنا کام جلدی جلدی نپٹانے میں مصروف تھیں۔

انہوں نے برتن مانجھتے مانجھتے ذرا دھڑ باہر کرکے دیکھا،شام بھاگی چلی آ رہی تھی اور ڈھیر سارا کام سر پر پڑا تھا۔دوپہر میں ذرا آنکھ کیا لگ گئی کہ سب اُلٹ پلٹ ہوگیا۔یاد آیا کہ برتن دھوکر صبح سے پڑا کپڑا ابھی دھونا ہے اور کپڑا ابھی پیشاب اور گندگی سے اٹا ہوا۔

بچے بڑے ہونے لگے تھے تو امید بندھی تھی کہ اب پوتڑے دھونے سے نجات مل جائے گی مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔شوہر کو فالج مار گیا،چلنے پھرنے سے معذور،بولنے کی کوشش کرتا تو بہ مشکل ''پانی''،''کھانا''نکل پاتا۔عام بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے،عزت النساء کا شوہر جلال الدین تو سخت بیماری میں مبتلا تھا۔وہ جب تک بھلا چنگا رہا تو اپنے نام کے مصداق ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی۔کیا گھر اور کیا محلہ مجال کیا کہ کوئی معاملہ اس کی مرضی کے خلاف ہوجائے اور وہ برداشت کرلے،تو تو میں میں سے گالی گلوج پر اُتر آتا مگر اپنی بات گرنے نہیں دیتا۔

عزت النساء بیاہ کر سسرال آئیں تو شروع شروع میں بڑی وحشت ہوئی،کس وحشی سے پالا پڑ گیا ہے؟ مگر بہن،بھابھی،سہیلی سبھی نے سمجھایا کہ زمیندارانہ مزاج ہے،بڑے گھر کا بگڑا نواب،کچھ دنوں برداشت کرلو۔آہستہ آہستہ اپنی محبت کی زنجیر میں ایسا باندھو کہ سب کس بل ڈھیلا ہوجائے۔عزت بی بی نے مشوروں کے مطابق اس کی بدسلوکی بلکہ وحشت کے مقابلے پر اپنا حسن سلوک نہیں بلکہ محبت آزمائی شروع کردی مگر جلال الدین کے اندر تو کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی،بستر پر بھی عزت النساء کے ساتھ صحبت بالجبر ہی کرتا تھا۔اس کا عام مزاج یہ تھا کہ جب عزت النساء مائل ہوتیں تو وہ کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کرلیتا جس کا اختتام عزت بی بی پر لاتوں گھونسوں سے ہی ہوتا اور پھر وہ بہت چین سے کروٹ بدل کر سو جاتا۔عزت النساء کی کیا مجال کہ ایسے وقت میں اس کو اپنی طرف مائل کر پاتیں۔پھر جب ان کی ماہواری کے دن آتے تو جلال الدین ان کی طرف رجوع ہوتا۔ظاہر ہے وہ ان چند دنوں میں نجات کی خواہاں رہتیں مگر وہی چند دن ان کی مصیبت کے دن بھی ہوتے۔ہر مہینے میں تقریباً ایک ہفتہ جلال الدین وحشی درندوں کی طرح نہیں بلکہ پاگلوں کی طرح انہیں نوچتا جھنجھوڑتا۔عزت النساء بچنا

چاہتیں مگر بچ نہیں پاتیں، اور پھر یہ بھی ہے کہ جن دنوں کا ذکر ہے وہی زمانہ تو عزت النساء کے بھی چڑھتے دریا کا زمانہ تھا۔ لاکھ نوچ کھسوٹ ہو، دو جسموں کا ٹکراؤ تو جذبات میں ہیجان پیدا ہونے کا سبب بنتا ہی ہے، سو بالآخر عزت النساء تھکان کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی مغلوب ہو کر آنکھیں بند کر کے پڑ جاتیں۔

ان کے تینوں بچے ان ہی دنوں کے آس پاس کی یادگار تھے۔

یہ سلسلہ شادی کے بعد تقریباً سات آٹھ سال چلا، بڑی بیٹی چھ سال کی تھی جب شوہر پر فالج کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ عزت النساء کو حیرت نہیں ہوئی۔ ایسے گرم مزاج آدمی کا بی پی ہائی ہوا تو حیرت کی کیا بات ہے؟ مگر بلڈ پریشر ہائی ہونے کی جو وجہ تھی اس نے صرف جلال الدین کو مفلوج نہیں کیا بلکہ پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا۔

اب وہی نہیں رہا جس پر میاں گودیں۔ زمینداری کے بل پر صرف جلال الدین کا غضب نہیں چلتا تھا، پورا گھر چلتا تھا۔ زمینداری گئی تو گھر کے سارے ہالی موالی بھی لیتی گئی اور بے زمینی سے گھبرا کر اس کے بھائی بھی دوسرے شہروں کو سدھار گئے۔ بعد میں خبر ملی کہ وہ انہی شہروں سے پاکستان روانہ ہو گئے۔ بچ گئے جلال الدین کے بوڑھے ماں باپ۔ وہ وقت کی مار زیادہ نہ سہہ سکے اور برس دو برس میں آگے پیچھے عدم آباد سدھارے۔ خود عزت النساء کے مائکے والے پہلے ہی پاکستان جا چکے تھے۔ عزت النساء کی کائنات بس تین بچے تھے اور فالج زدہ شوہر!

عزت النساء کے لئے زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔

اسی زمانے میں لالہ ہریہر پرشاد ان کے گھر آئے۔

لالہ ہریہر پرشاد جلال الدین کے خاندانی منشی لالہ بنسی دھر پرشاد کے چھوٹے بھائی تھے۔ بنسی دھر تھے تو جلال الدین کے ہم عمر، مگر کبھی جلال الدین کے سامنے بیٹھے نہیں دیکھے گئے۔ ڈیوڑھی پر جب آتے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہو۔ سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اُتار دیتے۔ دھوتی کھول کے لنگی بنا لیتے اور برآمدے میں پڑی بنچ پر چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ اب اگر ایک گھنٹہ اندر سے کوئی باہر نہیں نکلا تو اس سے لالہ بنسی دھر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کبھی خوش قسمتی سے اگر دس پندرہ منٹ بعد ہی اندر سے کوئی باہر آ گیا تو خبر ہو جاتی کہ لالہ آ گئے ہیں۔ مگر خبر ہونے پر بھی یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ میاں (جلال الدین) لالہ سے مل ہی لیں۔

لالہ کا کام تھا کہ آئیں اور بیٹھ جائیں اور جب جلال الدین کہہ دیں یا کہلوا دیں تب ہی لالہ جائیں۔ گھر کی ساری ضرورت، ہینگ، ہلدی سے کپڑے زیور تک لالہ ہی پوری کرتے۔ نہ کبھی لالہ نہ پیسہ مانگا نہ کسی

نے پیسہ دیا جلال الدین نے بھی کبھی حساب نہیں لیا۔ کتنا کھیت ہے، کتنا نقدی پر گیا۔ کتنے کی لالہ نے خود بوائی کرائی، کتنا رہن رکھا گیا، کتنا بیچا گیا...... یہ سارا معاملہ بنسی دھر کے ذمہ تھا۔ آخر تو وہ مختار عام تھے!

مگر جب زمینداری چلی گئی تو لالہ بھی کاہے کے مختار......؟

یاد آیا، باغ تو بچا ہو گا۔ مگر عزت النساء کس سے پوچھتیں۔ جلال الدین تو کہنے سننے کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ زندہ لاش نے کب کسی کو کچھ بتایا ہے۔ سوچا کہ لالہ بنسی دھر سے پوچھا جائے، مگر لالہ اب میسر کہاں تھے۔ ہر دن ڈیوڑھی پر حاضری لگانے والے لالہ کو دیکھے ہوئے پانچ چھ مہینے گزر چکے تھے۔ جلال الدین کے بیمار پڑنے کے بعد مہینے دو مہینے تک وہ پابندی سے نبھاتے رہے لیکن جب تمام ڈاکٹروں سے پوچھ پاچھ کر اطمینان کر لیا کہ یہ فالج اب موت کے ساتھ ہی جائے گا اور میاں اب کسی کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ لالہ کی آمد میں ناغہ پڑنے لگا۔

جب لالہ کو گئے مہینے پر مہینے گزرنے لگے اور گھر کا سامان بکنے کی باری آ گئی تو پہلی مرتبہ عزت النساء نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا۔ برقعہ پہن کر باہری پھاٹک پر پہنچیں تو اتفاق سے اسی وقت خاندانی کہار گھورن سامنے آ گیا۔

"مالکن، کہیں جانا ہے کیا؟"

لالہ بنسی دھر کے یہاں جانے کو سوچ رہی ہوں۔"

"آپ کاہے کو جائیں؟ ہم بلائے لاتے ہیں۔"

عزت النساء ہلکے سے ہنسیں۔

"زمانہ بدل چکا ہے گھورن۔ مجھے ہی جانا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے مالکن۔ آپ ڈیوڑھی پر ہی رہیں۔ ہم ابھی ڈولی لے کر آئے۔"

"رہنے دو، پیدل چلی جاؤں گی۔"

گھورن ڈنڈوت ہو کے گڑگڑانے لگا۔

"مالکن ایسا مت کیجئے۔ جب تک ہم جیوت ہیں یہ نہیں ہو گا۔"

عزت النساء ذرا آواز سے ہنسیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، ڈولی لے کر آؤ۔"

لالہ کے گھر عزت النساء پہنچیں تو گویا ایک خاموش سی ہلچل مچ گئی۔ گھورن نے پہنچتے ہی گوہار لگا دی تھی، "مالکن کے یہاں سے سواری آئی ہے۔" لالہ کی بوڑھی ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی خود باہر آ گئیں۔

"مالکن آپ؟"

"جی ہاں، سوچا کہ ذرا آپ کا گھر بھی دیکھ لوں۔"

عزت النساء نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا اور گھر پر ایک نگاہ ڈالی۔ ان کی اپنی حویلی سے بھی بڑی تھی ان کے منشی کی حویلی۔ چاروں طرف قد آدم چہار دیواری، احاطے کے اندر غلام گردش، دوسری طرف طویلہ، تیسری طرف گوشالہ، ایک کنارے پر چھوٹا سا مندر، مندر سے ذرا ہٹ کر اندرونی حصہ، دونوں حصوں کو جوڑتی ہوئی ایک مختصر سی برساتی۔ اسی برساتی کے راستے ماتا جی عزت النساء کو لئے لئے اندر چلی گئیں۔

مکان کے اندرونی حصے میں بڑے چھوٹے سب نظر آئے، سوا بنسی دھر کے۔

وہیں پہلی بار نظر آئے...... لالہ ہریہر پرشاد۔ سرخی مائل گورا رنگ، تیکھا ناک نقشہ، متناسب قد و قامت...... لالہ ہریہر پرشاد کی خوبصورتی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی تھی۔ اچانک سرسری طور پر عزت النساء نے سوچا...... یہ بنسی دھر سے چھوٹا ہے۔ مجھ سے برس دو برس بڑا ہو گا۔ جس وقت کا ذکر ہے اس وقت عزت النساء بتیس برس کی نہیں ہوئی تھیں۔

"لالہ بنسی دھر کہاں ہیں؟" کچھ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء نفس مطلب پر آ ہی گئیں۔

"ان کا حال احوال ہم سے نہ پوچھئے۔ اپنی کوکھ کا پیدا ایسا پرایا ہو جائے گا، ہم نے نہیں سوچا تھا۔ تین ماہ پہلے اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی چلے گئے۔ اگر ہریہر نہ ہوتا تو ہمیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔"

"ان کا پتہ؟" عزت النساء کو اپنی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کوئی خیر خبر نہیں بی بی۔ بس یہاں سے اتنا کہہ کر نکلے ہمیں اب اس شہر میں نہیں رہنا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔"

عزت النساء نے صاف محسوس کر لیا کہ ماتا جی بنسی دھر کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کرنی چاہتیں۔ عزت النساء یہ بھی سمجھ گئی اس کا مطلب کیا ہے اور یہی بات عزت النساء کا دل بیٹھانے والی تھی۔

"اچھا ماتا جی، میں چلتی ہوں۔"

گھر لوٹتے ہوئے ڈولی میں وہ جی بھر کے روئیں۔ اس درمیان انہیں کیا کیا نہ یاد آیا۔ بچپن کے دن، میکے کا آنگن، گھر کے پیچھے بغیچے میں لگے پھول، سکھی سہیلی، بچپنے کے ڈھیر سارے کھیل، رشتے کا ایک بھائی جو انہیں دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا اور وہ اس کے باؤلے پن پر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بھاگ جاتی تھیں۔ ڈولی میں بی بی نے کئی دہائیاں بتا ڈالیں۔

گھر پہنچیں تو سب اُلٹ پلٹ دکھائی دیا۔ شوہر بستر پر ہی گندگی پھیلا چکا تھا۔ بچے رو رہے تھے۔ بڑی

بیٹی اپنے جانتے سب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر باپ تو بہرحال اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ عزت النساء نے پہلے شوہر کی گندگی صاف کی، پھر بچوں کو سنبھالا، تب باورچی خانے کی طرف پلٹ کے تاک سکیں۔ باورچی خانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات سر پر آن کھڑی ہوئی۔ سب کو کھلا پلا کے وہ بستر پر گئیں تو دماغ اُڑ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ شوہر کا علاج تو دور کی بات، کھانے کپڑے کا انتظام مشکل ہو گیا تھا۔ نزدیک و دور نگاہ دوڑائی، کوئی بھی اس مصیبت کی گھڑی میں کام آنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک بھگدڑ رہے، ہا، میں مچی اور دوسری زمینداری کے خاتمے کے بعد۔ نزدیک و دور جس کے بارے میں سوچتیں تو یاد آتا کہ وہ تو پاکستان چلا گیا۔ انہیں لگا کہ اگر جلال الدین مفلوج نہ ہوتا تو شاید وہ بھی پاکستان ہی میں پائی جاتیں۔

گذشتہ چھ مہینوں میں کیا نہیں ہو گیا۔ انہوں نے سوچا، گھر کا سامان بکا۔ وہ بی بی سے استانی جی بن گئیں۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو لوگوں کے کپڑے اور بستر سینے لگیں، میلاد پڑھانے لگیں مگر بات تو پھر بھی نہیں بن پا رہی تھی۔ حکیم صاحب کہتے، مفلوج کو کبوتر کے گوشت کا عرق چاہیے۔ مولوی صاحب کی فیس باقی تھی۔ نیا سال شروع ہو گیا۔ نئے درجے کی کتاب کا مسئلہ۔ تنگی کیا نہائے، کیا نچوڑے۔ عزت النساء ایک دن کا انتظام کرتیں تو دوسرے دن کے لالے پڑ جاتے۔

بی بی عزت النساء کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ ان کا سر پھٹ جائے گا۔

ایسے ہی حالات تھے جب لالہ ہریہر پرشاد ان کے گھر آئے۔

پوس کا مہینہ جا رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی۔ اندھیرا اُمڈ گھمڈ کر عزت النساء کے گھر پر برس رہا تھا۔ دور دور تک کہرا پھیلا ہوا تھا۔ رات تھوڑی آگے بڑھی تھی۔ دروازہ بھی بند نہیں کیا گیا تھا کہ اچانک محسوس ہوا...... دروازے پر کوئی ہے۔

عزت النساء سمجھ نہیں پائیں۔ اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کون ہو سکتا ہے۔ مگر دروازے پر کسی کے ہونے کا گمان کم اور یقین زیادہ ہوا۔ انہوں نے لالٹین کی مدھم لو ذرا تیز کی اور بڑی بیٹی رقیہ کو ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھیں

لالٹین کی روشنی میں ہیولا نمایاں ہوا...... دروازے پر لالہ ہریہر پرشاد کھڑے تھے۔

"لالہ جی آپ؟"

لالہ ہریہر پرشاد دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے رہے۔

کچھ دیر تو وہ لالہ کو صرف دیکھتی رہیں۔ دراصل وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں...... مگر چند ہی لمحوں میں وہ سنبھل گئیں......

"لالہ جی.....رکئے گا.....ایک منٹ۔" کہتی ہوئی پلٹیں۔جلدی سے باہری بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔پکنے سے بچی اور گرد میں اٹی دو کرسیوں اور وہیں پر پڑے ٹیبل کو جلدی جلدی صاف کیا اور دروازے کی طرف لپکیں۔

"لالہ جی آیئے۔"

لالہ جی آہستہ چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔عزت النساء نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو لالہ جی نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور آہستہ سے بولے۔

"یہ نہیں ہوسکتا۔پہلے آپ بیٹھیں۔"عزت النساء مسکراتی ہوئی بیٹھ گئیں۔لالہ کے بیٹھنے کو 'نصف نشست' یا 'مودبانہ نشست' کہا جا سکتا ہے۔کچھ دیر دونوں کے درمیان خموشی کا صحرا پھیلا رہا۔عزت النساء نے محسوس کیا کہ لالہ پہل کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔

"آپ نے کیسے تکلیف کی؟"

"شرمندہ ہوں۔"لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔"پہلے ہی آنا چاہتا تھا،ہمت نہیں کر سکا۔آج ادھر سے گزر رہا تھا تو طبیعت بہت بے چین ہوگئی۔"

عزت النساء نے حیرت سے اسے دیکھا اور حیرت سے سنا بھی۔لالہ کے لہجے میں حزن اور اضطراب دونوں شامل تھے۔انہیں رشتے کا وہ بھائی یاد آ گیا جو اُن کے لئے بولایا بولایا پھرتا تھا۔شادی کے بعد وہ ایک مرتبہ ملا تھا اور بہت بوجھل لہجے میں پوچھا تھا۔

"بی بی کیسی ہیں آپ؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔"بعد کے دنوں میں اس کی آواز پھر گونجی تو انہیں ایسا لگا جیسے مرتا ہوا آدمی خدا حافظ کہہ رہا ہو اور عزت النساء اندر سے کانپ سی گئیں۔"لالہ کی آواز پر وہ ہاؤ کا کیوں یاد آ گیا؟"

لالہ اس دن تھوڑی ہی دیر بیٹھے۔اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور رخصت ہوگئے۔دو دن،چار دن،جب ہفتہ گزر گیا تو عزت بی بی جیسے لالہ کا آنا بھول سی گئیں۔ان کا ہر دن بغیر کسی وجہ اور سبب کے بسر ہوتا رہا۔

ایسے ہی بے سبب اور بے مصرف دنوں میں سے کسی ایک دن.....لالہ ہر بیر پرشاد دوبارہ آئے۔بیٹھتے ہی پوچھا۔

"بچے کہاں ہیں؟"

"سو گئے۔"عزت النساء نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا رقیہ بھی؟"

"نہیں،وہ پڑھ رہی ہوگی۔"

"ذرا تکلیف کر لیجئے۔اسے بلا یئے۔"

عزت النساء رقیہ کو بلا لائیں۔لالہ نے رقیہ کی ٹھوڑی چھو کر پیار کیا۔سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بغل میں رکھا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"بیٹا! آپ بھائی بہنوں کے لئے۔"رقیہ کا ہاتھ بے ساختہ پیکٹ کی طرف بڑھا۔پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ نیچے گرا دیا اور ماں کی طرف دیکھا۔

"لالہ جی! اس کی کیا ضرورت تھی؟"لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔

"بچوں کے لئے ہے۔راستے میں مٹھائی کی دکان نظر پڑ گئی تو جی چاہ گیا۔"

"لے لو بیٹا! تحفہ ٹھکراتے نہیں۔"کہتے کہتے اُن کی آنکھیں دھندلا گئیں۔یاد کرنا چاہا کہ بچوں نے مٹھائی کب کھائی تھی تو یاد نے ساتھ چھوڑ دیا۔

"چائے لے آؤ۔"رقیہ جانے لگی تو عزت النساء آہستہ سے بولیں۔

"اب رات زیادہ ہوگئی۔اس وقت تکلیف مت کیجئے۔"آواز لالہ جی تک تو پہنچ ہی گئی۔ان کے ہاتھ پھر سے جُڑ گئے تھے۔

"لالہ جی! اس گھر میں تو اس وقت سے محفل جمنی شروع ہوتی تھی۔"عزت النساء کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

اس موڑ سے عزت النساء لالہ ہر بیر پرشاد کے سامنے کھلنی شروع ہوئیں۔لالہ اب ہر دوسرے تیسرے دن آنے لگے اور جب آتے بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے۔

پھر ایک دن:لالہ آئے،کچھ دیر بیٹھے اور جلد ہی اُٹھ گئے۔چلنے لگے تو باہری دروازے پر پہنچ کر رکے،پلٹے اور ایک رومال دونوں ہاتھوں کے بیچ رکھ کر عزت النساء کی طرف بڑھایا۔انداز نذر پیش کرنے والا تھا اور لہجے میں التجا کا درد اور خوف شامل تھا۔

"انکار مت کیجئے گا۔"

عزت النساء کچھ سمجھ نہیں پائیں۔اندھیری رات،ہوا تیز،برشگال کا شور،کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبانی،ران آندھیوں میں کف دست کا سہارا کیا۔ان کے کچھ فیصلہ کرنے یا کہنے سے پہلے لالہ نے رومال ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

عزت النساء نے دروازہ بند کیا اور دروازے ہی سے ٹک کر کھڑی ہوگئیں۔رومال کھولا۔شروع

چاند کی رات تھی۔ چاند کی کم کم روشنی میں انہوں نے دیکھا...... سو سو کے پانچ نوٹ رومال میں باندھے گئے تھے۔ عزت النساء وہیں، جیسے تھونس کر بیٹھ گئیں اور پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

لالہ جی اس کے بعد دس پندرہ دن نہیں آئے۔ یہ عرصہ عزت النساء کے لئے بڑی بے چینی اور امتحان کا عرصہ تھا۔ گھر اپنی بدحالی کی انتہا پر تھا اور رومال میں بندھا پانچ سو روپیہ عزت النساء بی بی کی صندوقچی کے بالکل نچلے حصے میں پڑا ہاتھوں کے لمس کو ترس رہا تھا۔ اس درمیان کتنی مرتبہ بچے روئے، مچلے۔ بی بی کتنی مرتبہ اندر اندر ٹوٹیں، بکھریں، ان سے یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے ہی کئی بے پناہ لمحوں میں ان کی نگاہ شوہر کی طرف اٹھی اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ غصہ، نفرت، ترس، بیک وقت کئی جذبوں کی قید میں ہیں۔ ایسے بے پناہ لمحوں میں انہیں ایک ہی سول پریشان کرتا۔ "یہ تو اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے مگر میں نے اور بچوں نے کیا قصور کیا ہے؟"

کبھی کبھی عزت النساء تھک جاتیں، ٹوٹنے لگتیں، سوچتیں۔ "اب ایسا بھی کیا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ لالہ بنسی دھر مختار عام تھے، جو کچھ بکا ہوگا کیا اس کی خبر لالہ ہریہر کو نہ ہوگی؟ ہوسکتا ہے کہ ہریہر پرشاد نے بنسی دھر کو خبر کی ہو اور بنسی دھر ہی نے یہ پیسہ بھجوایا ہو۔" یہاں تک پہنچ کر وہ صندوقچی کی طرف دوڑتیں، مگر تالا کھولتے کھولتے خیال آتا، "ماتا جی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ بنسی دھر کی کوئی خبر نہیں، چھٹی پتری کے لئے کوئی پتہ نہیں۔ پھر لالہ ہریہر نے اس کو خبر کیسے کی ہوگی؟ تب یہ پیسہ؟"

عزت النساء ٹھٹھک جاتیں، پلو سے آنکھیں صاف کرتیں اور صندوقچی کے پاس سے ہٹ جاتیں۔

جیون تیرے رنگ ہزار، کبھی بادِ بہاراں، کبھی موجِ صرصر، کبھی اُمس، کبھی کھلی ہوا......"

عزت النساء کے لئے ان دنوں جینا مد و جزر میں گھرے آدمی کا اُب چُبھ کرنا تھا۔ کبھی کبھی عزت بی بی اپنے آپ سے پوچھتیں۔ "اس میں مد کہاں ہے عزت النساء......"

ایسے ہی بے تھاہ لمحوں میں لالہ ہریہر پرشاد نے ایک شام پھر دستک دی۔ کچھ ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء پوچھ ہی بیٹھیں۔

"لالہ بنسی دھر کی کوئی چٹھی پتری آئی؟"

"جی نہیں، ان کی کوئی خبر نہیں۔"

"اور آپ لوگوں نے کوئی خبر لی بھی نہیں؟"

"میں نے تو ارادہ کیا تھا لیکن ماتا جی آڑے آ گئیں۔"

"کیوں، ماتا جی کیوں؟"

اب چھوڑیے، جانے دیجئے۔ اس تفصیل میں نہ جائیے۔"

"لالہ جی! میرے لئے یہ تفصیل بہت ضروری ہے۔ کچھ بھی چھپائیے مت۔"

لالہ نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور بہت بوجھل لہجے میں بولے۔

"ماتا جی سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ تم جس جائیداد کے مختار عام ہو، اس میں جو بھی بچا ہے، وہ اصل مالک کو لوٹا دو۔"

عزت النساء کے پاس اب پوچھنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ سمجھ گئی تھیں کہ لالہ کیا چھپانا چاہ رہے تھے اور لالہ بھی سمجھ گئے تھے کہ بی بی کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ دونوں کے درمیان ترسیل کی کامیابی کا سانپ پھن کاڑھے کھڑا تھا اور کیچوے کی رفتار سے رینگتی رات دونوں کے گرد اپنا جال بہت آہستگی کے ساتھ مگر مضبوطی سے بُنتی جا رہی تھی۔ عزت النساء اس جال کو توڑنا چاہتی تھیں مگر وہ محسوس کر رہی تھیں کہ گھر پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے۔ انہیں لگا کہ وہ عورت کبھی رہی ہوں گی مگر اب وہ ایک مکھی ہیں جسے کسی دیو نے دیوار سے چپکا دیا ہے۔ انہوں نے غور سے لالہ ہریہر پرشاد کو دیکھا...... کیا وہ دیو یہی ہے؟...... لالہ کے چہرے پر فرشتوں کی معصومیت بکھری پڑی تھی۔ اچانک لالہ ہریہر پرشاد کھڑے ہو گئے۔

"میں چلتا ہوں۔"

"لالہ جی ایک منٹ!"

بی بی عزت النساء کے منھ سے بے ساختہ نکلا اور اچانک وہ بالکل بے خودی اٹھیں، تیزی سے اندر گئیں، صندوقچی سے پوٹلی نکالی اور اسی بے خود انداز میں تیز تیز قدموں سے چلتی، باہر بیٹھک میں آئیں اور پوٹلی لالہ کی طرف بڑھائی۔

"لالہ جی! آپ کی امانت۔" لالہ جی ایک منٹ تک، بس ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں روپوں کی پوٹلی تھی اور وہ ہاتھ لالہ جی کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ لالہ نے آہستہ سے وہ پوٹلی لی، جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دی، اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی آنکھوں سے لگا کر بغیر آواز کے زار و قطار رونے لگے۔ عزت النساء نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ لالہ کے آنسوؤں سے تر بتر ہوا جا رہا تھا۔

یہ ایک عجیب و غریب صورت حال تھی۔ ان چاہی، ان جانی ......عزت النساء نے چھپا کر صدیوں پر محیط لمحے کے تیز پُرشور دھارے کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو بچانا چاہا مگر انہیں محسوس ہوا کہ

عجیب ان دیکھا سا ایک تیز پُرشور دریا خود ان کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس بھیانک اور قیامت خیز لمحے میں وہ لڑکا انہیں پھر یاد آیا جس سے شادی کے بعد بس ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور جس کی آواز سمندر کی آخری تہوں سے آتی سنائی دی تھی۔ "بی بی! آپ کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔"

لالہ اس حال میں اندازاً دو تین منٹ بے خود سے رہے اور پھر تقریباً دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ اس رات عزت النساء پر رنگوں نے یلغار کی۔ لال، بلو، کاسنی، گلابی، فیروزی، چمپئی، زرد، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، آسمانی، دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرا...... رنگوں کی بھرمار تھی اور موسم سرد، دھند میں ڈوبا ہوا۔ پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا...... طوطا، مینا، بلبل، پپیہا، شیاما، کوئل، فاختہ، لعل، گوریا، ٹیٹری، مور، باز...... ساری رات وہ کسی پُرشور دریا میں اُب چُبھ کرتی رہیں۔ ساری رات تھپیڑے انہیں ایک تنکے کی طرح سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ بنائے رہے۔ ساری رات کوئی تھا جو انہیں دریا سے صحرا اور صحرا سے دریا کے درمیان گڑئے کی طرح اچھالتا رہا۔

آنکھ کھلی تو انہوں نے کالا رنگ، باز پرند، دریا کے بے پناہ تھپیڑے اور صحرا کی سلگتی دوپہر یاد رکھی۔ مگر اس دن ایک بات اور بھی ہوگئی۔ وہ نہا کر آئینے کے سامنے بال سنوارنے بیٹھیں تو اچانک اپنے آپ کو نظر آ گئیں اور انہیں حیرت ہوئی، وقت کے تھپیڑے ان کا آپا سراپا نہیں چھو پائے تھے۔ لمبے بال، سرخی مائل دودھیا رنگت، خوبصورت نقش و نگار...... بی بی عزت النساء کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی جس میں اپنے آپ سے شرمانے کا انداز نمایاں تھا۔

"بی بی! یہ بندے پہن لیجئے۔ بہت اچھی لگیں گی آپ۔" اچانک آئینے کے حکم پر برسوں پرانا، بھولا بسرا، وہ باؤلا رشتہ دار چھا گیا۔

"پاگل!" وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔

"آپ کو پتہ ہے؟ آپ ہنستے ہوئے، سر کو جھٹک کر، آگے کے بالوں کو جو پیچھے پھینکتی ہیں تو کائنات کی سانس رک جاتی ہے۔"

"اے بھاگو۔" عزت النساء کو یاد آیا...... انہوں نے اس باؤلے کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے اسے دوڑا دیا تھا۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام...... ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

پتہ نہیں کب کا سنا ہوا یہ شعر ان کے ذہن میں رینگ گیا۔ اور جیسے ہی ذہنی رو دوسرے مصرعے پر پہنچی تو آئینے کے حجم پر لالہ ہریہر پرشاد جھلملانے لگے۔

"لاحول ولا قوۃ!" عزت النساء ہڑبڑا کر آئینے کے پاس سے ہٹ گئیں۔ مگر ایک بات ضرور ہوئی۔ اس دن اس پوٹلی میں سے انہوں نے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور برقعہ پہن کر بازار روانہ ہو گئیں۔

دوسری بات یہ بھی عجیب ہوئی کہ انہیں لالہ ہریہر پرشاد یاد آنے لگے۔ خاص طور پر جب وہ جلال الدین کی گندگی صاف کر رہی ہوتیں تو جیسے ایک جھماکہ سا ہوتا...... گھٹنوں کے بل بیٹھا، ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر روتا ہوا ایک شخص...... ایک قد آور جوان رعنا!

وہ سر جھٹکتیں، ذہن کو دوسری طرف مرکوز کرتیں، مگر کوئی تھا جو لپ چھپ کرتا آتا رہتا، جاتا رہتا۔

اس مرتبہ لالہ لگ بھگ بیس دن بعد آئے۔

آئے بھی تو یوں کہ دستک نہیں دی۔ شام اور رات کے جھٹپٹے میں اندر داخل ہوئے اور دروازے کے اندرونی حصے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ عزت النساء باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ مگر کچھ عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر باہر نکلیں۔ سب حسب دستور تھا۔ جلال الدین اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ بچے لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہے تھے۔ چھوٹا بیٹا سو گیا تھا۔ انہیں اطمینان ہوا، اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ مگر دو چار منٹ بعد پھر انہیں کچھ معمول سے الگ محسوس ہوا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ دل بے کل کیوں ہے؟ پھر پتہ نہیں من میں کیا آیا۔ وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ذرا آگے بڑھیں...... پورا اندھیرا نہیں چھایا تھا...... دروازے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے پہچان گئیں...... لالہ چپ چاپ کھڑے تھے۔

"ارے آپ؟ کتنی دیر سے کھڑے ہیں؟ دستک کیوں نہیں دی؟"

"ہمت نہیں ہوئی۔" لالہ مری ہوئی آواز میں بولے۔

"آپ بھی لالہ جی......! کمال کے آدمی ہیں...... آئیے آئیے۔"

وہ پیچھے پیچھے باہری بیٹھک کی طرف آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

"میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ چولہے پر سبزی چڑھی ہوئی ہے۔" وہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکیں۔ جلدی سے انہوں نے چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھائی۔ طشتری میں اس دن بازار سے لایا ہوا ناشتہ رکھا اور پھر ایک ٹرے میں چائے، پانی اور ناشتے کی طشتری سجا کر باہری بیٹھک کی طرف بڑھیں۔

"ارے یہ کیا کیا آپ نے؟" لالہ ان کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"لالہ جی!" عزت النساء کی ہنسی میں اداسی بھی شامل تھی۔ "اس میں میری بہت تھوڑی سی محنت لگی ہے۔" انہوں نے 'صرف' پر زور دیا۔

''بی بی!'' لالہ ہاتھ جوڑ کر بولے۔''جو چاہے سزا دے لیجئے مگر آپ کا دل دکھانا میرا مقصد نہیں تھا''

عزت النساء مدتوں بعد پہلی مرتبہ آواز کے ساتھ ہنسیں۔ایک لمحے کے لئے انہیں لگا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔لالہ پہلی مرتبہ کچھ دیر تک رکے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ، پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النساء کے میکے کی طرف مڑا، اور یوں مڑا کہ خود انہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستانوں سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں۔وہ مائکے کے کمروں، دالانوں اور آنگنوں میں چوکڑیاں بھرتی رہیں۔بالا ریز سے گلی میں مداری کا تماشا دیکھتی رہیں۔باپ کی شفقت، ماں کی ممتا، بہنیں، بھابھیاں، سکھی سہیلیاں، محبت کرنے والے بھائی اور ہلکی ٹھنڈی پھوار کی طرح انگ انگ میں اُترتا اور سارے آپے سراپے کو شانت کرتا سمے......!

عزت النساء بولتی رہیں، اور لالہ بس ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز گونجی تو وہ چونک کر اُٹھیں۔

''ارے اتنا وقت ہو گیا؟'' لالہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''معاف کیجئے گا، میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا۔''

''نہیں لالہ! تم نے مدتوں بعد مجھ ابلا کو وقت کی قید سے آزادی دلائی۔'' عزت النساء نے سوچا مگر بولیں نہیں۔

لالہ کرسی سے اُٹھے، آہستہ سے چلتے ہوئے باہری دروازے تک آئے۔عزت النساء منتظر تھیں کہ وہ باہر جائیں تو دروازے کا قلابہ اب لگا ہی دیا جائے۔مگر لالہ ڈیوڑھی پر قدم رکھتے رکھتے رک گئے۔دو قدم پیچھے ہٹے اور بی بی کے بہت قریب آگئے۔بی بی نے حیرت سے انہیں محسوس کیا۔

''ایک بات کہوں؟'' لالہ کی آواز بہت بوجھل اور گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

''کہیے۔'' عزت النساء کی حیرت کا عرصہ ابھی مختصر نہیں ہوا تھا۔

''برا تو نہیں مانئے گا؟''

''اب تک آپ کی کسی بات کا برا مانا ہے؟''

''گھر آنے سے منع تو نہیں کر دیجئے گا؟''

''اور آتا کون ہے؟''

''عرض کروں؟''

''ارشاد فرمایئے۔''

''میں آپ کو......سورج کی روشنی میں......ایک مرتبہ......جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں؟ اس میں حرج کیا ہے؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔یہ صحیح ہے کہ میرے میکے اور سسرال دونوں طرف، میری خبر لینے والا یا میری گرفت کرنے والا کوئی بچا نہیں، سب پاکستان جا چکے۔اردگرد کے زیادہ مکانات شرنارتھیوں کو دے دیئے گئے۔یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے ملنے والوں میں جو لوگ بچے ہیں ان میں زیادہ تر سے، جلال الدین کے مزاج اور بدکلامی کے سبب دوری بلکہ دشمنی کا جو رشتہ قائم ہوا، وہ اب، جب ہم خود محتاج ہو چکے، بھلا دوستی میں کیوں بدلنے لگا۔اس کے باوجود نزدیک و دور کی گلیوں میں غریبوں کے کچھ گھر تو بچ ہی گئے ہیں۔ان کی بچیاں پڑھنے آتی ہیں۔کبھی کبھی بچیوں کی مائیں، بہنیں بھی دن رہتے ہی آتی ہیں۔ان سبھوں کو شرنارتھیوں سے ڈر لگتا ہے۔پھر میں آپ کو دن میں کیسے بلاؤں؟''

اچانک لالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ان کا منھ اوپر اُٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جُڑے ہوئے تھے۔

''بی بی! میں مر جاؤں گا...... مجھے تھوڑی سی سانس......تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔''

لالہ کی آواز کی سمٹنی میں آنسوؤں کی آمیزش کا احساس بہت طاقتور تھا۔

عزت النساء کو محسوس ہوا کہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا یہ آدمی لالہ ہریہر پرشاد نہیں ہے......یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔عزت النساء کا جی چاہا......پہلی مرتبہ جی چاہا کہ......

وہ بالکل بے خود ہو کر لالہ کے ماتھے کی طرف جھکیں......ان کے دونوں ہاتھ لالہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے بیتاب تھے......وہ کانپتی تھرتھراتی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتی محسوس ہو رہی تھیں۔گھٹنوں کے بل بیٹھے لالہ کی آنکھیں اس انداز میں بی بی عزت النساء کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے بی بی کا چہرہ نہ ہو، بادل کا وہ ٹکڑا ہو جسے برسات کو ترستا کسان حسرت سے تکتا ہے۔

بی بی کا لالہ کی طرف جھکتا چہرہ اور لالہ کی پیاسی آنکھیں......یہ منظر جھما جھم برستے اندھیرے نے دیکھا، ڈیوڑھی کی چاروں طرفوں نے دیکھا، آسمان کے اس ٹکڑے نے دیکھا، جس کا ناموجود شامیانہ دونوں پر تنا ہوا تھا۔

مگر پل بھر میں منظر بدل گیا......بی بی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتے جھکتے اچانک رک گئیں......پھر بڑی مشکل سے......لالہ کی طرف جھکتی ہوئی عزت النساء......آہستہ آہستہ کھڑی ہوئیں اور

رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

''لالہ! میرا جینا مشکل مت کیجئے۔میرے سر پر بڑا بوجھ ہے۔''

لالہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔عزت النساء کے آنسو لالہ کے ہاتھوں پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔لالہ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں کو ہونٹوں تک لائے، پھر ان پیاسے ہونٹوں نے بی بی کے آنسوؤں کو جیسے چوم لیا اور لالہ کی آواز قرن ہا قرن کی مسافت طے کرتی، عزت النساء تک پہنچتی محسوس ہوئی۔

''بی بی! مریں آپ کے دشمن۔آپ یہ سارا بوجھ تنہا کیوں اُٹھائیں؟''

''لالہ جی آپ جایئے۔اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔'' عزت النساء نے ہاتھ جوڑ لیا اور لالہ تڑپ گئے۔

''بس بی بی......بس......میں جاتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھے، پھر رک گئے۔آہستہ سے کہا۔

''اسے لیتی جایئے۔'' لالہ نے ایک پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے؟''

''مجھے اتنا تو یقین ہو گیا ہے کہ آپ میری شردھا ٹھکراتی نہیں ہیں۔'' لالہ کے لہجے میں ذرا سی شگفتگی تھی۔عزت النساء آہستہ سے مسکرائیں۔

''اچھا خدا حافظ!''

دروازے کا قلابہ لگا کر عزت النساء اس کمرے میں آئیں جس میں نہ شوہر تھا نہ بچے۔انہوں نے پیکٹ کھولا۔پیکٹ میں سب بچوں کے کپڑوں کے ساتھ ایک ساری بھی تھی، اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے۔اچانک عزت النساء کو یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ لالہ نے جو روپے دیئے تھے، اس پر ایک ماہ کی مدت گزر چکی۔

''خداوندا! میں کیا کروں؟'' عزت النساء آہستہ سے بڑبڑائیں۔

اس سوال کا جواب عزت النساء کو کبھی نہیں مل سکا۔البتہ لالہ ایک ہفتہ بعد پھر آئے۔عزت بی بی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹیں کہ وہ اندر آجائیں۔مگر لالہ خلاف توقع ڈیوڑھی پر ہی کھڑے رہے۔

''کھڑے کیوں ہیں؟ اندر کیوں نہیں آتے؟''

''نہیں، اندر نہیں آؤں گا۔یہ خط آپ پڑھ لیجئے گا۔'' لالہ نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔عزت النساء نے کمرے میں آکر لالٹین کی لو تیز کی۔

''میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں......آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں......مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے، وہ میں تاحیات کئے جاؤں گا۔اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے......مجھے بس تھوڑی سی سانس......تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے......لالہ ہریہر پرشاد

[''پیلی کوٹھی'' بائی پاس روڈ، پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان، موجود رہنے کا وقت......گیارہ بجے دن سے دو پہر دو بجے تک......بدھ اور اتوار]

دوسرے دن اتوار تھا۔

بی بی عزت النساء تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں۔وہ لالہ کی لائی ہوئی ساری پہنے ہوئی تھیں۔گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا، محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کر رہی تھی۔اسی دن، مغرب بعد، اس کے یہاں محفلِ میلاد شریف تھی۔میلاد شریف میں جانے کے لئے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح و زاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

بی بی عزت النساء روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں:

خدا کے قہر سے روزِ جزا، بچا لینا
بہت ہوں عاجز و ناچار یا رسول اللہؐ

- **یاد رفتگان**
- **محمد نعیم یاد**

میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا......منشایاد

کہتے ہیں یادیں دلوں میں بستی ہیں پر یہ بھی سچ ہے کہ دلوں میں یادیں انہی کی بستی ہیں جو دلوں کے قریب ہوتے ہیں۔ کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں اکثر اوقات آنکھیں آنسوؤں سے دھوتی رہتی ہیں، تا کہ کوئی گزرا ہوا لمحہ وقت کے گرد وغبار میں گم نہ ہو جائے۔ ایسے ہی اُردو اور پنجابی کے نامور افسانہ نگار واد یب منشایاد کے ساتھ جُڑی میری کچھ یادیں ہیں جو مجھے اپنے حصار میں لیے رکھتی ہیں۔

اُردو اُفق پہ منشایاد کا نام کسی بھی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء کو موضع ٹھٹھہ نشتر براستہ فاروق آباد، تحصیل وضلع شیخوپورہ (پنجاب) پاکستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا کا نام غلام محمد تھا جو ایک مشہور حکیم تھے۔ انہوں نے طب اپنے ماموں زاد حکیم مولاداد سے سیکھی۔ منشایاد کے دادا غلام محمد حکیم سے طب وحکمت منشایاد کے چچا محمد خلیل کو منتقل ہوگئی۔ منشایاد کے والد کا نام نذیر احمد تھا۔ نذیر احمد پہلے زراعت کے شعبے سے وابستہ رہے مگر بعد میں طب کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ کی والدہ کا نام بشیرہ بی بی بنت محمد اسمٰعیل تھا۔ بشیرہ بی بی ایک نیک اور پرہیزگار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی رکھتی تھیں۔ خاص طور پر پنجابی اُدب کا مطالعہ بہت دلچسپی سے کرتی تھیں۔ اپنے اُفسانوی مجموعہ ''شہر فسانہ'' کے حرفِ دوم میں منشایاد اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> والدین زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ ان کی تعلیم دینی اور مکتبی تھی۔
> ماں جی اور پھوپھی گھر کا کام کاج کرتے ہوئے اکثر بارہ ماہوں،
> دوہڑوں اور سی حرفیوں کے ابیات گنگناتی رہتیں رات کو گھر میں خوب
> محفل جمتی۔ (۱)

منشایاد کو شعر واُدب کا ماحول گھر ہی سے ملا۔ اگر یہ کہا جائے کہ منشایاد کو اُدب سے دلچسپی ماں جی سے ورثے میں ملی، تو غلط نہ ہوگا۔ منشایاد خود بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اسلم سراج الدین لکھتے ہیں کہ:

> منشایاد کے دو ماموں تھے جو اَب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بڑے غلام محمد، جو
> ان کی بہن زہرہ کے سسر اور شاعر بھانجے خلیق الرحمٰن کے دادا تھے، مذہبی

> سکالر اور شعر واُدب کا اچھا ذوق رکھنے والے بزرگ تھے۔ منشایاد کا خیال
> ہے کہ ان میں اَدبی ذوق والدہ کے توسط سے ننھیال کی طرف سے آیا۔ (۲)

منشایاد نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں گجیانہ میں حاصل کی۔ پھر آپ کے والد نے ماسٹر رحمت اللہ کے مشورے سے آپ کو ایم بی ہائی سکول نمبر ا حافظ آباد میں داخل کروایا۔ لیکن یہاں آپ کو دوبارہ پانچویں جماعت میں ہی داخلہ ملا، اور ۱۹۵۵ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان یہیں سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۵۷ء میں جی ایس ای رسول سے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ادیب فاضل کورس، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ ۱۹۶۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد ۶۷۔۱۹۶۵ء میں حشمت علی اسلامیہ کالج راولپنڈی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ پھر ۶ ۷۔۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پنجابی زبان میں پرائیویٹ طور پر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک آپ پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ بحالیات اور بعدازاں دارالحکومت کے ادارے (سی ڈی اے، اسلام آباد) میں بحیثیت سب انجینئر/اسسٹنٹ انجینئر/ایگزیکٹو انجینئر، کے عہدوں پر فائز رہے۔ پھر ۱۹۶۰ء تا ۱۹۹۷ء میں افسر تعلقات عامہ اور افسر اعلیٰ شکایات کے عہدوں پر اپنے فرائض سرانجام دینے کے بعد یہاں سے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

منشایاد نے اَدبی سفر کا آغاز کہانیوں کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی کیا۔ اور انھوں نے اپنا تخلص یاد رکھا۔ مگر دوست احباب کے سمجھانے پر شاعری کو ترک کرنے کا ارادہ کیا اور صرف کہانیوں اور نثری تخلیقات کی طرف توجہ دی۔ اس حوالے سے منشایاد ''شہر فسانہ'' کے حرفِ دوم میں یوں بیان کرتے ہیں:

> عنوان شباب میں ہر شخص آدھا شاعر تو ضرور ہوتا ہے۔ میں بھی تھا۔ شروع
> میں کہانیوں کے علاوہ شاعری بھی کرتا تھا۔ لیکن پھر چھوڑ دی...... کیوں؟ پہلی
> بات تو یہ کہ شاعری کے انسپائریشن کا ہونا ضروری ہے۔ ادھر یہ چاند جلد ہی
> غروب ہوگیا، اب اماوس میں کیا بجھائی دیتا۔ دوسری بات یہ کہ بعض رسالوں
> میں اس قسم کے اعلانات چھپتے دیکھے کہ مہربانی کر کے ہمیں نظمیں، غزلیں
> نہ بھجوائی جائیں ان کا ذخیرہ بہت ہوگیا ہے۔ ہمیں نثری تخلیقات کی ضرورت
> ہے۔ تیسرے یہ کہ شاعر تو پہلے ہی بہت تھے سوچا شاعری چھوڑ دی تو کچھ فرق
> نہ پڑے گا مگر نثر نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔ کیوں کہ کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں
> جو صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ (۳)

۱۹۵۵ء میں منشایاد کا پہلا افسانہ ''کنول'' کے عنوان سے رسالہ ''شمع'' لاہور میں شائع ہوا اس کے بعد ان کی درج ذیل تصانیف منظر عام پر آئیں ان کتب کو علمی وادبی حلقوں نے بہ نظر تحسین دیکھا:

بند مٹھی میں جگنو (۱۹۷۵ء)، ٹانواں ٹانواں تارا (پنجابی ناول) ۱۹۷۷ء، ماس اور مٹی ۱۹۸۰ء، خلا اندر خلا ۱۹۸۳ء، وقت اور سمندر ۱۹۸۴ء، وگدا پانی (پنجابی (شاہ مکھی اور گورمکھی) ۱۹۸۷ء، درخت آدمی ۱۹۹۰ء، دور کی آواز ۱۹۹۴ء، تماشا ۱۹۹۵ء، شہر فسانہ ۲۰۰۳ء، خواب سرائے ۲۰۰۵ء، انھاں کھوہ (گورمکھی) ۲۰۰۹ء، اک کنکر ٹھہرے پانی میں ۲۰۱۰ء، منشائیے (شگفتہ تحریریں) ۲۰۱۱ء اور راہیں ۲۰۱۳ء۔ علاوہ اَزیں منشایاد اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب ''یادیں'' بھی تحریر کر رہے تھے۔ مگر بوجہ رحلت وہ اس کو مکمل نہ کر سکے۔ اُردو ناول ''راہیں'' بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوا جس کا حرفِ آغاز ان کی بیگم فرحت نسیم نے تحریر کیا۔

منشایاد نے اسلام آباد میں پہلی اَدبی تنظیم حلقہ اَربابِ ذوق کی بنیاد رکھی، دسمبر ۱۹۷۲ء میں حلقہ اَربابِ ذوق اسلام آباد کی ایک ادبی حوالے سے انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ (htt://halqaone2.tripad.com.1) بنائی اور اسے ہر ہفتے کی ادبی کاروائی بمع تصاویر کے ساتھ اَپ ڈیٹ کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام آباد میں لکھنے والوں کی انجمن، بزم کتاب، رابطہ اور فکشن فورم جیسی اہم تنظیمیں قائم کیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسلام آباد میں حلقہ اَربابِ ذوق اور دیگر اَدبی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے مختلف اخبارات میں کالم نگاری اور ادبی رپورٹس لکھتے رہے اسلام آباد کے مختلف نمائندہ اخبارات تعمیر، نوائے وقت، مشرق، جنگ اور ہمدرد اسلام آباد کے ادبی صفحات میں آپ نے بھرپور طبع آزمائی کی۔

منشایاد نے اپنے قلم کے ذریعے معاشرے کے مسائل کو چھوا، محسوس کیا، خود پر طاری کیا اور اسے کہانی کی شکل میں ہمارے سامنے لائے۔ آپ نے اپنے دیہات کی سوندھی مٹی سے اپنی محبت کا اظہار اَفسانوں کی صورت میں کیا۔ منشایاد کو اپنے عہد کے اَفسانہ نگاروں میں یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ انھوں نے دیہات کی عکاسی میں فکر کے ساتھ فن کے تجربے بھی کیے ہیں۔ چونکہ وہ خود دیہات سے تعلق رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سادہ دل دیہاتیوں کے غم اور خوشی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے اَفسانوں میں سادہ لوح دیہاتی اور ان کی بےلوث زندگی، خلوص، مہمان نوازی، رسم ورواج، غم، خوشیاں، دوستیاں، دشمنیاں، خودداری کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا اور قاری کے سامنے دیہاتی زندگی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ گھومنے لگتی ہے۔ آپ نے دیگر جدید اَفسانہ نگاروں کے برعکس گمبھیر اور گہری علامتوں کے بجائے ہلکی پھلکی علامتوں اور استعاروں کا استعمال کیا۔ منشایاد

جہاں روایت سے جڑے ہوئے ہیں وہیں وہ روایت میں نیا پن پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اَفسانے جہاں کلاسیکی طرز لیے ہوئے ہیں وہیں جدت کی ہم آہنگی کلاسیکی انداز کو ایک نئے معنی عطا کر رہی ہے۔

منشایاد اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ تمام ملنے والوں سے اخلاق اور اخلاص سے بھرپور برتاؤ کرنا ان کا شیوہ تھا جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا وہ ان کی وضع داری اور حسن سلوک کا شیدائی ہو جاتا تھا۔ ۱۰ مئی ۲۰۱۰ء کو راقم کی منشایاد سے پہلی ملاقات ہوئی۔ انٹرنیٹ پہ جناب منشایاد کا ٹیلی فون نمبر ڈھونڈا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ان سے بات کی۔ دل میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اتنے بڑے آدمی مجھ ناچیز سے نہ جانے کیسے بات کرتے ہیں، میں نے فون پہ ملاقات کی درخواست کی تو کہنے لگے ''جب بھی اسلام آباد آنا ہو تو مجھے بتا دینا ملاقات ضرور کریں گے۔'' آپ کے محبت بھرے لہجے نے ملاقات کے اشتیاق کو مزید بڑھا دیا، اس لیے پہلی فرصت میں خوشاب کی مشہور سوغات ڈھوڈا لے کر آپ کی خدمت میں جا پہنچا۔ ٹیکسی پہ جب میں آپ کے گھر پہنچا تو آپ باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ گیٹ کے باہر نیم پلیٹ پہ ''افسانہ منزل'' لکھا دیکھ کر آپ کی افسانے سے محبت نظر آ رہی تھی۔ اندر بیٹھے تو رسمی سا تعارف کرواتے ہوئے میں نے کہا ''سر میں خوشاب سے احمد ندیم قاسمی اور واصف علی واصف کی سرزمین سے، یہ آپ کے لیے خوشاب کا ڈھوڈا لایا ہوں'' چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری پھر خلا میں جھانکتے ہوئے بولے ''ہاں مجھے تم سے اُن کی خوشبو آ رہی تھی۔''

چائے کے ساتھ گپ شپ رہی۔ میری زیادہ تر گفتگو کا موضوع ان کا مشہور ڈراما ''راہیں'' تھا۔ اُن دنوں وہ پنجابی ناول ''ٹانواں ٹانواں تارا'' کو اُردو میں ڈھال رہے تھے۔ ان کی اسسٹنٹ کمپیوٹر پہ کمپوز کر رہی تھی مگر میں نے منشایاد کے اندر کمپیوٹر پہ کام کے حوالے سے زیادہ دلچسپی دیکھی جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اپنے علاقے میں کمپیوٹر ٹریز رہ چکا ہوں تو وہ مجھ سے کمپیوٹر کے حوالے سے کئی باتیں پوچھنے لگے۔ ان کا شوق اور دلچسپی مجھے ان کی شخصیت سے مزید متاثر کر رہی تھی۔ اس ملاقات میں منشایاد نے مجھے اپنا مجموعہ ''شہر فسانہ'' اپنے دستخط کر کے دیا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ واپسی کے سفر میں سارے رستے میں اپنی قسمت کو داد دیتا رہا۔ اس کے بعد جب بھی اسلام آباد کا چکر لگتا میری کوشش ہوتی ان سے ملاقات ضرور کروں۔ اگر وہ مصروف ہوتے تو فون پہ بتا دیتے۔ ایک دن ان کو نیشنل بک فاؤنڈیشن جانا تھا اور میں اس دن اسلام آباد تھا۔ میں نے ملنے کی درخواست کی تو انھوں نے بتایا کہ وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن سے فارغ ہو کر مطلع کر دیں گے۔ مجھے کسی کام کی وجہ سے واپس جلد آنا پڑا جب میں ابھی راستے میں ہی تھا تو انھوں نے اپنے موبائل سے مجھے کال کی کہ میں اب فارغ تھا تو آپ ملنے آ سکتے ہیں۔ میں نے معذرت کی تو بڑے پیار سے کہنے لگے چلو کوئی بات نہیں پھر کبھی سہی۔

محبت بھرے اس تعلق کو ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ۱۵۔اکتوبر ۲۰۱۱ء کو ایک دوست کی فون کال آئی کہ ٹی وی پہ خبر آئی ہے کہ منشایاد اسلام آباد میں انتقال کر گئے ہیں۔یہ خبر سن کر شدید صدمے سے دوچار ہوا۔بار بار ان کا محبت بھرا چہرہ سامنے آجاتا۔دل اُن کے جانے کو تسلیم ہی نہ کرتا۔اُن کی ذات میرے لیے سایہ پدری کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے آج تک کبھی خود کو اُن کی ذات سے الگ نہیں کر پایا۔ممتاز مفتی نے الکھ نگری میں قدرت اللہ شہاب کی وفات پہ لکھا تھا کہ مرنے کے بعد بھی شہاب نے مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا۔اُلٹا وفات کے بعد وہ میرے اندر رَچ بس گیا ہے۔میرے اور قریب آگیا ہے کہ قدرت اللہ زندگی میں مجھ سے ملا،یہ میرے اللہ کی مجھ پر سب سے بڑی کرم نوازی ہے کہ وفات کے بعد بھی اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔"

میں سمجھتا ہوں کہ ممتاز مفتی کے لیے جو شہاب تھے وہ میرے لیے منشایاد تھے۔۲۰۱۱ء سے لے کر آج تک کبھی یہ نہیں ہوا کہ کبھی وہ مجھ سے جدا ہوئے ہوں۔یہی وجہ ہے کہ ۵ ستمبر کو جب افسانہ منزل اسلام آباد،راولپنڈی،لاہور اور دیگر بڑے شہروں کی اَدبی تنظیموں کے تحت منشایاد کا یومِ پیدائش منایا جا رہا ہوتا ہے وہیں ضلع خوشاب کے چھوٹے سے شہر جوہرآباد میں بھی اُن کی سالگرہ کا کیک کاٹا جا رہا ہوتا ہے۔یہ سب کی اُن کی عطا کی گئی محبت کا اثر تھا کہ ۱۰ مئی ۲۰۱۰ء کو افسانہ منزل پہ جانے والا حافظ محمد نعیم عباس تھا مگر وہاں سے واپس آنے والا نعیم یاؔد تھا۔صاحبو میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں۔

حوالہ جات:

(۱)منشایاد،شہر فسانہ،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۳ء،ص ۱۱
(۲)اسلم سراج الدین،منشایاد،شخصیت اورفن،اکادمی ادبیات پاکستان ،اسلام آباد،۲۰۱۰ء،ص ۲۸
(۳)اسلم سراج الدین،منشایاد،شخصیت اورفن،ص ۱۵

«●»

Dastan Manzil
Street No:: 6
Nasim Colony
Jauharabad
Dist: Khoshab
(Pakistan)
03137716609

● **تنویر اختر رومانی**

شریف طینت افسانہ نگار......نیاز اختر

۱۹۱۳ء میں جب نیاز اختر کا پہلا مجموعہ"بوڑھے برگد کا انت"طباعت کے لئے جانے والا تھا تو میں نے ان کے افسانوں پر ایک بہت ہی مختصر رائے دی تھی:

"نیاز اختر کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے معاشرے کا مطالعہ بڑی سچائی سے اور مشاہدہ بہت گہرائی سے کر رکھا ہے۔"

دراصل اس وقت میں نے نیاز کے محض دو تین ہی افسانے پڑھے تھے۔اور ان دو تین افسانوں نے مجھ پر جو اثرات ثبت کئے تھے،ان کا اظہار میں نے دیانت داری سے کر دیا تھا۔اب جبکہ میں نے ان کے مذکورہ مجموعے کے تمام چھبیس افسانوں کا مطالعہ کر لیا ہے،تب بھی میں اپنی اس رائے پر قائم ہوں۔

نیاز اختر ایک شریف النفس اور نیک طینت شخص ہیں،اور ایسے شخص کا ایک بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ سچ بولتا ہے،صدق بیانی کرتا ہے۔خواہ اس کا معاملہ ذاتی ہو یا ادبی۔جب میں کہتا ہوں کہ انہوں نے معاشرے کا مطالعہ بڑی سچائی سے کر رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے جس طبقے پر کسی افسانے کا تانا بانا بُنا ہے،پہلے اس کا گہرا مطالعہ ایک ایماندار افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا،تب اپنے اس مطالعے کو افسانے میں منطقی انجام تک پہنچایا ہے۔یوں ہی بس اپنے تخیل و تصور پر افسانہ نہیں گڑھ دیا ہے۔میرے اس دعوے کی بیّن مثالیں ہیں:گدھ،رنتھی،اپرنٹس،ٹرمینیٹر،بوڑھے برگد کا انت،چھوٹی بہو،ہڑتال وغیرہ۔

نیاز کے افسانوں کے قارئین میں سے شاید ہی کسی کو یہ بات معلوم ہوگی کہ"گدھ" لکھنے سے قبل انہوں نے تقریباً دو برس تک پارسی طبقے کی معاشرتی،مذہبی اور عائلی زندگی کا مطالعہ کیا اور جب انہیں اس معاملے میں شرح صدر حاصل ہو گیا تب کہیں جا کر افسانہ لکھا،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے افسانوی ذخیرے میں ایک قابلِ قدر،قابلِ ذکر افسانے کا اضافہ ہوا۔ایسا ہی کچھ معاملہ رنتھی،ٹرمینیٹر اور بوڑھے برگد کا انت کو منصۂ شہود پر لانے سے پہلے ہوا۔

اور جب میں کہتا ہوں کہ انہوں نے معاشرے کا مشاہدہ بہت گہرائی سے کر رکھا ہے تو میرے وہ احساسات ہیں،جو ان کے افسانوں کی قرأت سے میرے اندرون میں جاگزیں ہوتے ہیں۔نیاز اپنے بیشتر افسانوں میں اس امر کا التزام کرتے ہیں کہ جس موضوع پر قلم اٹھانا ہو تو اس کے ایک ایک پہلو،ایک

ایک جزو،افسانے کے مثبت و منفی نتائج پر اپنے گہرے مشاہدات کی چھاپ چھوڑتے ہیں۔

نیاز اپنی ذات میں جتنے سیدھے سادے ہیں،ان کے افسانوں کا اسلوب بھی اتنا ہی سیدھا سادہ ہے،تحریر میں بے جا تصنع نہیں ہے،افسانوی رنگ آمیزی کا فقدان ہے۔ان کے اسلوب کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے،جس سے ان کی تحریر کی شناخت ہو سکے۔ہاں،اس سادہ اسلوب میں کبھی کبھی بات پُر کار کر جاتے ہیں،جو دل کو چھوتے ہیں۔

"کیا ہوگا،تم کو معلوم نہیں؟اب تین طرف سے کارخانہ ہو گیا۔پیچھے والے سے سفید دھواں نکلتا ہے،دائیں بازو والے سے کالا۔" (گدھ)

"کہتے ہیں کہ اگر خدا کو دیکھنا ہو تو کسی اسپتال میں مریض کے بیڈ کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔" (رنتھی)

"اسے لگا کہ بیج کی طرح اس کے وہ سارے سپنے بھی اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئے جن سے نئی کونپلیں نکلنے والی تھیں۔اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں کے آگے ان کسانوں کے چہرے جھلملانے لگے جنہوں نے خودکشی کر لی تھی اور ان کے بیچ سے جھانکتی ہوئی ان کی بیوی کی سونی کلائیاں۔" (ٹرمینیٹر)

"تبھی میں نے اپنی بیوی روبینہ کو آواز دی۔

"ڈارلنگ،دیکھو نہ تتلی کمرے میں آگئی ہے،کتنی خوشنما ہے۔"

"ارے پروالی ہے یا پرکٹی؟"روبینہ نے کچن سے ہی سیدھے مجھ پر وار کر دیا۔

"ارے بھاگیہ وان،پروالی تتلی ہے۔عمر کے اس پڑاؤ پر کوئی احمق پرکٹی تتلی مجھ پر مہربان ہوگی؟"میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تم مردوں کا کیا ٹھکانہ؟عمر کے کسی پڑاؤ پر کبھی بھی تم مرد کچھ بھی کر سکتے ہو،مسٹر گل کو کیا ضرورت تھی دیول بجاج کی کمر پر ہاتھ رکھنے کی؟اور پھر نٹراجن کو ہی لو،سارا ملک اور ساری دنیا اس کے بدنما کارنامے پر تھو تھو کر رہی ہے۔" (حقیقت)

بہت خوب!شریکِ حیات کے ساتھ ایسی چُہل بھری باتیں،خوبصورت مکالمے افسانے کے حسن میں نہ صرف اضافہ کرتے ہیں بلکہ قارئین کو ذہنی حظ بھی عطا کرتے ہیں۔ان مکالموں کے بین السطور میں درج واقعات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف باریک بینی سے معاشرے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

نیاز اختر اس الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد کے قارئین کے مزاج اور رجحانات کا کماحقہٗ درک

رکھتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ فی زمانہ اردو کے قارئین طویل افسانے پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ وہ مختصر افسانے (Short Story) کو مختصر ہی رکھتے ہیں۔مجموعے کے چھبیس افسانوں کی طوالت کا گراف کچھ اس طرح ہے۔

رنتھی،چھوٹی بہو،ڈوبتا سورج = ۷رصفحات،گرتوں کو تھام لے ساقی،سنبھالا،گرہن = ۶رصفحات گدھ،اپرینٹس،بوڑھے برگد کا انت،دل کی پھانس،قاتل مسیحا = ۵رصفحات،اپنی اپنی صلیب،رفو میاں،کھرنڈ،ہڑتال،داغ داغ اجالا،نروان،ہوئے تم دوست جس کے =۴رصفحات،ٹرمینیٹر،حقیقت،مراجعت،تپتی زندگی = ۳رصفحات،افعی،روح کا سفر = ۲رصفحات،آزادی=محض ڈیڑھ صفحات پر مشتمل ہے۔

گویا مجموعے کے جو تین طویل افسانے ہیں،وہ بھی کتاب کے سات صفحات سے زاید نہیں ہے۔اختصار میں افسانے کا تانا بانا مکمل کر لینا بھی ایک فن ہے،بناضی ہے۔

نامور ناقد ڈاکٹر کوثر مظہری نے ان کے افسانوں پر جو رائے دی ہے وہ میری نگاہ میں بہت صائب ہے۔

"نیاز اختر کے کچھ افسانے جو میں نے پڑھے ہیں،ان میں افعی،تپتی زندگی،مراجعت،رفو میاں اور بوڑھے برگد کا انت اہمیت کی [کے] حامل ہیں۔ان کے یہاں ایک طرح کی دردمندی اور انسانی نفسیات سے قرب کا پتا چلتا ہے۔ان کی نظر آس پاس کی اشیاء پر رہتی ہے اور ان اشیاء،کائنات اور آس پاس کی زندگی کے مابین رشتوں کا وہ گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔"

اور آس پاس کی اشیا اور زندگی پر نظر اور گہرا شعور رکھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ"گدھ" جیسا قابلِ قدر اور "ٹرمینیٹر" جیسا اچھوتا افسانہ وجود میں آیا۔

آبی اور فضائی آلودگی اب عالمی مسئلہ بن گئی ہے۔بھارت میں یہ مسئلہ بے حد سنگین ہو گیا ہے۔عوام الناس کی ناعاقبت اندیشی،صفائی کے تئیں از حد بے حسی اور غیر ذمہ دارانہ کردار کے سبب ندیاں،جھیل،تالاب،جتنے بھی آبی وسائل ہیں،سب آلودگی کے شکار ہو چکے ہیں۔دوسری طرف شہروں میں کل کارخانوں سے نکلنے والے دھوئیں،مختلف اقسام کی نقصاندہ گیسوں کے اخراج سے فضا کا دم گھٹ رہا ہے۔ان آلودگیوں کے سبب نہ صرف معاشرتِ انسانی موت سے نبرد آزما ہے،بلکہ پرندوں کی معاشرت بھی محفوظ نہیں ہے۔شدید قسم کی آلودگیوں اور گیسوں کے اخراج کی وجہ سے پرندوں کی کئی نسلوں کے ناپید ہونے کا خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ان پرندوں میں گدھ کی تعداد قابلِ تشویش حد تک گھٹ گئی ہے۔گدھ جو زمینی اور فضائی آلودگیوں کی صفائی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں،فضائی آلودگیوں سے کچھ تو بے موت مر رہے ہیں

اور کچھ دوسری فضاؤں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔

نیاز اختر کا افسانہ ''گدھ'' اسی کربنا کی کا تحریری خاکہ ہے۔ گدھ کی کمی کا سب سے زیادہ خمیازہ پارسی سماج کو بھگتنا پڑ رہا ہے، کیونکہ ان کی شریعت میں لاشوں کو ایک اونچے منارے پر رکھ دیا جاتا ہے تا کہ ان کے مردہ اجسام بھی گوشت خور پرندوں کی شکم سیری میں کام آ جائیں۔

اس افسانے کا پورا پس منظر شہر آہن، جمشید پور ہے۔ اور یہ افسانہ جمشید پور کے ہی پس منظر میں لکھا جا سکتا ہے، کسی اور شہر کے نہیں۔

یہ بھی کتنا بڑا المیہ ہے کہ شہر جمشید پور جس پارسی سماج کے ایک فرد جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا کے تخیل کی دین ہے، ان کا قائم کردہ کارخانہ ٹسکو (جو اب ٹاٹا اسٹیل کے نام سے جانا جاتا ہے) ہزاروں خاندانوں، لاکھوں افراد کی ''روٹیوں'' کا وسیلہ ہے، اسی کارخانے کی کئی چمنیوں سے نکلنے والی گیسوں اور دھوئیں نے پارسی سماج کو سب سے زیادہ حزن وملال سے ہمکنار کیا ہے۔ واہ! کتنی دور رس نگاہ ہے نیاز کی اور کتنا گہرا شعور ہے ان کا!

پارسی کردار پر اردو میں افسانے لکھے گئے ہیں، لیکن پارسی معاشرے اور ان کے اس مذہبی پہلو پر شاید یہ پہلا اور آخری افسانہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اچھوتا افسانہ ہے۔

اس مجموعے میں ایک اور اچھوتا افسانہ ''ٹرمینیٹر'' ہے۔ مزرعہ اور مُزارع پر اس سے قبل بھی کئی افسانے لکھے گئے ہیں۔ لیکن زراعت کے تعلق سے لکھے گئے اس افسانے میں تھوڑی سائنس کی آمیزش بھی ہے۔ گویا یہ ایک مختصر سا سائنس فکشن ہے اور اس کا یہی اچھوتا پن ہے۔ ''ٹرمینیٹر'' دراصل کپاس کے ایک خاص قسم کے بیج کا نام ہے۔

گاؤں میں بھونسلے اور کلکرنی نامی دو کسان ہیں۔ بھونسلے غریب کسان ہے جبکہ کلکرنی خوشحال۔ کلکرنی اچھی فصل کے لئے نت نئے طریقے استعمال کرتا ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ کسان ہے، اس لئے زراعت کے تعلق سے ہمیشہ خبروں اور اطلاعات واعلانات سے باخبر رہتا ہے۔ زراعتی لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا کرتا ہے۔ ان ساری باتوں سے اسے علم ہوا کہ کپاس کی اچھی فصل کے لئے ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے ایک خاص قسم کا بیج بازار میں متعارف کیا ہے۔ اس نے اس بیج سے اپنے کھیت میں کپاس کی فصل اگائی جس کا نتیجہ زرخیزی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اسی فصل کے بیج اس کے کھلیان میں رکھے ہوئے تھے۔ ان بیجوں کر چرا کر بھونسلے نے اپنے کھیت میں بویا لیکن نتیجہ صفر رہا۔ اس نے اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے کلکرنی کو ساری حقیقت بتا دی۔ تب کلکرنی نے اسے بتایا کہ یہ ''ٹرمینیٹر'' بیج تھے، جس سے صرف ایک بار فصل اگائی جا سکتی ہے۔ یہ جان کر بھونسلے کے پیروں تلے

زمین کھسک گئی، اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ دراصل اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر فصل اچھی ہوئی تو اس کی آمدنی سے اپنی بیوی کے لئے سونے کا کنگن بنوائے گا جس کی آرزو وہ ایک مدت سے لئے بیٹھی تھی۔

یہ افسانہ اپنے اندرون میں ندرت کے ساتھ اصلاحی پہلو بھی سمیٹے ہوئے ہے کہ چوری جیسے قبیح جرم کا انجام بد ہی ہوگا۔ افسانے کے وسیلے سے نیاز نے قارئین کو ایک پیغام دیا ہے کہ انسان کو ہمیشہ حلال رزق کے لئے کوشاں رہنا چاہئے، قناعت پسند ہونا چاہئے، خواہ اس کے ساتھ کتنے ہی نامساعد حالات ہوں۔

اگر ہم نیاز کی افسانوں پر غایت نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ دکھ درد، رنج وغم، حزن وملال، بے بسی، بے کسی، بے چارگی، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، تمام افسانوں میں مشترک ہیں۔ شاید ہی کوئی افسانہ ہو جو طرب انگیز ہو۔ ہاں افسانے میں کہیں کہیں طربیہ مکالمے مل جائیں گے لیکن افسانے کا اختتام کسی المیے پر ہی منتج ہوگا۔

''رنجھی'' پڑھئے! اس کے کرداروں کے ساتھ جو الم ناک واقعات ہوتے ہیں، افسانہ پڑھتے پڑھتے خود آپ کے دل میں ایک درد سا محسوس ہوگا۔ علاج ومعالجہ اتنا گراں ہو گیا ہے کہ اگر کوئی بڑا مرض کسی تہی دست فرد کو لاحق ہو جائے تو اس سے نجات صرف موت دے سکتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ معالجوں کی کرم فرمائیاں اور شفاخانوں کی بدعنوانیاں، اللہ کی پناہ!

بڑی چابکدستی سے افسانے کے تانے بانے کو بُنا ہے افسانہ نگار نے۔ حالانکہ اس افسانے کا نام ''رنجھی''، نفسِ افسانہ سے میل نہیں کھاتا، لیکن یہ افسانہ نگار کا کمالِ ہنر ہے کہ افسانے کے بے کس کرداروں کے ساتھ ہمارے دلوں میں جذبۂ ترحّم موجزن کر دیتا ہے۔ افسانے کا آخری منظر قاری کو دل کو چھوتا ہے۔

''اپرینٹس'' ایک غیور مسلم مزدور عبدالستار کی کہانی ہے، جو شہر آہن کے سب سے بڑے کارخانے میں ملازم ہے۔ ایماندار ہے، محنتی ہے، خوددار بھی ہے۔ لیکن ضعیفی کے سبب وہ کبھی کبھار کوئی ذمہ داری بھول جاتا ہے، تو اس کے ایک جونیر جوان ملازم نے، جسے عبدالستار نے بہت کچھ سکھایا تھا، اسے سخت سست کہہ ڈالتا ہے اور ذلت آمیز الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ تذلیل عبدالستار سے برداشت نہیں ہوتی۔ اور شام کو جب ڈیوٹی کا اختتام ہوتا ہے تو گھر لوٹتے وقت، کارخانے کی طرف سے فراہم کردہ مزدوری کے دوران کام آنے والی ضروری اشیا (جوتے، ہیلمٹ، دستانے وغیرہ) راستے میں پڑنے والی سورن ریکھا ندی کے حوالے کر دیتا ہے۔

یہ دراصل اپنی عزت نفس کا تحفظ کرنے والے شخص کی کہانی ہے۔ افسانے کی قرأت کے بعد ہم اپنا احتساب کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہم اپنی عزت نفس کا پاس ولحاظ کرتے ہیں یا تھوڑے مفاد کی خاطر اپنی غیرت بیچ کھاتے ہیں۔ غیرت انسان کا ایک اعلیٰ جوہر ہے۔ اسے اگر انسان نے کھو دیا تو پھر اپنی سطح سے کتنا نیچے گرے گا کہا نہیں جا سکتا۔ یہ افسانہ ہمیں اسی جوہر کو اپنے پاس سمیٹ کر رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔

سرورق (ٹائٹل) افسانہ ''بوڑھے برگد کا انت'' ایک جذباتی اور متاثر کن افسانہ ہے۔ اس میں ایک اسی برس کے بوڑھے کی نفسیات کا ماجرا قلمبند کیا گیا ہے۔

جٹا شنکر جنگِ آزادی کا ایک سپاہی تھا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف جدوجہدِ آزادی میں حصہ لیا تھا، لیکن اسے ''فریڈم فائٹر'' کا درجہ کسی وجہ سے نہیں مل سکا۔ آزادی کی جدوجہد کے ضمن میں ایک بار ایسا ہوا کہ انگریز سپاہیوں سے بچنے کی خاطر اس نے برگد کے ایک گھنے درخت میں چھپ کر پناہ لی تھی اور اس کی جان بچ گئی تھی۔ تب سے وہ اس برگد کے پیڑ کا نہ صرف گرویدہ ہو گیا بلکہ عقیدت مند بھی۔ کبرسنی کے باوجود وہ روزانہ ندی سے لا کر ایک لوٹا پانی اس کی جڑ میں ڈالتا تھا اور اس کی پوجا کرتا تھا۔ گاؤں میں ایک مڈل اسکول کی تعمیر کی غرض سے، سرکاری منصوبے کے تحت اس برگد کے پیڑ کو کاٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس پر جٹا شنکر زبردست مزاحم ہوا۔ اس نے برگد کے اس درخت کو، جس سے اس کا جذباتی اور روحانی انسلاک تھا، بچانے کی خاطر بہت جدوجہد کی لیکن بے نیل ومرام رہا۔ آخر کار بیچارگی میں اس نے اس درخت پر پھانسی لگا کر اپنی ہی جان دے دی۔

جٹا شنکر کے اس انجام پر بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ اس کی ذات اور تمناؤں سے یک گونہ ہمدردی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ اس افسانے میں جہاں ایک طرف مرکزی کردار جٹا شنکر کے حوصلہ مندانہ کردار کا اثر انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے وہیں سرکاری محکمے میں افسران اور ملازمین کی بدعنوانیوں کی قبیح تصویر بھی دکھائی گئی ہے۔

پورے افسانے کی قرأت کے بعد بس ایک بات کھٹکتی ہے کہ جٹا شنکر تو ایک جہاں دیدہ شخص تھا، کیا وہ تعلیم کی اہمیت جانتا نہیں تھا؟ گاؤں میں ایک مڈل اسکول کی کتنی ضرورت تھی، اس سے وہ واقف نہیں تھا؟ برگد کے درخت کا لگاؤ تو صرف جٹا شنکر سے تھا، لیکن اسکول کے قیام سے پورا گاؤں مستفیض ومستفید ہوتا۔

نیاز اختر چونکہ سرکاری ملازم ہیں، اس لئے محکمہ جاتی معاملات کا اچھا خاصا درک رکھتے ہیں، سرکاری محکموں کے کام کاج کے طریقوں، افسرانِ بالا کی آن بان شان، ان کی رعونت، محکموں میں پھیلی بدعنوانیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اپنی ان واقفیتوں کو وہ اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ اس کی تھوڑی بہت جھلک ''بوڑھے برگد کا انت'' میں نظر آتی ہے۔ ''افعی'' بھی اس کی اچھی مثال ہے۔

انسان کی خودغرضی، مفاد پرستی اور ابن الوقتی اس سے کون کون سے جرائم نہیں کراتی۔ جہیز کے مطالبے کا سماجی جرم ہو، سرکاری ملازمین کا رشوت خوری کا جرم ہو، صنعت وحرفت کے احاطے میں مالکوں کے ذریعہ مزدوروں کے استحصال کا جرم ہو یا درسگاہوں میں مقتدر حضرات کا اپنے طلبہ وطالبات کی مجبوری اور کمزوری کا فائدہ حاصل کرنے کا جرم ہو۔ جرائم کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر قتل وغارتگری اور انسانی جان کا زیاں عام ہے۔ بے کسوں اور محروموں پر ناروا ظلم وستم اب حیرت کی بات نہیں رہ گئی

ہے۔ بے بسوں اور ناچاروں پر جبر وتشدد ہماری قومی مزاج بنتا جا رہا ہے۔ مذہبی منافرت، عصبیت بعض فرقوں کے لئے تفاخر کی علامت بن گئی ہیں۔ ایک بڑا ناسور ہمارے سماج میں پنپ رہا ہے، پھیل رہا ہے۔ وطنِ عزیز کے نیک طینت، غمگسار، نرم خو، رحمدل اور دردمند افراد اس ناسور کے ٹیس سے کراہ رہے ہیں۔ اس کراہوں میں سسکتی آواز کی بازگشت سننا ہو، محسوس کرنا ہو تو نیاز کے افسانے اپنی اپنی صلیب، مراجعت، سنبھالا، ہڑتال، ڈوبتا سورج، آزادی، گتا پڑھئے۔ ان افسانوں میں آپ کو ایک سسکتا، بلکتا، ہمکتا ہندوستان نظر آئے گا اور تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان واقعات وحادثات پر نیاز اختر کتنی شاہینی نگاہ ڈالتے ہیں۔

تعلیم گاہیں ایسے مقامات ہیں جن کا احترام نوعِ انسانی کا ہر طبقہ کرتا ہے، سبھی طبقوں میں انہیں تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں بنی آدم کو انسان بنایا جاتا ہے، انسانیت کی معراج عطا ہوتی ہے۔ لیکن اب ہم ان تعلیم گاہوں کی ایسی شبیہ سے روبرو نہیں ہوتے۔ استاد اور شاگرد کے محترم رشتے تار تار ہو چکے ہیں، اعلیٰ درسگاہوں میں طالبات کو امتحانات میں اچھے مارکس دینے یا دلانے، یا کسی خوبصورت طالبہ کو ٹاپ کرانے کے نام پر اپنی شہوانی بھوک پر، اس مقدس رشتے کو بھینٹ چڑھانے میں اب کوئی عار نہیں رہ گیا ہے۔ ''قاتل مسیحا'' میں اس المیہ کو بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے مصنف نے اجاگر کیا ہے۔ اس قاتل مسیحا کا نام تو رحمٰن ہے لیکن صفت شیطان کا ہے۔

مجموعے کے تمام افسانوں کا محاکمہ مقصود نہیں ہے۔ ابتدائی پانچ چھ افسانوں کے احتساب سے نیاز اختر کے فنِ افسانہ نگاری کے خط وخال واضح ہو جاتے ہیں۔

محاورے اور ضرب الامثال کسی بھی تحریر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ نیاز نے اپنے افسانوں میں بہت کم ان کا استعمال کیا ہے۔ یہی حال تمثیلات وتشبیہات کا بھی ہے۔

نیاز کے افسانے ایکدم صاف ستھرے ہیں۔ کوئی افسانہ گنجلک نہیں ہے نہ ہی ان میں تلذذ کا شائبہ ہے۔ کسی بھی افسانہ نگار کے مجموعے کے نہ تو سبھی افسانے اعلیٰ پایے کے ہوتے ہیں نہ ہی انتہائی گئے گزرے۔ نیاز کے اس مجموعے میں بھی چند اعلیٰ پایے کے افسانے ہیں تو چند اوسط درجے کے اور کچھ کے متعلق میں اتنا ہی کہوں گا کہ انہوں نے انتخاب میں سختی نہیں برتی ہے۔

◄◄ ● ►►

59, Chuna Shah Colony
P.O.: Maango, Jamshedpur-831012
7004384853

● ایزاد
● امجد جاوید

ہتک کے بعد

دستک کی دھڑ دھڑ سے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

ایک لمحہ کو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ کیا ہوگیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہی کمرہ تھا۔ اس کا خارش زدہ کتا اس کے ساتھ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ تھوتھنی اٹھائے اس کی جانب یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے بے وقت کی دستک نے اسے بیزار کر دیا ہو۔ سوگندھی کو سب یاد آ گیا۔ وہ نا چاہتے ہوئے اٹھنے لگی تو اس کے منہ سے بے ساختہ ہنکارا نکل گیا۔ وہ ہنکارا جیسا بھی تھا لیکن اسے "اونہہ" ہی لگا۔ اس کے تن بدن میں پھر سے کسیلا پن پیدا ہو گیا۔ اسے لگا جیسے ماتھے پر لگا ہوا بام اس کے پورے بدن کے مساموں تک پھیل گیا ہے۔ اچانک ہی سر میں درد کی ٹیس دوبارہ اٹھ گئی، جسے اس نے دبانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پھر سے اس کا بدن تن جائے۔ ایسے میں دستک کی دھڑ دھڑ پھر ہوئی۔

"ابے کون ہے، در وجہ توڑے گا کیا؟" نا چاہتے ہوئے بھی سوگندھی کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی چولی کو درست کر کے چھاتی کے ابھاروں کو برابر کیا تو اس میں پڑے روپے کھنکھنا اٹھے۔ اسے یاد آ گیا، اس کی ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جونہی اس کا مرد آئے گا، اسے روپے دے دے گی۔ اب یہی سکے اس کے پاس جمع پونجی تھی۔ مادھو کو تو اس نے رات بھگا دیا تھا۔ اسے لگا سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے خون میں خوف بھری ٹھنڈک بن کر شامل ہو رہی ہے۔ یہ روپے مدراسی عورت کو دے دیئے تو پھر آج کا دن کیسے گزارے گی۔ یہ سوچتے ہوئے اس کی نگاہ گنیش جی کی مورتی پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طویل سانس اس کے حلق سے خارج ہوا۔

ایسے میں دروازے پر پھر سے دستک ہوئی۔ اس کا جی تو چاہا کہ وہیں بیٹھی بیٹھی دو چار سنا دے، مگر گالیاں اس کے دماغ ہی میں گونج کر رہ گئیں۔ ہو سکتا ہے وہی مدراسی عورت ہو۔ وہ اٹھی اور دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی دروازے تک چلی گئی۔

اس نے دروازے کے پٹ وا کیے تو سامنے مادھو کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ سوگندھی اس پر ٹوٹ

پڑتی، مادھو نے اپنے لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا

"سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں ری......"

یہ لفظ تھے یا بارش کا وہ پانی جو تپتی ہوئی زمین پر پڑے تو ٹھنڈک پھیل جائے۔ وہ ایک دم سے پگھل گئی تھی۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے دروازہ چھوڑ دیا۔ مادھو اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا خارش زدہ کتا مادھو کو دیکھ کر غرانے لگا تھا۔ تبھی سوگندھی نے غراتے ہوئے کتے کو ڈانٹا تو وہ پلنگ سے اٹھ کر باہر دروازے کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنی تھوتھنی یوں ٹانگوں میں دبالی جیسے ناراض ہو گیا ہو۔ اسے یوں لگا جیسے کتے کو بھی مادھو کی آمد پسند نہیں آئی۔ سوگندھی اپنی دھوتی سمیٹتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ کر بولی

"کیوں آیا ہے تو یہاں؟"

"کہا نا، تجھ سے پریم کرتا ہوں۔" اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا

"تو جانتا ہے، دس روپے میرا ریٹ ہے جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا ہے۔ تو دے گا نا تو میں بھی رام لال کی دلالی ایمانداری سے دوں گی، بول دے گا دس روپے؟" سوگندھی نے بالکل کاروباری انداز اپناتے ہوئے پوچھا

"اب پریم میں یہ چلے گا کیا، میں تجھے حوالدارنی بنانے کی فکر میں ہوں۔ چل چھوڑ غصہ، کچھ کھانے پینے کو ہے یہاں؟" مادھو نے کمال ڈھٹائی سے کہا تو سوگندھی کو رام لال کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے جی کڑا کے کہا

"تیری جان کی قسم مادھو، رات سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

"چل ٹھیک ہے۔" خلاف توقع وہ مان گیا۔

وہ اٹھ کر باہر گیا تو سوگندھی کو یوں لگا جیسے آج تک وہ پاگل ہی رہی ہے۔

باہر والا چائے کے ساتھ افلاطونی بسکٹ رکھ گیا تھا، ایسے میں مادھو بھی آ گیا، اس کے ہاتھ میں گرم گرم کچوریاں تھیں۔ اس کی مہک سارے کھولی میں پھیل گئی تھی۔ سوگندھی نے کلی بھی نہیں کی اور کچوریاں کھانے لگی۔ اس نے افلاطونی بسکٹ کے ساتھ چائے پی کر مادھو کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر احمقانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ابھری ہوئی چھاتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی سوگندھی کے دماغ میں سکے بجنے لگے۔ اسے لگا کہ اس کی چھاتی کے ساتھ لگے چاندی کے سکے پگھل کر اس کے خون میں شامل ہو رہے ہیں، جس سے خون کی روانی مزید بڑھنے لگی ہے اور اس کا غصہ بڑھنے لگا ہے۔

''اے مادھو، کیا دیکھتا ہے بے؟'' سوگندھی نے پوچھا

''تھوڑے روپوں کا بندوبست ہو جاتا تو میں..... بس چند دن کی بات ہے، میں تجھے منی آرڈر کر دوں گا..... کسی طرح انسپکٹر سے میری جان چھوٹ جائے تو میں تجھے حوالدارنی بنالوں گا۔ یہ دھندہ وندہ سب ختم، تجھے خوش رکھوں گا۔''

''اے مادھو، ذرا کھڑا ہو۔'' سوگندھی نے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھتا ہوا کھڑا ہو گیا، تبھی وہ تنک کر بولی ''یہ پتلون اُتار.....''

''کیا کرتی ہے، ابھی تو تم سے کوئی اور بات کر رہا ہوں۔'' مادھو نے گھبراہٹ میں کہا تو سوگندھی نے کہا

''ابے سالے، وہی بات کر رہی ہو، تیری جیب میں جتنے روپے ہیں سارے یہاں رکھ، نہیں تو میں تیری پتلون اتار کر تجھے ننگا یہاں سے بھیج دوں گی۔ بول اتارتا ہے پتلون یا روپے نکالتا ہے؟''

''سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے، لگتا ہے تجھ پر بھوت پریت آ گیا ہے۔ چل مجھے جانے دے۔ میں جاتے ہی تجھے روپے منی آرڈر کر دوں، کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟'' اس نے ہذیانی انداز میں پوچھا تو سوگندھی کو یوں لگا جیسے مادھو نے اسے گالی دے دی ہو۔ وہ اٹھی اور اسے گریبان سے پکڑ لیا، پھر غراتے ہوئے بولی

''میری بات کی تجھے سمجھ نہیں آئی؟''

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ کچھ سکے اس کے ہاتھ میں آئے اور باقی جیب پھٹنے سے فرش پر گر گئے۔ سکوں کی کھنکناہٹ میں مادھو نے خود کو چھڑایا اور باہر کی جانب بھاگ گیا۔

سوگندھی واپس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نکھرے ہوئے سکے یونہی پڑے رہے۔ اسے لگا جیسے ہر طرف حبس چھا گیا ہے۔ اسے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان آ گئی تھی جہاں بندے کا وزن ہی نہیں رہتا۔ سکوں کی کھنکناہٹ اور سیٹھ کی ''اونہہ'' گڈمڈ ہو گئے تھے۔ باقی ساری آوازیں معدوم ہو گئی تھیں۔

وہ باہر والے کی آواز سے چونکی، وہ برتن اٹھانے آیا تھا۔ وہ بالشت بھر کا لونڈا تھا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ برتن اٹھائے ہوئے کھڑا اس کی چھاتیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اسے اپنی چھاتیوں پر رنگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جیسے ریشم کے دھاگے کی گتھیاں چھو رہی ہوں۔ تبھی سوگندھی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے بے، برتن اٹھا لئے ہیں نا، تو اب جا۔''

''ہاں جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ سوگندھی نے بکھرے ہوئے روپے اٹھائے۔ اس نے وہ چند سکے اپنی چھاتیوں میں رکھنا چاہے مگر رک گئی۔ اس کا جی نہیں کیا کہ یہ چپچپے ہوئے روپے وہ اپنے بدن سے لگائے۔ اس نے وہ روپے گنیش جی کی مورتی کے ساتھ پڑے ہوئے دیے کے ساتھ مدارا سی عورت کے لئے رکھ دیئے۔

سوگندھی دروازہ لگا کر پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے مادھو پر جو غصہ آیا تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ کبھی وہ سوچتی کہ اچھا ہوا اسے بھگا دیا، مواہ جان کو آیا ہوا تھا۔ مفت کا مال سمجھ کر یوں بھاگتا آتا تھا جیسے کسی مندر میں بھکاری آتے ہیں، ''اونہہ'' بڑا آیا مجھے حوالدارنی بنانے والا.....''

وہ خیال کی رُو میں بہتے ہوئے سوچ تو گئی لیکن پھر سے اونہہ پر اٹک گئی۔ اسے لگا جیسے اونہہ اس کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہے، بالکل بام کی ٹھنڈک کے احساس کی طرح، جو ایک بار لگے تو اپنا اثر جانے تک ٹھنڈک جسم پر ٹھہری رہتی ہے۔

اس نے کروٹ بدل کر سوچا، مادھو ایسے باتیں تو ٹھیک کرتا تھا۔

''تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ چھی چھی چھی..... دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ اب ان ساڑھے سات روپوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا۔ جو میں لے ہی نہیں سکتا۔ مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیے؟ مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی روپے دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بچ رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور۔ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پُونے میں حوالدار ہوں، مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لیے۔ یہ دھندا چھوڑ۔ میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟''

''سالا حرام خور ..... بھاڑا دے گا اس کھولی کا..... اُونہہ.....''

وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اسے خود بجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کیا سوچے، اس نے اپنی دھوتی سمیٹی اور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ ساری آوازیں ایک دم سے ختم ہو جائیں، یہاں

تک کہ سوچیں بھی اس کے دماغ میں نہ آئیں وہ ایک خلا میں چلی جائے، جہاں صرف وہ ہو، اس کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو۔ ایسا ہو نہیں پا رہا تھا، آوازیں اس کی کھولی میں کسی آسیب کی مانند گھوم رہی تھیں۔ یا پھر اس چمگادڑ کی طرح جو کمرے میں گھس آئے اور باہر جانے کو کوئی راستہ نہ ملے۔ یہ اونہہ بھی کسی چمگادڑ کی طرح کھولی میں گھوم رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں کو چٹکی سے پکڑ کر بھی دور بھی نہیں پھینک سکتی تھی۔ اسے لگا، اونہہ کسی بٹھے کے مانند اس کے بدن سے چپک گئی ہے اور یہ سوچیں اس کے بدن پر چیونٹوں کی مانند رینگ رہی ہیں۔

وہ ایک پہاڑی پر کھڑی تھی۔ اس کے سامنے نیچے کی طرف جاتا ہوا ٹیڑھا میڑھا راستہ تھا۔ وہ نیچے اترنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاؤں پتھروں نے جکڑ رکھے تھے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ نیچے کیسے جائے، انہی لمحات میں درختوں کی اوٹ سے عجیب الخلقت مخلوق نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے غور سے سنا وہ اونہہ اونہہ کرتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ خوف کے مارے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ گلا پھاڑ کر مدد کے لئے کسی کو بلانا چاہ رہی تھی لیکن کوئی بھی اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی، شاید پسینے سے اس کا بدن بھیگ گیا تھا۔

دروازہ پھر سے بج اٹھا تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا دستک کی آواز کیلے مادے میں ڈھل کر اس کی کانوں میں جھنجلاہٹ پیدا کر رہی ہے۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اٹھ کر دروازہ کھولے۔ وہ مادھو کا چہرہ پھر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ایسے میں پھر سے دستک ہوئی۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے دروازہ کھولا تو باہر جمنا کے ساتھ وہی مدارا سی عورت کھڑی تھی۔

''تم سوتو نہیں رہی تھی سوگندھی؟'' جمنا نے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

''ارے نہیں، نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا

''ہاں بھلا، اتنی جلدی نیند تجھے کاہے کو آنے لگی، ابھی میں نے تیرے مرد کو باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ مدارا سن میرے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی، میں نے کہا چل سوگندھی کے پاس چلتے ہیں، وہ جو دے گی سو دے گی، باقی میں اسے دے دوں گی، یہ تو جائے نا بے چاری۔'' اس نے مدارا سی عورت کی طرف دیکھ کر کہا جو ابھی تک کھڑی تھی۔ تبھی سوگندھی نے گنیش جی کی مورتی کے پاس جہاں دِیے کے ساتھ مروڑیاں پڑی تھیں، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''وہاں رکھ گیا، جو بھی ہے، تیرے لئے ہے، اٹھا لے۔''

مدارا سی عورت آگے بڑھی اور اس نے وہ روپے اٹھا لئے، اتنی دیر میں جمنا نے اپنے پلو سے

بندھے کچھ روپے نکالے اور مدارا سی عورت کو دے دیئے۔ وہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔ اتنی نہال کے اس کے آنسو نکل پڑے۔

''اچھا اب جا۔'' جمنا نے کہا تو وہ مدارا سی عورت سر جھکائے وہاں سے چلی گئی۔ سوگندھی پھر سے پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ جمنا اسے یوں غور سے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ سوگندھی نے اس کا دیکھنا محسوس کرتے ہوئے پوچھا

''کیا بات ہے ری، یوں کیسے دیکھ رہی ہے؟''

''آج تُو کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، لگتا ہے تیرے مرد نے کچھ زیادہ ہی زور زوری کی ہے تیرے ساتھ، تھکی پڑی ہے تو۔ کیا تجھے یہاں کوئی گریا دنہیں آیا جو یوں مرجھائی ہوئی بیٹھی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہونٹوں میں ہنس دی تھی

''کیا بتاؤں ری جمنا، مرد کتنے کھردرے ہوتے ہیں، انہیں خیال ہی نہیں ہوتا، گوشت کو بھنبھوڑتے ہیں، یوں چاٹتے چوستے ہیں جیسے سارا جوانی کا رَس پی جائیں گے، مگر یہ خیال نہیں کرتا کہ عورت میں بھی پیاس بھڑک اٹھتی ہے، ایک آگ کی مانند، بس اپنی رَم پورے کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو جمنا نے اسے غور سے دیکھا، آج اسے بالکل بدلی ہوئی سوگندھی لگ رہی تھی۔ عورت کا فطری تجسس جاگ گیا تھا، وہ پتہ لگانا چاہ رہی تھی آخر ہوا کیا، اس لئے جلدی سے بولی۔

''کہیں تو اپنے مرد سے سچا پریم تو نہیں کرنے لگی، ارے سوگندھی ہمارے جیسی بھاؤ تاؤ کرنے والیوں کے لئے یہ مواپریم سب سے ظالم چیز ہے، پریم کروا ور بھوکے مرو۔''

''تو سچ کہتی ہے، پر بہت ساری چیزیں اپنے اختیار میں بھی تو نہیں ہوتیں۔'' سوگندھی نے یوں کہا جیسے بڑبڑا رہی ہو۔

''بس تو پھر تیرا دھندہ ٹھپ سمجھو، میں کہوں تم خود ہی اپنا دھندہ ٹھپ کرنے کے چکر میں ہو، تجھ سے نہیں ہو گا یہ۔'' جمنا نے غصے سے بیٹھتے ہوئے ہاتھ نچا کر یوں کہا جیسے وہ خود بڑی سمجھدار ہے۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' سوگندھی نے چونک کر پوچھا

''تو اپنا حال دیکھ، ہمیں تو بڑے گر بتاتی ہے، پر تم، تجھے خود پر بھی رحم نہیں آتا، اپنی حالت دیکھی ہے کبھی، تجھے تو اپنی بغلیں مونڈھنا بھی نہیں آتیں، اوپر سے یہ میلی چکٹ تیری کھولی ہے، پر تجھے اپنا خیال کہاں، تجھے اتنی بار کہا ہے کہ تیرے یہ بسمہ سنبھال کر رکھو، انگیا پہنا کرو، پر مجال ہے تو کسی کی سنتی ہو۔''

''پر جو مرد لیٹنے آتا ہے، اس کا ان چیزوں سے کیا تعلق؟'' اس نے حیرت سے یوں پوچھا جیسے

اسے معلوم ہی نہ ہو۔

''اونہہ، جیسے تجھے پتہ نہیں۔'' جمنا کے منہ سے نکلا تو گویا اونہہ کسی دھوئیں کی مانند کھولی میں پھیل گئی، اسے لگا جیسے وہ ایک ٹھنڈی گھٹن کے حصار میں آ گئی ہے۔ یا پھر باہر لگے کھمبے کی ٹھنڈک اس کی کھولی میں آ کر دیواروں سے لگ کر بیٹھ گئی ہے۔ سوگندھی نے حیرت سے سوچا، اسے غصہ کیوں نہیں آیا، کیا اس نے اونہہ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے، یا اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ تبھی جمنا کی آواز کہیں دور سے آتے ہوئے سنائی دی، ''بولتی کیوں نہیں؟''

''کیا کروں میں؟'' اس نے اکتاہٹ سے پوچھا

''تجھے یاد ہے ایک بار تم نے ایک مرد کا قصہ سنایا تھا، اری وہی جو اندھیرا نہیں کر رہا تھا، تو لائٹ آف کرتی تھی اور وہ پھر آن کر دیتا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا

''یاد کرتم نے اس کے بارے بتاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا۔''

''ہاں، ایسا ہی کہا تھا شاید.....''

''مجھے بتا رو زکون اتنے روپے مفت میں دے کر جاتا ہے، سالے ہڈی پسلی توڑ کے جاتے ہیں، بولے تو بھنبھوڑ کے جاتے ہیں۔ بتا کون دے کر جاتا ہے؟ ہے کوئی ایسا؟'' جمنا نے جذباتی لہجے کہا تو سوگندھی چونک گئی۔

''وہ تو بس ایک بار ہی ایسا ہوا تھا، پھر تو کوئی نہیں دے کر گیا۔''

''بس یہی بات، وہی ساڑھے سات روپے بچتے ہیں۔ ڈھائی روپے رام لال لے جاتا ہے، تیرا نرخ تو دس روپے ہے، کون دے تجھے تیس روپے؟'' جمنا نے کہا تو اس میں ایک تفاخر بھی تھا۔ سوگندھی خاموش رہی تو وہ بولی، ''دیکھ میں تیرے بھلے کے لئے کہتی ہوں، کچھ اپنا خیال کر، ذرا بن ٹھن کر رہا کر، یہ مونڈنے کا چکر چھوڑ، کوئی یہاں آئے تو اسے خوشبو آئے۔ وہ پھر بھی تیری چاہت کرے، پھر بھلے تو اپنا نرخ تیس روپے کر دے۔ گاہک تو مال دیکھ کر آتا ہے نا۔'' جمنا نے آخری لفظ آنکھ مارتے ہوئے کہا تو سوگندھی کو لگا جیسے اس کے اردگرد گھومتی ہوئی اونہہ ایک دم سے تھک کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ہے۔ اونہہ دیواروں پر یوں پھیل رہی تھی جیسے آکاس بیل، وہ جو ہرے بھرے درختوں کو ساری شادابی چوس کر، پیلے زرد کر دیتی ہے۔

جمنا تو ڈھیر ساری باتیں کر کے چلی گئی، مگر سوگندھی کو یاد رہی تو صرف ایک بات، اب اس کا نرخ تیس روپے ہونا چاہئے۔ بھاڑ میں جائے کوئی پریم کرتا ہے یا نہیں کرتا، وہ خود کو ایسا بنا لے گی کہ گاہک خود تیس روپے دے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے اور رام لال کے درمیان سکے بجنے لگے، کیا تیس روپے میں بھی اس کی دلالی بڑھ جائے گی، اب ساڑھے سات وہ لے گا، مجھے بچیں گے ساڑھے بائیس..... چل کوئی بات نہیں، اتنے ہی کافی ہیں۔ اس نے خود کو مطمئن کیا۔ پھر خود ہی اپنے آپ پر ہنس دی۔ اس نے اونہہ کو بزنس میں بدل لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ٹھنڈ بڑھ گئی تھی لیکن پھر بھی وہ سرِ شام نہا دھو کر دھلی ہوئی پرانی ساڑھی پہن کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں کاجل لگاتے ہوئے پہلی بار غور سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ تبھی اسے مادھو کی بات یاد آ گئی۔

''سوگندھی، پانی کا یہ گھڑا..... دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ..... یہ چیتھڑے۔ یہ چندیاں، اف کتنی بُری باس آتی ہے، اٹھا کے باہر پھینک ان کو..... اور تو نے اپنے بالوں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ اور۔ اور.....''

لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ اپنے بالوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے بال بالکل اجاڑ ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا اب ان کا بھی خیال رکھے گی، تبھی اس نے آئینے میں اپنی بغل کو دیکھا، اسے خود گھن آئی، ابھرا ہوا سکن آلود گوشت جو بار بار مونڈنے کی وجہ نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ یوں جیسے کچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہو۔ یہ سوچتے ہی اسے جمنا نے جو طریقہ بتایا تھا، وہ سوچتے ہوئے اسے لاج آ گئی، وہ پہلے تھوڑا سا مسکرائی پھر ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے بے اختیار بولی

''اونہہ، سالا یہ کیا.....''

ایک دم سے وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے اپنے لفظوں پر غور کیا تو اس بار اسے اونہہ کہنے پر کوئی خلا محسوس نہیں ہوا۔ کوئی کیفیت نہیں بدلی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ اونہہ کو بزنس میں بدل رہی ہے تو اچھا کر رہی ہے۔

وہ مڑی اور کرسی پر بیٹھنے لگی، تبھی اسے ہاتھ میں تیل کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی، وہ چند لمحے کھڑی رہی پھر دھلی ہوئی چادر لا کر پلنگ پر ڈال دی۔ وہ سوچ رہی تھی، آج سے وہ اپنا بھاؤ تیس روپے کر دے گی، ابھی رام لال آتا ہے تو اسے بتا دے گی۔ وہ کیے گا تو سہی، جھک جھک بھی کرے گا مگر میں اسے منا لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ وہ گاہک نہیں لائے گا، نہیں لاتا تو نہ لائے۔ بھوکی تو میں بھی نہیں مرنے والی۔

رات ہو گئی تھی۔ وہ کسی بھی گاہک کے لئے خود کو تیار کر کے بیٹھی تھی۔ ایسے میں رام لال اس کی کھولی میں آ گیا۔ اس نے آتے ہی اسے دیکھا، پھر تھوڑا حیرت سے بولتا چلا گیا۔

''اری کیا بات ہے ری، یہ جو تم ہونٹوں پر سرخی لگا لیتی ہو نا، تب بہت ظالم ٹائپ کی چیز لگتی، لگتا ہے، اس سالے خرام خور مادھو نے منی آرڈر بھیج دیا ہے پونے سے کیا؟''

''ارے نہیں رام لال، رات وہ آیا تھا، پچاس روپے مانگ رہا تھا۔'' اس نے یوں کہا جیسے رات والے سینٹھ کا غصہ وہ مادھو پر اتار رہی ہو۔

''اور تو نے دے دیئے، کتنی بار سمجھایا..... سالے اس مادھو سے جان چھڑا، پر تیرے جیسی لڑکیاں، جو عشق پیار کے چکر میں پڑی ہوتی ہیں، سالی بھوکی مرتی ہیں۔ اور تو اور، ان کمینوں کو پلے سے روپے بھی دیتی ہیں، گویا عشق نہ ہوا سالا دھندہ ہو گیا۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ تم اس سے روپے بچا کر رکھا کرو، اسے دکھایا ہی نہ.....'' اس نے کہنا چاہا لیکن سوگندھی اس کی بات کاٹتے ہوئے کاروباری انداز میں کہا۔

''بھگا دیا سالے حرام خور کو، اب دوبارہ نہیں آئے گا۔''

''ہائیں، ایسا کیا..... بھگا دیا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے دیوار پر دیکھا، وہاں مادھو کی تصویر نہیں تھی۔ وہاں مادھو کی کیا کسی کی بھی نہیں تھی۔ رام لال یوں سر ہلانے لگا جیسے بہت کچھ سمجھ گیا ہو۔ تبھی وہ بولا۔

''یہ تم نے بڑا اچھا کیا، چل اب دھندے کی بات کر، باہر ایک سینٹھ کھڑا ہے، تیار تم ہو، آ جا، جلدی کر مجھے کہیں اور بھی جانا ہے۔'' اس نے کہا تو سوگندھی کو جیسے یاد آ گیا۔

''اے رام لال سن، آج سے میرا بھاڑا ہو گا تیس روپے، اس میں تیری دلالی ہو گی ساڑھے سات روپے، پہلے تو مجھے ساڑھے سات دیتا تھا، اب تو لیا کر۔'' اس کی بات سن کر رام لال یوں منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی عجیب بات کر دی ہو، تھوڑی دیر بعد حیرانگی سے کھلا اپنا منہ بند کیا اور پھر انتہائی حیرت سے بولا۔

''ابے، تو کیا خواب دیکھ رہی ہے، تو کوئی فلم سٹار ہے، مدھو بالا ہے تو، اری تیرے کون دے گا تیس روپے۔ اپنے آپ کو دیکھا ہے تو نے، اونہہ.....'' جیسے ہی رام لال کے منہ سے اونہہ نکلا، اسے لگا کہ وہ ٹھنڈے پانی میں گر گئی ہے۔ وہ سارا پانی لوہے کی ٹھنڈے پتروں کی طرح اس کے بدن سے لگ کر اسے گھیرے میں لے رہا ہے۔ اس کی ہتھیلیاں تک بھیگ گئی ہیں۔ اس کے سارے بدن میں ایک نامعلوم سی اینٹھن ہونے لگی ہے۔ جسے نہ تو وہ غصہ کہہ سکتی تھی اور نہ بے چارگی، تبھی اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''رام لال، یہ دھندا ہے، چیز میری، دام میرے، اگر وہ آتا ہے تو ٹھیک، ورنہ تو بھی اپنی شکل گم کر .....''

''دیکھ سوگندھی، تو پاگل ہو گئی ہے، رات والا سینٹھ پاگل تھا، تم اس کا غصہ، اس سینٹھ پر مت اتار،

چل آ، دس بھی دے گا تو.....'' رام لال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو تیزی سے بولی۔

''بس رام لال، جو کہنا تھا سو کہہ دیا، اسے یہاں لے آ، میں خود بھاڑا طے کرتی ہوں، پر تیری دلالی پکی۔ جا لے آ اسے۔''

رام لال کو پانچ برس ہو گئے تھے اُس کے ساتھ دھندہ کرتے ہوئے۔ وہ پہلی بار اس کے منہ سے ایسی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے سوچا رات والی ہتک سے سوگندھی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ پر مجھے کیا، مجھے تو اپنا کام کرنا ہے۔ یہ دلا گیری بھی تو رسک ہی ہوتا ہے، رسک لے لے۔ اگر بات بن گئی تو ٹھیک ورنہ ایسا کون سا پہلی بار ہونا ہے۔ اس نے مزید کوئی بات نہیں کی اور بے دلی سے باہر نکل گیا۔

سوگندھی پھر سے کرسی پر آ بیٹھی۔ اس نے سوچا کہیں دس روپے والا گاہک ٹھکرا کر اس نے غلط تو نہیں کر دیا؟ مگر ایسا کوئی افسوس اس کے دماغ میں نہ تھا، بلکہ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اگر تیس روپے میں نہیں آ تا تو جائے بھاڑ میں۔ وہ اب دھندہ نہیں بزنس کرے گی۔

ہلکی سے کھڑکھڑاہٹ سے اس نے دیکھا، رام لال ایک گاہک کو لے کر اندر آ گیا تھا۔ وہ جوان تھا لیکن تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔ رام لال نے سوگندھی سے کہا

''لے کر لے خود بات.....''

''دیکھو، جی، ہمارا بھاڑا ہے تیس روپے۔ اگر تمہارے دام کھرے نہ ہوں تو قسم سے سارے کے سارے روپے تمہیں لوٹا دیں گے۔'' اس نے سیدھے سیدھے بات کی تو آنے والا گھبراتے ہوئے بولا

''کچھ کم نہیں ہو سکتے؟''

''نہ جی نہ، یہ دھندہ نہیں بزنس ہے اور ہم بزنس میں اوپر نیچے نہیں کرتے، آنا ہے تو ادھر آ جاؤ، جانا ہے تو جاؤ۔'' اس نے روکھے پن سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بازو اٹھا کر یوں انگڑائی لی جیسے بہت تھکی ہوئی ہو۔ اصل مقصد کوئی دوسرا تھا۔ نووارد نے ایک نگاہ دیکھا جو وہ دکھانا چاہ رہی تھی، اس نے چند لمحے سوچا اور پلنگ پر آن بیٹھا۔ سوگندھی کو لگا جیسے اس نے بہت بڑی دنیا فتح کر لی ہو، اس نے فاتحانہ انداز میں رام لال کو دیکھا تو وہ حیرت سے اس جوان کی طرف بڑھا، نوجوان نے سکے گنے اور رام لال کی طرف بڑھا دیئے۔ پھر ساری رات نوجوان اور اس کے درمیان تیس روپے بجتے رہے۔ سوگندھی نے پریم کو چٹکی سے پکڑ کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا تھا۔

دوپہر کو وہ بیدار ہوئی تو اس کی نگاہیں اپنی کھولی کی خالی دیواروں پر پڑی، اسے لگا کہ اس کی کالی

دیواروں سے لٹک رہی ہے۔ وہ اٹھی، اس نے کمر کس لی، پھر شام تک اس نے خوب کھولی کی صفائی کی، گنجا طوطا بھی حیرت سے اسے تکے جا رہا تھا۔ اس نے اس کے پنجرے کا سارا گند بھی نکال باہر پھینکا۔ وہ سوچنے لگی کہ کوئی آتا ہے تو اس سے کچے امرود منگوا کر اس کے پنجرے میں رکھتی ہوں۔ خارش زدہ کتا تو کھولی کے اندر ہی داخل نہیں ہوا جیسے اسے لگ رہا ہو کہ یہ کوئی کسی دوسرے کی کھولی ہے۔ وہ باہر ہی تھوتھنی اپنے پاؤں پر رکھے بیٹھ گیا۔ سوگندھی نے نہا دھو کر گنیش جی کی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے، اگربتی جلائی اور رام لال کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ کوئی دن تھے جب وہ اپنے آپ کو سنوارتے ہوئے یہ سوچتی کہ وہ خود کو پسند کروانے کے لئے یہ تیاری کر رہی ہے تو وہ لاج سے دہری ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اس دن وہ چاہتی بھی تھی کہ لاج شرم کہیں سے آ جائے مگر ایسی کوئی کیفیت اس نے اپنے اندر محسوس نہیں کی، اسے سمجھ آ گئی کہ شاید دھندے میں لاج آ جاتی ہے لیکن بزنس میں نہیں آتی۔

شام ابھی ڈھلی ہی تھی کہ رام لال آ ٹپکا۔ اس نے آتے ہی کھولی کو یوں دیکھا جیسے اجنبی جگہ پر آ گیا ہو۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''اری سوگندھی تو کب سے صاف ستھری ہو گئی ہے ری؟''

اس سوال پر سوگندھی کچھ اور ہی کہنا چاہ رہی تھی یا شاید یہ کہہ دیتی کہ ''اب میں دھندا نہیں بزنس کرتی ہوں، دوکانداری تو چمکا کر رکھنا ہے کہ نہیں۔'' لیکن کچھ نہ کہہ سکی بس مسکرا کر رہ گئی۔ کیونکہ اونہہ اور بزنس گھل مل گیا تھا۔ تبھی اسے یاد آیا تو وہ روکھے پن سے بولی۔

''لا ادھر دے میرے رات والے ساڑھے بائیس روپے۔''

''ہاں ہاں دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساڑھے بائیس روپے گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

''کوئی گاہک لایا ہے کیا؟'' سوگندھی نے پوچھا

''ابھی تو نہیں، جاتا ہوں دیکھتا ہوں۔'' اس نے کہا تو سوگندھی نے کہا۔

''ارے سن رام لال، واپس آئے گا تو کچھ کھانے کو بھی لیتے آنا، گاہک آئے گا تو اس سے اپنی رقم کاٹ لینا۔''

رام لال نے سنا تو پھر حیران رہ گیا۔ یہ سالی سوگندھی کو ہو کیا گیا ہے، اتنا لالچ کرتی ہے، اب اسے ساڑھے بائیس روپے دیئے ہیں، ان سے نکال کر نہیں دیئے، لگتا ہے دھندے کی اسے ذرا بھی سمجھ نہیں مگر بزنس اسے خوب آتا ہے۔ وہ کوئی بات کہہ نہیں سکا بس اتنا ہی بولا۔

''اچھا لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ نکلتا چلا گیا، اسے سوگندھی کا روکھا پن برا لگ رہا تھا۔

شام گہری ہو کر رات میں ڈھل گئی تھی۔ رام لال تو نہیں آیا لیکن میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ جی کہا کرتی تھی وہ آ گیا۔ وہ اپنی بغل میں برانڈی کے دو اَدھے نکال کر ہر طرف دیکھنے لگا، اس نے بھی وہی سوال کر ڈالا۔

''سوگندھی، یہ تم ہو نا اور یہ تیری کھولی ہی ہے نا، کہیں کسی اور کے ہاں تو نہیں آ گیا میں؟'' وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

''سیٹھ جی، یہ میں ہی ہوں اور یہ میری کھولی ہی ہے۔'' سوگندھی نے دھیمے سے کہا تو وہ پھر اسی حیرت سے بولا۔

''قسم سے تم بڑی ظالم لگ رہی ہو آج، پہلے کبھی اتنی صفائی ستھرائی رکھی ہوتی نا، تو تیرا دھندہ اور چمک جاتا۔''

''وہ تو اب چمکے گا سیٹھ جی، اب میرا بھاڑا تیس روپے ہے۔''

''ہائیں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں تیس روپے دے دیئے تو مچھلی کہاں سے آئے گی، سوڈا کیسے آئے گا؟''

''چل آج تو مجھے تیس دے، سوڈا اور مچھلی میں خود ہی منگوا لوں گی۔'' سوگندھی نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے کہا۔ برانڈی دیکھ کر اس کا بدن بھی ٹوٹنے لگا تھا۔ سیٹھ جی نے جیب سے روپے نکالے اور اسے دیتے ہوئے بولا۔

''یہ ظلم کر رہی ہو سوگندھی۔''

''یہ تو بزنس ہے نا سیٹھ جی...... آپ کاہے کو آتے ہو یہاں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے ایک ادا سے کہا۔ ساتھ ہی اس کی ساڑھی کا پلو گر گیا اور بلاؤز میں سے اس کا سینہ باہر کو یوں نکل آیا جیسے ابھی بلاؤز پھاڑ دے گا۔ سیٹھ جی نے اس کی چھاتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''یہ جو تیری چھاتیاں ہیں نا یہ مجھے یہاں لے کر آتی ہیں، میری دھرم پتنی کا سارا سینہ اکٹھا کر لو تب بھی تیرا ایک طرف نہ بنے۔ باقی تو سب فضول ہی چلتا ہے، یہ تجھے بھی پتہ ہے۔ چل منگا سب کچھ۔''

سوگندھی اٹھ گئی تھی۔

اگلی دوپہر وہ ذرا جلدی اُٹھ گئی۔ وہ سیدھی بازار گئی۔ اس نے سب سے پہلے ایک ساڑھی خریدی۔ ساڑھی پسند کرتے ہوئے اس نے کئی بار لاشعوری طور پر اونہہ کہا پھر جب انگیا لینے دوکان پر پہنچی تو

دوکاندار نے کئی طرح کے انگیا دکھائے، وہ دیکھتی اور اونہہ کر واپس رکھ دیتی۔ دراصل اسے وہ انگیا چاہئے تھی، جس سے سختائی ٹھیک رہے۔ اس نے دو انگیا خرید لئے تو اطمینان ہوا۔ واپس آتے ہوئے راستے پر ایک دوکان میں اسے مورتیاں دکھائی دیں۔ اس کے قدم وہیں رُک گئے۔ دکھ کی ایک لہر اس کے من میں اتر گئی۔ اس نے سوچا، ساڑھی اور انگیا خریدنے سے پہلے اسے مورتی خریدنا چاہئے تھی۔ اسے گنیش جی کی ایک چھوٹی سی مورتی دکھائی دی۔ اس نے کچھ دیر بھاؤ تاؤ کر کے وہ بھی لے لی۔ بہت عرصے بعد اس نے خریداری کی تھی۔ اسے خوش ہونا چاہئے تھا لیکن نجانے کیوں وہ بے سکون تھی۔ اسے لگا جیسے اونہہ نے اس کے سکون میں شامل ہو کر، اسے بے سکون کر دیا ہو۔ ہر شے میں سے اونہہ نکل کر اس کے سامنے آ جاتی تھی۔

واپس آ کر اس نے پرانے کپڑے والی مورتی اتار دی اور اس کی جگہ مٹی سے بنی مورتی رکھ دی۔ وہ کچھ دیر تک ہاتھ جوڑے دھیان گیان میں رہی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ بھگوان سے کیا کہے، اسے کہے کے اس کی زندگی سے اونہہ نکل جائے یا اسی طرح رہے۔ اونہہ بھرا خنک خلا اسے گھیرے ہوئے تھا جس میں اس کی سوچیں تک جم گئیں تھیں۔

''اری او سوگندھی، رام لال بتا رہا تھا تم نے اپنا دام تیس روپے کر دیا ہے، اور تجھے گاہک بھی لگ رہے ہیں، کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں نا۔'' اس نے اپنی نئی ساڑھی کا پہلو لہراتے ہوئے کہا تو جمنا کی نگاہ اس کے سینے پر پڑی، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''تو نے انگیا پہننا شروع کر دی ہے نا، بس میں سمجھ گئی رام لال سچ ہی کہہ رہا ہے۔''

سوگندھی اسے دھندے اور بزنس کا فرق سمجھانا چاہ رہی تھی لیکن جمنا کو جلدی تھی، اس لئے وہ نکلتی چلی گئی۔

وہ واپس اپنی کھولی میں پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ اسے وہاں پڑے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی ہو گی کہ ایک خلا نے اسے گھیر لیا، اچانک ہی حبس بڑھتا چلا گیا۔ اسے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہوں، کبھی اسے یہ کیفیت اچھی لگا کرتی تھی، لیکن اب وہ چاہتی تھی کہ آزاد فضاؤں میں سانس لے، اُڑتے ہوئے کہیں دور نکل جائے۔ ایک خوف زدہ کر دینے والی کیفیت تھی۔ حبس زدہ خلا، گھمن گھیر یا ڈالتا ہوا، اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہا ہے۔ وہ انجانی دہشت میں مبتلا ہو گئی کہ اگر تیز ہوا چلی تو بکھر کر رہ جائے گی۔ اس نے مضبوطی سے پلنگ کو پکڑ لیا۔ اس کا سانس تیز ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی، مٹکے میں سے ڈونگا پانی کا پیا اور پھر سے کرسی پر بیٹھ کر خود کو اکٹھا کرنے لگی۔ اسے لگا، یہ اونہہ اس خلا میں حبس بن کر پھیل گیا تھا۔

''سوگندھی، تیرے ساتھ زمانے نے برا سلوک کیا ہے......'' یہ سوچتے ہوئے اس کے اندر بے چارگی والی کیفیت پیدا نہیں ہوئی جو پہلے ہوتی تھی۔ بلکہ ایک زہر بھری لہر نے اسے بے چین کر دیا۔ لاشعوری طور پر اس کے دماغ میں اس نے سوچا''......لیکن اب میں زمانے کے ساتھ برا سلوک کروں گی۔'' یہ سوچتے ہی اسے ایک گونہ سکون محسوس ہونے لگا تھا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ پہلے جیسے سوگندھی رہی ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنے دام تیس سے کم نہیں کئے تھے۔ اب کہ اس کے گاہک بھی کافی ہو گئے تھے۔ وہ جو کبھی ترنگ میں آ کر جمنا جیسی لڑکیوں کو گُر بتایا کرتی، لیکن جیسے ہی کوئی ہلکی سی جذباتی پریم بھری بات کر دیتا تو وہ سارے گُر ہوا میں تحلیل ہو جایا کرتے تھے۔ وہاں پلنگ پر پھر ایک پیاسی عورت پڑی پیار کے لئے ترستی رہا کرتی تھی۔ اب ایسا نہیں تھا۔ اب وہ کسی کو کوئی گُر بتانے کی بجائے خود اپنے گاہکوں پر آزماتی تھی۔ اب پریم کہیں نہیں تھا بس اُس کے اور گاہک کے درمیان بزنس بجتا تھا۔ وہ پہلے جیسی سوگندھی رہی ہی نہیں تھی۔ وہ جو لاپرواہو کر اوندھی سوندھی ہو کر سونے والی سوگندھی کسی باس مارتے گندے گاہک کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ اس کے بال نہ صرف ریشم کے جیسے ہو گئے تھے، بلکہ وہ ان میں پھول بھی لگا کر رکھتی تھی۔ اس کے اب چند پکے گاہک تھے۔ وہ آتے، اس کی ہتھیلی پر تیس روپے رکھتے اور اپنے پیاس بجھا کر اسے مزید پیاسا کر جاتے۔ اکثر دن کے وقت وہ بڑا اوٹ پٹانگ سوچا کرتی تھی۔ ایک کمی تھی جو اسے بے چین رکھتی تھی۔ اس کمی کی اسے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اگرچہ اس نے اونہہ کو بزنس میں بدل کر خود کو بھی تبدیل کر لیا تھا۔ مگر کمی کا احساس اسے ایک کھردری بے چینی کے ساتھ اس کے اندر کہیں آ بسا تھا جس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اب اکثر اس کے اور اس کی تنہائی کے درمیان پیاس بجنے لگی تھی۔

اس رات جب اس کا کوئی گاہک نہیں آتا تھا، میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ جی کے نام سے پکارا کرتی تھی وہ بھی نہیں آتا تھا تو اسے اپنی چھاتیوں میں اینٹھن محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہ اینٹھن بڑی نازک سی ہوتی تھی، یوں لگتا جیسے ریشم کی گچھیاں پھر رہی ہوں۔ اسے انگیا کے نیچے کی سختائی بھی بری لگنے لگتی تھی۔ ایسے میں وہ خود شراب منگوا کر پینا شروع کر دیتی تھی۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر وہ پلنگ پر سو جاتی۔ تب اسے بڑے عجیب سے خواب بھی آتے مگر صبح اٹھتے ہی وہ سب بھول کر کسی نئے گُر کے بارے میں سوچنے لگتی۔ آخر بزنس بھی دیکھنا تھا۔

کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ باہر والا اس کے دروازے پر زور سے آواز لگاتا تھا۔ کبھی وہ اس سے چائے اور افلاطون بسکٹ منگوا لیتی اور جب کبھی سو رہی ہوتی تب اسے آواز بھی نہ سنتی۔

اس شام بارش بڑے زوروں کی ہوئی رہی تھی۔ ایسے موسم میں گاہک بڑی آسانی سے مل جاتا تھا۔ لیکن رام لال کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ رام لال دلال بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ممبئی شہر کے کسی دوسرے حصے میں نکل گیا ہو، ادھر آیا ہی نہ ہو۔ رام لال جب گاہک لے کر آیا تو رات کافی ہو چکی تھی۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر پرانا فوجی تھا۔ اس نے انگریز کی فوج میں نوکری کی ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی کھولی میں صفائی کی تعریف کی اور بڑے غصے سے شراب کی بوتل نکال کر بیٹھ گیا۔ وہ ساری رات پیتے ہوئے باتیں کرتا رہا۔ جب تک شراب کی بوتل ختم ہوئی، وہ نشے میں بہک گیا تھا۔ سوگندھی بھی کچھ کم نشے میں نہیں تھی۔ باقی جو رات بچی تھی، وہ اسے بھنبھوڑتا ہی رہا۔ اس پرانے فوجی کو آگ لگانا خوب آتا تھا لیکن سوگندھی کو بہت بعد میں پتہ چلا کہ اس میں آگ بجھانے کی سکت ہی نہیں بچی تھی۔ اس وقت تک رات ختم ہونے کو تھی اور وہ فوجی بھی آگ لگا کر محاذ پر بے دم ہو کر اوندھے منہ مدہوش پڑا تھا۔ سوگندھی آگ میں جلتی ہوئی پڑی رہی۔

دن نکلنے میں ابھی تھوڑا وقت تھا، کچھ دیر ہی میں نیلگوں روشنی پھیلنے والی تھی۔ اس نے پرانے فوجی کو اٹھایا اور باہر کی راہ دکھائی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ کپڑے پہن چکا تو بولا۔

''دام تو تیرے اونچے ہیں، پر تجھے کوئی ایسا کام نہیں آتا۔ کبھی فرصت ہو تو اینگلو انڈین لڑکیوں کے بارے میں سوچنا۔ اگر ان کے دام مہنگے ہیں تو انہیں آتا بہت کچھ ہے۔ تم اور تیرے دام..... اونہہ.....''

اچانک ہی وہ اونہہ اس سے لپٹ گئی۔ ایک دم سے اس کا دماغ بھی غصے سے سنگ اٹھا۔ وہ اسے کھری کھری سنانا چاہتی تھی۔ بے ڈول سا پرانا فوجی اسے موٹر والے سیٹھ کی مانند لگا۔ اس کی جی چاہا کہ وہ جی بھر کر اسے گالیاں دے۔ وہ سب کچھ کہہ دے جو اس موٹر والے سیٹھ کو دینا چاہتی تھی، جس نے بیڑی اس کے منہ پر مار کر اونہہ کہا تھا۔ اس نے منہ بھر کر گالیاں دینا چاہی تھیں کہ وہ دروازے کے پار کر گیا۔ وہ گم سم سے کھڑی رہی۔ پھر دروازے کی کنڈی لگا کر کرسی پر آ بیٹھی۔ وہ جلتی ہوئی آگ کی لَو دھیمی کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو مختلف تاویلیں دے کر سمجھا رہی تھی کہ اب یہ دھندہ نہیں بزنس ہے، ایسا تو چلے گا۔ لیکن آگ تھی کہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وہ انہی سوچوں میں اُلجھی ہوئی تھی کہ خلاف توقع باہر والے لونڈے نے اس کے دروازے پر آ کر چائے کے لئے زور سے آواز لگائی تھی۔ ایک بار تو اس نے سوچا کہ اتنی صبح کیوں آ گیا۔ پھر اسے ٹھنڈے موسم کا احساس ہوا۔ طلب تو ایسے ہی وقت ہوتی ہے۔ آواز سن کر اسے بھی چائے کی طلب ہونے لگی تھی۔ حالانکہ پرانے فوجی کی لائی ہوئی شراب سے منہ ابھی تک کسیلا ہو رہا تھا۔ جبکہ نشہ اس آگ میں جل گیا تھا جو

اس پرانے فوجی نے لگائی تھی۔ اس نے باہر والے کو بلا کر چائے لانے کا کہہ دیا۔ وہ پھر سے کرسی پر بیٹھ کر خود کو سمجھانے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔

کسی شے کی عادت بھی بڑی عجیب سی چیز ہے۔ ایک بار اس کے پاس ایک گاہک آیا۔ وہ بے دم سا ہو کر اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ تبھی باہر گلی میں کوئی ماشکیا کنستر بجاتا ہوا گزرا۔ کنستر کی آواز کے ساتھ ہی گاہک چونک گیا۔ وہ یوں بے چین ہو گیا جیسے کسی نشے کی طلب ہو رہی ہو۔ اسی وقت گاہک نے سوگندھی سے پوچھا۔

''اس ماشکیے کو یہاں بلوا لو، بدن ٹوٹ رہا ہے۔''

''یہ تجھے ایک دم سے ہو کیا گیا ہے کنستر کی آواز سنتے ہی.....'' سوگندھی نے پوچھا۔

''پتہ نہیں اس کنستر کی آواز میں کیا ہے، سنتے ہی بدن دکھنے لگتا، من چاہتا ہے کہ کوئی زبردست مالش کر دے۔ بس تو جلدی سے بتا، لاؤں اسے ادھر، ورنہ وہ نکل جائے گا۔'' گاہک نے جلدی سے کہا

''نہ ادھر نہیں آنے کا، تم چاہو تو باہر چلے جاؤ، مجھے تو سونا ہے، میرا بدن بھی دکھ رہا ہے۔'' اس نے روکھے پن سے کہا۔

''تم بھی مالش کروا لینا۔'' گاہک نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کھی کھی کرتے ہوئے کہا تو سوگندھی کو یہ مذاق بالکل بھی اچھا نہیں لگا، اسے نے فوراً اسے چلے جانے کو کہا۔ کنستر کی آواز اب تھوڑی دور چلے گئی تھی۔ اس گاہک نے جلدی سے کپڑے پہنے اور نکلتا چلا گیا۔ وہ دروازے کی کنڈی لگا کر سوچنے لگی، یہ بھلا کیسا نشہ ہوا؟ اس صبح اسے سمجھ آ رہی تھی کہ باہر والے آواز اور کنستر کی آواز سے طلب کیسے جاگتی ہے۔ یہ زندگی ہے نا، دنیا ہے نا۔ یہاں عجیب باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ جیسے یہی باہر والا لونڈا، کچھ دن پہلے اس نے بھی بڑی عجیب بات کی تھی۔ وہ چائے لے کر آیا تو عادتاً اس کی چھاتیوں کو دیکھنے لگا تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو باہر والے کی نگاہیں سیدھی اس کی چھاتیوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ابے تو کیا دیکھ رہا ہے؟''

''کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں.....'' باہر والا گھبراتے ہوئے بولا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' اس نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا۔

''کہا نا کچھ نہیں.....'' اس نے تیزی سے انکار کرتے ہوئے کہا حالانکہ اس کی نگاہیں وہاں سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

''ابے سچ بول.....'' سوگندھی نے پوچھا۔

''سچ بولوں تو کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔'' باہر والے نے تیزی سے کہا۔

''نہیں ہوتی، تم بولو۔'' سوندھی کو اب اس سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ باہر والا کبھی اپنی ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیتا اور پھر انہیں جدا کر لیتا۔ وہ ایسا تیز تیز کرتا چلا جا رہا تھا۔

''میں نا اصل میں کئی دنوں سے دس روپے جمع کر رہا تھا۔'' اس نے ڈرتے ہوئے کہا تو سوگندھی کو ایک دم سے غصہ آ گیا، اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''پر اس کا یہاں سے کیا تعلق، جہاں تو دیکھ رہا ہے؟''

''ہے نا، اسی سے ہی تو تعلق تھا، میرے پاس سات روپے ہو گئے تھے اور میں سوچ رہا تھا جیسے ہی دس روپے جمع ہو جاتے ہیں وہ میں تجھے..... تیرا بھاڑا دے دوں، پر اب.....''

''ارے واہ، باہر والے، تو میرا بھاڑا دے گا۔ لیکن یہ..... پر اب کیا؟'' اس نے مزہ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا اور چائے کی بھرپور چسکی لے لی۔

''پر اب تیرا بھاڑا ہی تمیں روپے ہے، جو میں دے نہیں سکتا۔'' اس نے نا امیدی سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر اس باشٹ بھر کے لونڈے کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''اگر میں یہ تیرے سات روپوں پر مان بھی جاؤں تو تم کرو گے کیا؟''

''یہ میں ابھی نہیں بتانے والا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا

''ارے وہ کیوں؟'' اس نے کہا اور کپ میں بچی چائے پی کر خالی کپ ایک طرف رکھ دیا۔ تبھی وہ باہر والا لونڈا بولا

''یہ تو میں تجھے اس وقت بتاؤں گا جب تم میرے سات روپے لے لوگی اور میں تمہارے ساتھ اس پلنگ پر پڑا ہوں گا۔''

''ارے واہ، کیا تم ہو اور کیا تمہاری بات.....'' یہ کہتے ہوئے اس کے اندر ایک خلا بھر گیا۔ باہر والا کچھ دیر کھڑا رہا پھر پلٹ کر باہر چلا گیا۔

اس نیلگوں صبح میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ پرانے فوجی کی اونہہ اور سیٹھ کی اونہہ میں زیادہ ظالم کون سی اونہہ تھی؟ مگر اس کے اندر وہی خلا بھر گیا تھا، جیسے کوئی بس مسافروں سے خالی ہو کر گیراج میں اکیلی کھڑی ہو۔ ٹھنڈ میں بھی اس کا انجن ابھی تک گرم ہو۔ اس کا دماغ ایک پرانی بوسیدہ کھڑکی کی مانند ہو گیا تھا۔ جس سے ہوا آتی، کمرے کو ٹھنڈا کرتی اور پھر باہر نکل جاتی تھی۔ اس دن تو اس نے اپنا خالی پن،

اپنے خارش زدہ کتے کو اپنے ساتھ سلا کر پورا کیا تھا۔ لیکن آج وہ کیا کرے گی، اس کا کتا بھی تو چند دن ہوئے مر گیا تھا۔ پرانے فوجی کی لگائی ہوئی آگ سے اسے لگا کہ وہ اب تک بزنس کرنے کا دھوکا ہی کرتی رہی ہے، اصل میں تو وہ دھندے کے لائق بھی نہیں ہے۔ دس روپے اس کا بھاڑا زیادہ تھا۔ اسے اپنا پتہ تھا، وہ کیا تھی۔ اس کی رانیں اب بھی سڈول تھیں، بدن کے سارے اعضاء کی دیکھ بھال کر کے، وہ زیادہ مزے کی ہو رہی تھی جس کا اظہار میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ جی کے نام سے پکارا کرتی تھی کئی بار کر چکا تھا۔ دکھ اسے پرانے فوجی کے لہجے کا تھا، اس نے اپنی کمی کو اونہہ میں لپٹ کر اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اور وہ بزنس کے نام پر یہ بتک آسانی سے سہہ گئی تھی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے جی بھر کے گالیاں کیوں نہیں دیں اس پرانے فوجی کو۔ اسے چاہئے تھا کہ اس کے چہرے پر بیڑی کی روشنی پھینک کر اونہہ کہنے والے سیٹھ کو جتنی گالیاں دینا تھی اسے ہی دے دیتی، مگر برا ہو اس بزنس کا، وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس کے بدن کی آگ پر بتک نے جلتی کا کام کیا تھا، وہ بے چین ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟

وہ انہی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ باہر والا اس کے سامنے چائے رکھ کر کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں وہیں تھیں جہاں وہ دیکھا کرتا تھا۔ سوگندھی اس کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ وہ میلا کچیلا تھا۔ اس کے روکھے بال غلیظ سی ٹوپی کے نیچے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے بدن سے عجیب باس آ رہی تھی۔ جیسے میل، دودھ اور دھول آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں۔ یہ بسا ند بارش کے پانی کے باعث کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ اس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ جن کے نیچے سرخ ہونٹوں پر معصومیت جمی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے انہیں جدا کر لیتا۔ وہ ایسا تیز تیز کرتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا تو اس نے عجیب سے لہجے میں باہر والے سے کہا۔

''اے باہر والے، کنڈی لگا۔''

''کاہے کو.....؟'' اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''ابے سالے پہلے کنڈی تو لگا۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا تو باہر والا جلدی سے کنڈی لگا کر آ گیا۔ وہ قریب آ کر کھڑا ہوا تو سوگندھی بولی۔

''تو نے مجھے بات بتانی تھی نا، وہ بتا۔''

''وہ میں تب بتاؤں گا جب یہاں.....'' اس نے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو سوگندھی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پلنگ پر لے آئی۔ باہر والا تیزی سے بولا۔

''اب میرے پاس سات نہیں نو روپے ہیں، وہ میں تمہیں دے دوں گا، چلے گا نا۔''

''ہاں ہاں چلے گا'' وہ سلگتی ہوئی آگ میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔ باہر والے کے بدن سے میل، دودھ اور دھول کی مل جلی باس سے بھی اس کا جی نہیں گھبرایا۔ وہ تو بس اپنے بدن کی آگ بجھا کر اوجھ سے بڑھی وحشت کے حصار سے نکلنا چاہتی تھی۔ باہر والے نے اپنا سر اس کی چھاتیوں سے لگا دیا تھا۔ سوگندھی چاہتی تھی کہ وہ جلدی سے اس کا بلاؤز اتار دے۔ تبھی اس نے باہر والے سے پوچھا۔

''اے باہر والے بتا، کیا بات کہنا چاہتا تھا مجھ سے..... کیوں دیکھتا ہے میری چھاتیاں.....''

باہر والا انجانے کس خمار میں تھا۔ اس نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھا ہوا تھا، تبھی بولا۔

''تم بالکل میری ماں کے جیسی ہو، اس کی بھی اتنی بڑی بڑی چھاتیاں تھیں، وہ اب نہیں رہی، مر گئی ہے۔ میں اس کی چھاتیوں سے لگ کر سوتا تھا۔ میرا بڑا من چاہتا تھا کہ تیری چھاتیوں سے لگ کر سو جاؤں، اسی لئے میں دس روپے جمع کر رہا تھا۔''

یہ سنتے ہی سوگندھی کو لگا جیسے اس کے بدن کی ساری آگ ایک دم سے بجھ گئی ہے۔ وہ خلا نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اونبھ کی جنگ تحلیل ہو گئی تھی۔ اسے لگا، اس کی چھاتیوں میں اشٹھن ہونے لگی ہے۔ اس نے غور کیا، یہ بالکل الگ قسم کی اشٹھن تھی، جیسے کوئی ندی اس کی چھاتیوں میں بہہ نکلی ہو۔ وہ پرسکون سی ہو گئی۔ اس نے باہر والے کو زور سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے اور باہر والے کے درمیان ممتا بچ رہی تھی۔

◂◂ ● ▸▸

18-Rana Town
Hasilpur
Bahawalpur
(Pakistan)
3336347166

● **فرحین جمال**

پلاسٹک کے بوئے

نیند کیا ہے؟..... موت و زندگی کے درمیان ایک پتلی سی لکیر ہی تو ہے..... اس پار سے اس پار آتے آتے روح کا کچھ حصہ وہیں رہ جاتا ہے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد بھی انسان خود کو اس کے سحر سے آزاد نہیں کر پاتا۔ سوتے رہے تو موت اور جاگ گئے تو زندگی.....!

''آج دیر ہو گئی۔'' پینسٹھ سالہ پاسکل بڑبڑایا۔ وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا، بنا الارم اس کی آنکھ ساڑھے چھ بجے کھل جاتی تھی اور آج آٹھ بج چکے تھے۔

پاسکل اس عمر میں بھی چاق و چوبند تھا۔ کمر میں ابھی تک خم نہیں آیا تھا۔ ساڑھے چھ فٹ کا قد، مضبوط و قوی ہاتھ پاؤں، سڈول و سرخی جسم، چہرے پر اگر چہ جھریوں نے جگہ بنالی تھی لیکن اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے عزم و ہمت جھانکتی تھی۔ پہلی نظر میں کوئی بھی اس کی اصل عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

''کیلی!'' اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ ''تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟'' لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ فلیٹ میں سناٹا گونج رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ہلکی سی آواز دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آجاتی۔

''آج اتنی خاموشی کیوں ہے؟'' وہ بدبدایا۔ ان کا فلیٹ شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر، جنرل ہسپتال کے بالکل سامنے ایک بلڈنگ میں واقع تھا جس کے گراؤنڈ فلور پر پاسکل کا فیونرل ہاؤس تھا جسے وہ ''پارلر'' کہا کرتا۔ کاروبار کافی ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو گاہک مل ہی جاتے تھے۔ بستر سے نکل کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کیا اور کچن میں آ کر کافی بنائی۔ ٹوسٹر میں توس لگائے۔

''یہ کیلی کہاں چلی گئی آج؟'' وہ ناشتہ کرتے ہوئے یہی سوچتا رہا۔

نیچے اتر کر آیا تو سڑک بھی سنسان تھی۔ پارلر میں داخل ہوتے ہی پہلا حصہ شوروم پر مبنی تھا جہاں مصنوعی پھولوں کے بڑے بڑے گول ہار قبروں پر چڑھانے کے لئے دیوار پر آویزاں تھے۔ تھوڑا سا آگے جا کر مختلف سائز اور ساخت کے جن میں عام لکڑی کے بکس سے لے کر چیڑ، سرخ لکڑی اور مہاگنی کے قیمتی اور چمکتے ہوئے تابوت اسٹینڈز پر رکھے ہوئے تھے۔ ہر تابوت کے ساتھ ہی نمائش کے لئے لکڑی، سٹیل، پیتل، چاندی کے ہینڈل بھی موجود تھے اور تابوت کے اندر لگائے جانے والا غلاف کاٹن، ساٹن اور سلک میں دستیاب تھا۔

دوسرے حصے میں ایک چھوٹا سا استقبالیہ کاؤنٹر تھا جہاں ایک کمپوٹر، چند فائلز اور ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ چند سیڑھیاں اتر کر دائیں جانب ایک چھوٹا سا کچن، پھر ورک شاپ اور بائیں جانب ''ویک روم'' جہاں میت کو آخری دیدار کے لئے رکھا جاتا تھا۔ ورک شاپ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کی بائیں دیوار میں سرد خانہ اور درمیان میں سٹیل کی میز، واش بیسن اور ہینڈ شاور لگے ہوئے تھے۔ ایک کاؤنٹر پر حنوط کرنے کی مشین نصب تھی جس کے ذریعہ کیمیائی محلول مردے کی شریانوں میں ڈالا جاتا اور دوسری طرف رگوں سے باہر پمپ کیا جاتا۔ اس طریقہ کار سے الاش گلنے سڑنے سے محفوظ ہو جاتی۔ دوسری دیوار میں ایک الماری نصب تھی جس کی درازوں میں مختلف کیمیائی محلول، سرنج، لیٹیکس دستانے، آلات جراحی، ادویات سرجیکل گاؤن، ماسک اور میت کو تیار کرنے کے لئے میک اپ کا سامان، مصنوعی جیولری، پن کلپس وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں ایک طاقتور بڑی سی بھٹی تھی جس کا ایندھن انسانی جسم بنتے۔ جن کے پیاروں کو آگ کے سپرد کرنا ہوتا وہ وہاں لے جائے جاتے اور ایک ہفتہ بعد ایک خوبصورت سے چینی مٹی دھات کے جار میں ان کے پیاروں کی راکھ ان کے حوالے کر دی جاتی۔ تجہیز و تکفین کے لئے تابوت لے جانے والی سیاہ گاڑی ہر وقت پچھلے گیراج میں کھڑی رہتی۔ اسے زیادہ تر پاسکل ہی چلاتا اور چرچ میں جنازے کی سروس کے بعد قبرستان بھی پہنچاتا۔ دنیا کی نظروں سے دور، پارلر کا پچھلا دروازہ گیراج میں کھلتا تھا جہاں میت کو وین سے اتار کر ورک شاپ میں منتقل کیا جاتا۔

پاسکل کا زیادہ وقت ورک شاپ میں ہی گزرتا جہاں وہ اپنے فن اور ہنر سے مردہ جسموں کو ایسے تیار کرتا کہ ان پر زندوں کا گمان ہوتا۔ وہ اکثر سوچتا لوگ جانے کیوں موت سے اتنے خوفزدہ رہتے ہیں کہ اس بھیانک حقیقت کو قبول کرتے ہوئے بھی وہ اپنے پیاروں کو آخری سفر پر بھیجنے سے پہلے زندوں کی سی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس کا معمول تھا کہ سب سے پہلے کمپوٹر کو چیک کرتا کہ ہر نئی آنے والی میت کا سارا ریکارڈ وہاں ہی محفوظ کیا جاتا۔ فائل سے پتا چلا کہ ایک میت لائی گئی تھی اور اسے مردہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ رہ رہ کر یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا کہ کیلی کہاں ہے آج؟ پھر یاد آیا کہ آج تو ہفتہ ہے اور کیلی اپنے بچوں کو ان کے باپ سے ملانے لے کر گئی ہو گی۔ اس نے اپنی ورک شاپ کا رخ کیا کہ کام شروع کرے۔ عموماً میت تیار کرنے میں ایک ہفتہ لگتا لیکن آج اسے فرصت تھی۔ کیلی کی واپسی شام تک متوقع تھی۔ اس نے سوچا کہ کام ہی کر لیا جائے۔ اس نے سرد خانے سے میت کو سٹیل کی ٹرالی پر منتقل کیا، سرجیکل گاؤن، ایپرن پہنا، پاؤں میں ربر کے بوٹ چڑھائے، ماسک پہنا اور قینچی کی مدد سے مردے کے جسم پر سے

کپڑے کاٹ کر اتار دیئے۔ اس کے بعد اس نے جراثیم کش ادویات کا اسپرے کیا۔ پھر ٹرالی کو تل کے قریب لے جا کر میت کو اچھی طرح سے غسل دیا۔ بالوں کو تراشا۔ انہیں شیمپو سے دھویا۔ جسم کو تمام آلائشوں سے پاک کرنے کے بعد تولیہ سے خوب رگڑ کر خشک کیا۔ اس کے بعد اس نے مردے کے بال ہیئر ڈرائر سے خشک کیے۔ یہ کام وہ اتنی توجہ و پیار سے کرتا تھا جیسے کسی بچے کو نہلا رہا ہو۔ اس کی تو ساری زندگی ان مردہ جسموں کے گرد گھومتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر جراثیم کش ادویات کا اسپرے کیا، جسم کو زیر جامہ پہنایا۔

اگلا مرحلہ اس بے جان جسم کو اپنے ہنر سے تر و تازہ دکھانا تھا۔ ہیر اسپرے سے بالوں کو سیٹ کیا تاکہ وہ بکھرنے نہ پائیں۔ شیو بنایا، ناخن کاٹے اور صاف کئے۔ جسم پر خاص تیل و کریم کی مالش کی تاکہ وہ خشک اور مرجھایا ہوا نہ لگے۔ وہ اپنے کام میں جت گیا۔ بھنوؤں کو برش سے سنوارا، چہرے پر سپونج سے مائع بیس اور جلد کی رنگت سے میل کھاتا پاؤڈر لگایا۔ چہرے کی ایک ایک جھری کو محدب عدسے میں بغور دیکھا کہ کہیں جھریوں کے درمیان پاؤڈر رم نہ گیا ہو، اور برش سے زائد پاؤڈر کو جھاڑا۔

میک اپ کرنا اس نے کلاڈیا سے سیکھا تھا۔ کلاڈیا ایک میک اپ آرٹسٹ تھی، کسی مقامی تھیٹر میں اداکاروں کو تیار کرتی رہتی تھی، پھر وہ تھیٹر مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہو گیا تو رشپنسٹ کی جاب کرنے یہاں چلی آئی۔ شروع میں تو وہ ورک شاپ سے خوف کھاتی تھی اور ادھر کا رخ ہی نہ کرتی۔ پاسکل اس کے خوف پر ہنستا، اور کہتا کہ ان بے جان جسموں سے کیا ڈرنا۔ یہ تو اپنی مرضی سے ہل بھی نہیں سکتے بس ربر کے بے جان کھلونوں کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ وہ کہتی۔

''ان کا میک اپ کس لئے؟ یہ کوئی اداکار ہیں؟؟ بعد میں تو انہیں مٹی ہونا ہے۔'' پاسکل مسکرا کر کہتا۔

''ارے پگلیہ! ابھی تو ایک بڑے کھیل کے کردار ہیں جنھیں اس دنیا سے اگلے جہان کے ڈرامے میں اپنا کردار نبھانا ہے۔''

وہ کسی کہنہ مشق مصور کی طرح ہاتھ میں برش تھامے ان زندگی کے ستائے، حالات کے مارے، بیماریوں سے ہارے، مسخ شدہ چہروں کو تھوڑی سی دیر کے لئے زندگی، تازگی اور جلا بخشتا تھا۔ پھر یہ چہرے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائیں گے۔ کہیں کسی دل میں شاید ان کی یادوں کی پرچھائیاں باقی رہتی ہوں گی۔ ان چہروں پر کھنڈی زردی اور موت کی صعوبت سے نیلے پڑتے ہونٹ اس بات کے گواہ تھے کہ وہ کس عذاب سے گزر کر اس تک پہنچے۔ وہ لاڈلے بچوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کرتا، انہیں سنوارتا کہ بس یہ آخری خدمت تھی۔ کبھی کبھی کسی حادثے میں کٹے پھٹے، مڑے تڑے جسم بھی آتے جنہیں سرجری کے

ذریعے دوبارہ جوڑنا پڑتا۔ بگڑے چہروں کو سی کر قابل قبول حالت میں لانا اور پھر میک اپ سے ان کے عیب کو چھپانا اس کا کام تھا۔

باپ کے ساتھ جب کام شروع کیا تو وہ اسے صرف پیشے کا نام دیتا تھا لیکن اب یہ کام ان بے جان جسموں کے لئے اس کے دل میں تعظیم و تکریم اور محبت آمیز ادب و احترام کے جذبات کا درجہ رکھتا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ ایک عملی جذبات سے قدرے عاری شخص ہے جس کے چہرے مہرے سے کسی قسم کے جذبات نہیں جھلکتے۔

بظاہر اس کے کردار بولتے نہیں تھے بس جیسا وہ چاہتا ویسے بن جاتے۔ تمام مردے تیاری کے بعد پلاسٹک کے بوئے لگتے۔ بنا کسی تاثر کے سپاٹ، گونگے، سرد چہرے..... لیکن ورک شاپ کی خاموشی میں ان کے چہرے اس سے ڈھیروں باتیں کرتے۔ ماتھے کی شکنیں ان کے تفکر اور سوچ کا پتا دیتیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے خوابوں، تمناؤں اور خواہشات کا ایک جہاں آباد ہوتا۔ وہ مناظر جو انہوں نے دیکھے اور جن کی چاہ میں وہ مضطرب رہے، اور یہ ادھ کھولے ہونٹ ہولے ہولے اس کی کان میں سرگوشیاں کرتے۔ تالو سے چپکی زبان کڑوے اور میٹھے بول اس کے گوش گزار کرتی جو کبھی کسی دل کو توڑنے اور کبھی لبھانے کے لئے نکلے تھے۔ جھکی گردن موت سے ہار کا اعلان اور ڈھیلے شانے شکست کی داستان سنا رہے ہوتے۔ ہاتھوں کی اکڑی ہوئی انگلیاں اور ہتھیلی کے گٹے شبانہ محنت و جفاکشی کی کہانی سناتے اور سینے میں منجمد یہ دل درد والم کے داغ لئے دھڑکنا بھول جاتا۔ جسم کی چوٹیں اور زخم اس تکلیف کا ذکر کرتے جو اس پر گزری۔ کبھی کبھی کوئی ایسا بھی آتا جس کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں، شاید موت کو دیکھ کر حیرت اور خوف سے۔ ایسی ہی تھی وہ..... کیا نام تھا اس کا؟ پاسکل نے برش سے سر کو کھجایا۔ اس کے چہرے پر گزری یادوں کی جوت جاگ اٹھی تھی اور آنکھیں دور کہیں ان یادوں کا پیچھا کرنے چل پڑیں تھیں۔

''ہاں! یاد آیا..... جولیانا!! یہی کوئی بیس اکیس سال کی ہوگی۔ کاندھے تک ریشمی سنہرے بال، دودھیا رنگت، بیضوی چہرہ، خوبصورت تراشیدہ لب، چمکتی ہوئی سبز خوابیدہ آنکھیں، صبیح و گلابی رخسار اور سڈول بانہیں اور بھرپور گداز جسم..... خودکشی کا کیس تھا۔ اس کی تصویر دیکھ کر وہ کانپ گیا تھا اور اس کی آنکھوں کو بند کرتے اس کے ہاتھ لرز گئے تھے۔ اس کے مرنے کی تو عمر نہیں تھی۔ ان آنکھوں میں کتنے خواب ہوں گے..... یہ بانہیں کتنے چاؤ سے کسی کی گردن میں حمائل ہوتی ہوں گی۔ یہ یاقوتی لب جانے کب کب اپنی بات کہتے جذبات میں مرتعش ہوتے ہوں گے۔ یہ خوبصورت جسم کئی بار جذبوں کی آگ کسی کے پہلو میں پگھلا ہوگا۔ لیکن اب.....! اب صرف ایک بے جان بے ضرر جسم بن کر رہ گیا۔ وہ آنکھیں جو زندگی سے

بھرپور تھیں، سرد، بے تاثر، منجمد، خالی پتھر ہو چکی تھیں۔ نہ کوئی خواب تھا نہ کوئی جذبہ..... ایک جگہ ٹھہر گئی تھیں جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے ان کی ساری روشنی، چمک اور زندگی نچوڑ لی ہو۔ پھونک مار کر جیسے قندیل کو ایک دم گل کر دیا گیا ہو۔ ان آنکھوں سے خواب، امید، خواہشیں اور ارادے چھین لئے جاتے ہیں اور دوسرد پتھر کے ڈلے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

جولیانا کے ریشمی بالوں کو شمپو کرتے ہوئے اسے لیزا یاد آ گئی تھی۔ لیزا اس کی پہلی محبت..... اس کی زندگی..... ویسے ہی سنہرے ریشمی بال تھے اس کے..... وہی زندگی سے بھرپور آنکھیں، خوابوں سے سجی بکھری بکھری سی..... پاسکل ان کو دیکھ کر جی اُٹھتا تھا۔ دونوں پہروں ایک دوسرے کی باتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہتے۔ کبھی پارک، کبھی ندی کنارے، کبھی خلوت میں اور کبھی چاندنی راتوں کی سحر انگیز فضا میں۔ وہ جب اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر ادائے دلربائی سے اس کے کان میں سرگوشی کرتی تو اسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے بدن کی مہک اسے دیوانہ کر دیتی۔ محبت نے دونوں کو ہمیشہ کے بندھن میں باندھ دیا۔ دن سہانے اور راتیں خوبصورت ہو گئی تھیں۔ پارلر کے اوپر فلیٹ اس لئے لیا کہ لیزا سے دوری اسے کسی حال میں بھی پسند نہیں تھی۔ وہ کام ختم کرتے ہی اوپر آ جاتا اور دونوں اپنے سپنوں کو تلاشنے لگتے۔

لیزا ابھی پارلر میں آنے پر رضامند نہ ہوئی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ پاسکل کا آبائی پیشہ ہے اور اس نے اسی مضمون میں ڈپلومہ کیا تھا..... بس فیونرل ہاؤس کی سوگوار فضا اس کی شوخ طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ پہر کو بھی پاسکل فلیٹ میں کھانا کھاتا۔ لیزا آہستہ آہستہ تنہائی کا شکار ہونے لگی۔ سارا دن اکیلی رہتی۔ زندگی میں ایک جمود سا در آیا تھا۔ جاب بھی چھوڑ دی تھی اس لئے بھی وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی۔ پر جب اُمید سے ہوئی تو اس کی طبیعت میں بشاشی لوٹ آئی۔ سارا سارا دن بچے کے کمرے کو سجانے میں لگی رہتی۔ ویک اینڈ پر دونوں آنے والے بچے کے لئے مل کر خریداری کرتے۔ چھوٹے چھوٹے کپڑے دیکھ کر ہنستے، خوش ہوتے۔ لیکن موت اس کے تعاقب میں پارلر سے اٹھ کر گھر تک چلی آئی تھی۔ دوسرے مہینے لیزا کمرے میں پردے ٹانگتے وقت اسٹول سے گر گئی۔ وہ کھانے کے لئے اوپر آیا تو وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ ایک ننھی سی جان دنیا میں آنے سے پہلے ہی زندگی ہار گئی۔ اس حادثے نے لیزا کو ڈپریشن کا مریض بنا دیا۔ اسے پارلر سے نفرت اور خوف آنے لگا۔ وہ سارا دن کھڑکی کے قریب کرسی ڈالے باہر خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ پاسکل نے بہت کوشش کی۔ ماہر نفسیات سے باقاعدہ علاج ہوتا رہا۔ وہ دن میں کئی بار آ کر اس کی خیریت دریافت کرتا۔ گھمانے لے کر جاتا۔ اسے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتا لیکن وہ مزید خاموشیوں میں ڈوبتی گئی۔

ایک دن وہ کسی میت کی تجہیز وتکفین کے لئے چرچ گیا ہوا تھا کہ لیزا اسی کھڑکی سے کود گئی۔ لیزا کی مڑی، خون میں لت پت لاش اس کے ضبط کو آزما گئی۔ اس دن وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ ایک اور بے جان، سرد جسم اس کا منتظر تھا۔ لیکن وہ ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا۔ وہ لیزا کی میت کو کیسے تیار کرتا؟

لیزا کی موت کے بعد گھر سونا سونا لگتا۔ سیڑھیاں چڑھتے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی قبر میں اُترنے جا رہا ہو۔ گھر کے در و دیوار سے اس کی کھنکتی ہنسی کی آواز ابھرتی، الماری میں رکھے کپڑوں سے اس کی خوشبو پھوٹتی۔ اکثر نیند میں اسے بستر پر ٹٹولتا۔ زندگی جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ پھر جب زخم آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے، وقت آگے کی جانب دوڑنے لگا تو تنہائی سے گھبرا کر اس نے کیلی سے دوسری شادی کر لی۔ پہلے شوہر سے اس کے دو بچے بھی تھے۔ بچوں کی وجہ سے خوب رونق ہو گئی تھی۔

اس نے اپنا سر جھٹک کر یادوں سے پیچھا چھڑایا اور اپنے کام میں پھر سے منہمک ہو گیا۔ چہرے کا حتمی میک اپ کرنے کے بعد اس کا بغور جائزہ لیا۔ میت کو صاف شفاف سفید قمیض پہنائی، آستین اور کالر کے بٹن بند کئے، گلے میں نیلے رنگ کی ٹائی اور قمیض کے نیلی دھاریوں والا کوٹ اور پتلون چڑھانے سے پہلے پیروں میں موزے پہنائے، کالے جوتے پاؤں میں ڈالے...... یہ سب کام وہ اتنے اہتمام سے کر رہا تھا جیسے کسی تقریب میں جانے کے لئے تیار کر رہا ہو۔

اب اگلا مرحلہ میت کو تابوت میں منتقل کرنے کا تھا۔ یہ کام وہ اور کیلی مل کر کیا کرتے تھے۔ میت کا وزن موت کے بعد بڑھ جاتا ہے اور انسان مرنے کے بعد بھاری پڑ جاتا ہے۔ خیر اس نے تابوت کی ٹرالی کو میز کے قریب کیا، ٹرالی کے پہیوں میں بریک لگائے اور پہلے میت کا آدھا دھڑ تابوت میں رکھا، سر کو تکیہ پر اور پھر نچلے حصے کو تابوت میں منتقل کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ اس کی پھولی ہوئی سانس اور ماتھے پر آئے قطرے بھی اسے روک نہیں پائے۔ اس نے میت کے کپڑوں کو پھر سے ترتیب دیا، پتلون کی کریز صحیح کی اور کوٹ کی آستینیں کھینچ کر برابر کیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر تابوت کی ٹرالی "ویک روم" کے دروازے کے سامنے لگا دی۔

تمام آلات اور میک اپ میں استعمال ہونے والے برش کو ایک ٹب میں جراثیم سے پاک کرنے کے لئے ڈالا۔ فرش کو پانی ڈال کر دھویا، اپنے دستانے، سرجیکل گاؤن، ایپرن اور ٹوپی اتار کر کوڑے کے ڈبے میں ڈال دی۔ ربر کے بوٹ اُتار کر اپنے موزے جوتے پہنے۔ ورک شاپ کی لائٹ بند کی اور تابوت کی ٹرالی گھسیٹ کر اس چھوٹے سے چیپل کے سامنے لگی میز کے ساتھ لگا دی اور تابوت کے ارد گرد

سفید للی کے پھول سجائے۔ پھر دیوار میں نصب نیلی، گلابی اور سفید ہیڈ لائٹس کی عمودی روشنی کو اس طرح تابوت پر مرکوز کیا کہ چہرے پر تیز روشنی نہ پڑے، ایک خوابناک سی روشنی اس کے چہرے کا احاطہ کرے۔ دیوار میں موسیقی کے لئے نصب ڈیک کے ساتھ پڑی سی-ڈی میں سے دھیمے سروں کی موسیقی کا انتخاب کیا۔ ایک ماہرانہ نظر اتنی محبت اور گھنٹوں کی محنت سے کیے گئے کام پر ڈالی۔ میت کو تیار کرنے کے بعد وہ ایسے خوش و مطمئن ہوتا جیسے بچیاں اپنے پلاسٹک کے گڑیا گڈے کو کپڑے پہنا کر ہوتی ہیں۔ وہ اس کام میں اتنا منہمک تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کب کیلی اندر آ گئی۔ وہ تو سسکیوں کی آواز پر چونکا۔ مڑ کر دیکھا تو کیلی تابوت کے سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے پوچھنا چاہا کہ "کیلی تم کیوں رو رہی ہو؟" اور ایک نظر تابوت میں لیٹی میت پر ڈالی...... دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے بند ہونٹوں سے ایک بے آواز چیخ بلند ہوئی اور فضا میں بکھر گئی۔

«•»

Rue De La Station-188
1410-Waterloo
Barabant Wallon
Belgium

● **گل ارباب**

دا۔ جی

"جب تک میں زندہ ہوں داجی صرف اور صرف میرے ہیں تم لوگ ان کی ساری جائیداد بانٹ لو ان کی ہر قیمتی چیز تمہاری ہوئی لیکن میں داجی کی خدمت میں سے کسی اور کو اپنا حصہ وصول نہیں کرنے دوں گا۔" بیٹے کی بات سن کر داجی نے فخریہ انداز میں اس کی طرف اور شکر گزار انداز میں آسمان کی طرف باری باری دیکھ کر دل ہی دل میں اپنی بیوی خانم جان مرحومہ کو مخاطب کیا "تم ٹھیک کہتی تھیں خانم جانہ کہ پانچ بچوں میں سے ایک عظمت خان ہی ہے جو انسانی شکل میں زمین پر بھیجا گیا فرشتہ ہے اس کا دل بہت مہربان اور نرم ہے انہوں نے چشم تصور سے دیکھا کہ خانم جان فخریہ انداز میں اسے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

اس لمحے عظمت خان کی آنکھوں سے باپ کی محبت روشنی بن کر پھوٹ رہی تھی جس سے اس کا سرخ و سفید چہرہ مزید خوبصورت لگنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے لالہ! جیسا آپ کو مناسب لگتا ہے وہی کریں لیکن باپ کی خدمت ہم سب کا فرض ہے" یہ منجھلا جلال خان تھا جس کی بیوی چچازاد بھی تھی اور اپنا فرض سمجھتی تھی کہ چچا اور سسر کی خدمت کرے۔

"جلال خانہ یہاں مقابلہ فرض اور محبت کا ہے اور محبت ہمیشہ فرض پر سبقت لے جاتی ہے بلکہ محبت ہی تو ہے جو ہر چیز پر سبقت لے جا سکتی ہے۔" چھوٹے مظفر خان نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بھائی کی بات سن کر کہا "لالہ! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ محبت کا وصف اللہ نے صرف آپ کو ہی عطا کیا ہے جس شخص سے محبت کے آپ دعوے دار ہیں ان کی محبت ہماری رگوں میں بھی تو خون کی طرح رواں ہے اور یہ ویسی ہی بے غرض محبت ہے جیسی داجی نے ہم سب سے کی ہے اب محبت بمعہ سود لوٹانے کا وقت آیا ہے تو آپ نے ہمیں حساب میں منفی کر دیا ہے۔" اس کے لہجے میں گلہ تھا۔

عظمت خان باپ کے قریب بیٹھ کر ان کا جھریوں بھرا رعشہ زدہ ہاتھ تھامتے ہوئے بولا "سب جانتے ہیں بچپن سے داجی کا عاشق ہوں۔۔۔ انہوں نے حکم دیا کہ پڑھو تو پڑھائی میں جان لگا دی انٹری ٹیسٹ میں ٹاپر تھا جب اخبار میں تصویر لگی تب ایک خواب دیکھا تھا کہ میڈیکل کی لائین میں جاؤں گا۔ ڈاکٹر بن کر اپنے گاؤں والوں کی خدمت کروں گا لیکن جب داجی نے حکم دیا کہ وکالت پڑھو تب خواب کے گلے پر چھری پھیر دی اور اس وقت کسی فرشتے کی آمد ہوئی نہ میں نے آس رکھی کیونکہ معجزے ہم جیسے انسانوں کے لیے نہیں ہوتے۔ اور بالکل الگ سمت چل پڑا یہ سوچے بغیر کہ اجنبی رستوں پر چلنے سے منزل تو دیر سے ملتی ہی

ہے بھٹک جانے کا خطرہ بھی ہر قدم پر رہتا ہے۔ پھر دل لگا کر وکالت کی ڈگری لے کر داجی کی خواہش پوری کرنے کی خوشی میں گھر لوٹا تب داجی کے حکم کی تعمیل میں روشانے سے شادی کر لی جب کہ......" وہ روشانے کی متغیر رنگت دیکھ کر چپ ہو گیا لیکن روشانے سمیت کمرے میں موجود بھی لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس چپ سے آگے بہت شور ہے۔ وہ اپنے بچپن کی ساتھی وگمہ سے محبت کرتا تھا جس کا باپ اک معمولی چرواہا تھا جو داجی کے پاؤں دبانے اور بدلے میں گندم وغیرہ لینے جب بھی آتا ساتھ اپنی بیٹی وگمہ کو ضرور لاتا تھا جس کے قد اور خوب صورتی کے ساتھ عظمت خان کی محبت بھی بڑھتی رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس نے داجی کو جب اپنی محبت کی کہانی ہکلاتے ہوئے سنائی تھی تو انہوں نے فوری نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے حکم دیا کہ "آئندہ میں تمہارے منہ سے وگمہ کا نام کبھی نہ سنوں۔" عظمت خان نے باپ کے اس حکم پر یوں سر تسلیم خم کیا کہ جب وگمہ کا باپ فوت ہوا تب بھی اسے وگمہ کا باپ کہہ کر افسوس کر رہے تھے کہ وہ اکلوتی اولاد تھی اس کی۔ لیکن عظمت خان نے باپ کے پوچھنے پر بھی یہ نہ کہا کہ وگمہ کا باپ فوت ہوا ہے اس طرح اس کا نام نہ لینے کے حکم کی تعمیل نہ ہو پاتی سو وہ بولا "بابا جان خطاب گل چرواہا فوت ہو گیا ہے۔ نماز جنازہ تین بجے ہے۔" باپ نے سب سمجھتے ہوئے اسے تعریفی انداز میں بغور دیکھا اس کے چہرے پر تابعداری اور احترام کے تاثرات کے ساتھ اک بے نام سی اداسی بھی نظر آ رہی تھی شاید اسے وگمہ کا دکھ ستا رہا تھا یا اسے اپنا وگمہ کو تسلی نہ دینا دکھی کر رہا تھا۔

"عظمت خانہ میں تمہاری بات روشانے بیٹی سے پکی کر آیا ہوں اور پندرہ دن کا وقت لیا ہے اس کے باپ سے نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے کرنے کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟" انہیں فکر تھی کہ وہ انکار نہ بھی کرے لیکن اقرار بہت مشکل سے کرے گا لیکن انہیں حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی جب عظمت خان نے سر جھکا کر بڑے مؤدب انداز میں کہا "داجی جیسی آپ کی مرضی اگر آپ کا حکم ہوتا تو میں شادو چڑیل سے بھی شادی کے لیے تیار ہو جاتا یہ تو روشانے ہے میرے کاکا جی کی بیٹی۔" شادو گاؤں کی انتہائی بدصورت عورت کا نام تھا جو سب خانوں کے گھر گندم دھونے آتی تھی۔ کالے چیچک زدہ چہرے اور بھینگی آنکھوں کے ساتھ لمبے پیلے دانتوں اور میلے گھنگھریالے بالوں کی وجہ سے اسے لوگ شادو چڑیل کہتے تھے۔ عظمت خان اس کے ہاتھوں سے دھلی گندم کی روٹی نہیں کھاتا تھا سبھی کو معلوم تھا کہ اسے شادو کی بدصورتی سے گھن آتی ہے اسی لیے تو گھر والے عظمت خان کے لیے بازاری روٹی منگواتے تھے۔ جب داجی نے اس کی زبان سے یہ سنا تب ان کا سینہ باہر سے اس کی فرمانبرداری پر چوڑا اور اندر سے اس کی محبت پر سرشار ہو گیا تھا۔

روشانے کو شادی کے بعد اس نے ہمیشہ باپ کے حکم کی طرح عزیز رکھا لیکن وہ اچھی طرح جانتی

تھی کہ وہ محبت نہیں مجبوری ہے اسی لیے تو جب وگمہ ملتی وہ اسے کہتی "وہ بے وفا نہیں ہے۔بس اسے اپنے دل کے مختلف خانوں تک دسترس حاصل نہیں ہے محبت کی تقسیم کے طریقے کا علم نہیں ہے۔

وہ باقی کوئی خانہ نہیں کھولتا بس ایک ہی حصے کو سارا دل سمجھ رہا ہے۔باپ کی محبت کو ہی سب کچھ سمجھ کر اس نے تمہیں چھوڑ دیا، مجھے اپنا لیا لیکن سچ کہوں تو وہ نہ تمہیں چھوڑ سکا ہے نہ مجھے اپنا سکا ہے۔" وگمہ کی آنکھوں کی اداسی روشانے کو احساس ندامت سے دوچار کر دیتی تھی اور روشانے کی آنکھوں کا خالی پن ہر بار وگمہ کو اک عجیب سی خوشی اور سرشاری سے آشنا کر دیتا تھا۔روشانے کی آنکھیں جیسے چیخ چیخ کر کہتیں کہ جسے تم بے وفا سمجھ رہی ہو وہ بے وفا ہوتا تو ہم یوں ویران نہ ہوتیں محبت کے رگوں کی قوس وقزح تو کبھی اتری ہی نہیں تھی روشانے کی آنکھوں میں۔

اور جب مور بی بی کا وقت قریب آیا تب عظمت خان کو بہن بھائیوں اور اپنے آپ سے بھی زیادہ داجی کی فکر لاحق ہوگئی۔

"داجی آپ بالکل فکر نہ کریں اگر مور بی بی کو کچھ ہوا تو آپ کو میں اکیلا نہیں رہنے دوں گا آپ کے پاس اسی بستر پر سویا کروں گا جہاں مور بی بی سوتی ہیں۔"

تب بہن بھائیوں کے ساتھ داجی نے بھی اسے گھورا تھا۔"میری عمر بھر کی ساتھی جا رہی ہے ان بچوں کے سر کی چادر اتر رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ میں فکر نہ کروں۔"

"داجی کو مور بی بی سے بہت محبت ہے۔وہ انہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتے نا؟ لیکن مجھے بھی تو داجی سے بہت محبت ہے میں بھلا انہیں کیسے دکھی دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے روشانے کی اوڑھنی کے کونے سے اپنے خدشات باندھ کر پکی گانٹھ لگائی۔تب روشانے نے بڑی حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا تھا "خان جی! جیسے داجی مور بی بی کے لیے تڑپ تڑپ کر روتے ہیں میری آخری ہچکیوں سے آپ کو بھی ایسی ہی تکلیف ہوگی؟" اس سوال کے ساتھ ہی وہ ایسی نظروں سے اسے دیکھنے لگی جن میں صاف لکھا تھا کہ اگر آپ میرے مرنے پر یوں روئیں گے تو میں ابھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔"نہیں اگر میرے کسی بچے کو میرے رونے سے اتنی تکلیف ہو جتنی داجی کے بیٹے یعنی کہ مجھے ہو رہی ہے تو میں نے بالکل نہیں رونا۔" وہ اس کے گول مول جواب سے تشنہ سی اٹھ گئی۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ مور بی بی کی موت کے بعد عظمت خان نے خود کو بھلا دیا تھا وہ بس داجی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں لگا رہتا۔

ایک شام ان کے بہت سارے پرانے دوستوں کو ڈھونڈ کر اکٹھا کیا اور انہیں خوشگوار حیرت میں

مبتلا کر دیا تھا وہ دن بھر پرانے دنوں کی یاد تازہ کرتے رہے اور شام کو جب وہ لوگ چلے گئے تب داجی نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا وہ اپنے کمرے میں آ کر دیر تک اپنے ماتھے کو چھو کر پھر اپنی دو انگلیوں کو لبوں سے لگا کر چومتا رہا۔داجی کو صوفیانہ کلام پسند تھا وہ صوفیانہ کلام کی ہر سی ڈی پہلے دن ہی خرید لاتا اور داجی سن کر سر دھنتے رہتے۔انہیں کشمالو کی خوشبو پسند تھی عظمت خان نے چمن میں نیاز بو کے کئی پودے لگا رکھے تھے اور وہ خود مالی کے ساتھ کھڑے ہو کر انہیں پانی دیتا تھا۔سنبل کے درخت سے داجی کو الرجی تھی اسی لیے تو گھر کے آس پاس کبھی کسی کو سنبل لگانے کی اجازت نہیں تھی۔

کبھی بہن بھائیوں کی شادی بیاہ کے فریضے پورے کر کے وہ حج کے لیے جانا چاہ رہے تھے سب بچے ان کی مخالفت کر رہے تھے کہ ان کی جسمانی حالت ٹھیک نہیں اور کمزوری کی وجہ سے انہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔صرف عظمت خان نے ان کے فیصلے کی حمایت کی اور داجی کو ساتھ لے کر حج کے لیے چلا گیا۔اور پھر سب نے دیکھا کہ جہاں لوگ اس قدر خود غرض ہو جاتے کہ انہیں صرف اپنی پڑی ہوتی ہے وہاں اس نے داجی کو کندھوں پر بیٹھا کر سارے فریضے پورے کیے وہ بہت کہتے رہے کہ وہیل چیئر پر بیٹھا دو لیکن اس نے داجی کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر کہا "داجی میں ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں مجھے محروم نہ کریں۔"

آج بھی چار بیٹے اور ایک بیٹی ان کے آس پاس بیٹھے تھے اور ان کی طبیعت کی خرابی کا سن کر سبھی کام کاج چھوڑ کر وہ اپنی آبائی حویلی میں جمع ہوئے تھے جہاں صرف عظمت خان اور روشانے ان کی خدمت کے لیے موجود رہتے تھے۔

"باقی بچوں نے اصرار کیا کہ ہمارا بھی فرض ہے کہ داجی کی خدمت کریں لیکن عظمت خان نے سب کو چپ کرا دیا وہ سبھی اپنی اپنی دنیا میں مصروف تھے کبھی چھٹیوں میں سبھی بہن بھائی اور بچے داجی کے پاس آتے تو عظمت خان کی محبت باپ کے لیے دیکھ کر انہیں اطمینان ہو جاتا اور کہیں دل میں یہ بھی سوچتے کہ وہ یہ سب نہیں کر پائیں گے۔" مجھے تو لگتا ہے کہ داجی اپنا سب کچھ بڑے لالہ کو لکھ دیں گے کیونکہ وہ ان کے بہت قریب رہے ہیں ہمیشہ سے۔ہم نے تو کبھی ان سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کی۔" بہن کی بات سن کر سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔"اگر وہ ایسا کریں گے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔لالہ جیسا باپ کا عاشق ہم میں سے کوئی دوسرا نہیں ہے۔" وہ سب خاموش تھے۔کسی کو اپنی محبت کے لیے باپ سے لڑنا یاد آ رہا تھا تو کسی کو اپنی ہٹ دھرمی..... کسی کو ان کے خوابوں کا مذاق اڑانا یاد تھا تو کوئی ان سے بدتمیزی پر شرمندہ تھا۔

اسی رات اچانک داجی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔عظمت خان ان کے پاؤں دبا رہا تھا تب

بمشکل سینے میں اٹھتے درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کہا "عظمت خانہ! تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے باپ نے محنت اور ایمانداری سے بہت کچھ بنا رکھا ہے میرے بعد یہ زمین جائداد حویلیاں بینکے کے پیسے کاروبار وغیرہ سب آپس کی دشمنیوں کا سبب بنیں گے کسی کو کاروبار میں حصہ چاہیے ہوگا اور کسی کو شہر کی جائداد کسی کو نقد پیسے اور کسی کو گاؤں کی زرعی زمین۔تم سب بچوں کی فطرت سے واقف ہوں میں۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہیں ان چیزوں کی پروا نہیں ہے۔میرے لیے تم سب برابر ہو۔میں نے باقی سب سے اجازت لے لی ہے وہ کہتے ہیں آپ کی مرضی ہے آپ جس کو جو دینا چاہیں ہمیں اعتراض نہیں ہے اس لیے یہ ایک وصیت نامہ لکھ لو۔اس کے بعد میرے بچے بھی ایک دوسرے کے دشمن نہیں بنیں گے اور میری آخرت بھی سنور جائے گی۔تم وکیل ہو ساری قانونی پیچیدگیوں سے واقف ہو۔مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے تم لکھو۔" ان کی پیلی رنگت کی طرف دیکھتے ہوئے عظمت خان نے انہیں تسلی دی۔"خدا نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو..... خدا میری زندگی بھی آپ کو لگا دے۔آپ فکر نہ کریں میں گواہان سے دستخط کراتا ہوں۔بس آپ بولیں تاکہ میں لکھ دوں۔" عظمت خان کی آواز لرز رہی تھی اور رنگت متغیر تھی۔اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور سانسوں کو نگلتے ہوئے جیسے جیسے یہ الفاظ جلا رہے تھے "تم سب میرے لیے برابر ہو۔میں نے سب بچوں سے بات کر لی ہے سب نے کہا ہے کہ آپ کی چیز ہے آپ جسے دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔میں یہ سب کچھ کسی نیک مقصد یا صدقہ جاریہ میں لگا دوں تو میں جانتا ہوں تم دل سے خوش ہو گے۔جس بیٹے کو میری فانی زندگی کی اتنی فکر ہے اسے یقیناً میری ابدی حیات کی فکر بھی ضرور ہوگی۔" داجی بول رہے تھے۔وہ لکھنے لگا "میں یہ ساری جائداد بینک کے پیسے اور کاروبار ایک ایسے ادارے کے نام کرتا ہوں جو غریبوں اور بیواؤں کی فلاح وبہبود کے لیے کام کر رہا ہے۔" وہ دم بخود سا داجی کی شکل دیکھنے لگا وہ ان پڑھ تھے۔دستخط نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے انگوٹھا لگا دیا۔منشی صاحب اور کریم چاچا نے بطور گواہان دستخط کر دیے اب وہ سکون سے سو گئے تھے۔

وہ ان پر کمبل ٹھیک کر کے باہر نکل آیا۔صحن میں سرد ہوا چل رہی تھی مگر وہ موسم کی خنکی سے بے خبر سوچ میں گم مسلسل ٹہل رہا تھا۔حجرے کی طرف سے کتے کو کی کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔اس وقت تک کتے کو کھول دیا جاتا تھا لیکن آج کریم چاچا شاید کتے کی زنجیر کھولنا بھول گیا تھا۔عظمت خان نے آواز دے کر پوچھا "کریموا! کوکی کو کیوں نہیں کھولا؟" وہ پھولی سانسوں پر قابو پاتا دوڑتا ہوا آیا "خان جی کوکی نے جب سے مرغی کا بچہ کھایا ہے مرغی کا خون اس کے منہ کو لگ گیا ہے جیسے ہی کھولتا ہوں مرغیوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ شام سے دو مرغیوں کو چیر پھاڑ کر مار دیا ہے اس نے اسی لیے پھر باندھ دیا ہے۔" کریم چاچا نے جلدی جلدی

سارا قصہ سنایا۔

"تم ایسا کرو مرغیوں کو بڑے پنجرے میں بند کر دو اور کوکی کو کھول دو۔" وہ ہاتھ میں پکڑے کاغذ کا گولا بنا کر قریب پڑی ٹوکری میں پھینک چکا تھا۔

"کوکی..... کوکی" اس نے کتے کو پاس بلایا تو وہ اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔پچھلے دنوں بکرا ذبح کر کے کاٹتے ہوئے قصائی نے گوشت کا ایک ٹکڑا اس کے آگے پھینک دیا تھا۔اس کے بعد جیسے ہی وہ کھلا بھینسوں کے باڑے کی طرف بھاگتا اور بکروں پر حملہ کرتا تھا۔اس کے حملے سے ایک بکری بھی زخمی ہو چکی تھی اب کوکی کو کھولنے سے پہلے باڑے کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔

"ارے بدتمیز تمہارے منہ کو اب مرغیوں کا خون لگ گیا ہے؟" عظمت خان نے اس کے لمبے کالے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا تو وہ زبان نکال کر اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔

دوسری صبح وہ نماز کے لیے اٹھا تو حسب معمول داجی کے کمرے میں گیا۔وہ بالکل سیدھے بے حس وحرکت لیٹے ہوئے تھے عظمت خان نے ان کی کھلی آنکھیں دیکھ کر نبض چیک کی تو انکشاف ہوا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

عظمت خان نے بے اختیار سسکتے ہوئے سر ان کے سینے پر رکھ دیا اس کی آنکھوں سے دو آنسو گر کر داجی کی قمیض میں جذب ہو گئے تھے۔اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر ان کے تکیے کے نیچے سے چابیاں نکال کر ان کی الماری کھولی اور چند چیزیں اپنی جیبوں میں ڈال کر کچھ سامپ نکالے ہی تھے کہ رحیم چاچا حسب معمول چائے کا تھرماس اور کپ ٹرے میں رکھے اندر داخل ہوا۔اندر کی صورت حال نے اس کے اوسان خطا کر دیئے اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔عظمت خان باہر نکل آیا۔"اٹھو روشانے! اس نے بیوی کو جگایا "داجی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" اس کی آواز بالکل سپاٹ تھی۔روشانے نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹتے ہوئے سوچا صدمے کی زیادتی سے اس کا شوہر چپ ہو گیا ہے۔سبھی آ گئے تھے۔

"داجی کی وصیت کے مطابق انہیں میں اکیلا نبھلاؤں گا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہہ کر غسل والے کمرے کا دروازہ بند کر لیا سبھی دونوں کی محبت سے واقف تھے اس لیے چپ رہے۔

کچھ دیر بعد کفن میں لپٹے داجی کی لاش کو تابوت میں ڈالنے کے لیے اس نے لوگوں کو اندر بلا لیا۔

اسی رات سب بہن بھائیوں کے سونے کے بعد وہ منشی صاحب اور کریم چاچا سے ایک کاغذ پر دستخط کراتے ہوئے انہیں بتا رہا تھا کہ رات ایک جگہ ان کی وصیت پر دستخط لینا بھول گیا تھا اور کسی کو بتانا نہیں

کیونکہ اس طرح داجی کی وصیت مشکوک ہوسکتی ہے۔" وہ کاغذ لے کر داجی کو غسل دینے والے کمرے میں آیا اور چند پل کے لیے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ کریم چچا نے بھیگی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتے ہوئے سوچا شاید اس کمرے میں باپ کی یادوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ سارے آنسو بہالے جو صبح سے اس کے اندر گر رہے تھے۔ وہ سر جھکا کر اپنی پگڑی کے کونے میں آنسو جذب کرتے ہوئے حجرے کی طرف چلا گیا۔

چند منٹ کمرے میں گزار کر عظمت خان ان کاغذوں کو دیکھتے ہوئے باہر نکلا۔ کاغذوں کے مطابق داجی نے وراثت سے ہٹ کر اپنا سب کچھ عظمت خان کو ہبہ کر دیا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے کے بالکل قریب نیم تاریک گوشے میں کھڑا عجیب سے انداز میں کوکی کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی جاسکتی تھی۔ کوکی اس کی آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا اور اسی لمحے پلاسٹک کے شاپر میں موجود کوئی چیز اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کوکی کی طرف پھینک دی۔ کوکی نے وہ چیز جھپٹ لی اور خوشی خوشی منہ مارنے لگا۔

صبح گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔

"سنا ہے ساری جائیداد تحفتاً دے گیا ہے بڑے بیٹے کو۔"

"ہاں تو بیٹے نے تھوڑی خدمت تو نہیں کی۔"

"ارے بہن ٹھیک کہتی ہو۔ مگر خدمت کا بدلہ دولت ہرگز نہیں ہے۔" ایسی ہی سرگوشیاں اس کی سماعتوں میں پڑ رہی تھیں۔ لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے داجی کی آواز سب آوازوں سے نمایاں ہے، "میرے لیے سب بچے برابر ہیں۔"

شام ہوتے ہی گھر مہمانوں سے خالی ہونے لگا تو رحیم چچا نے معمول کے مطابق کوکی کی زنجیر کھول دی کوکی حیرت انگیز طور پر حجرے کے کھلے گیٹ سے باہر کی طرف بھاگا رحیم چچا تیزی سے کوکی کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

گھر کے قریب ہی خانوں کا پرانا قبرستان تھا۔ کریم چچا نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا۔ کوکی داجی کی قبر کی مٹی پنجوں سے کھود رہا تھا۔

« • »

House of SP
Arbab Shafiullah
Vill:Ranoghari
Chamkani Deh
Dist:Peshawar(Pakistan)-Mob:03129423534

● ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

ایک مزدور کی موت

"باڈی کولکاتا بھیجنی ہے، کیا خرچ آئیگا؟" ملک سیٹھ سیدھے ممبئی کے مشہور ماہم چرچ کے قریب 'مائیکل پنٹو اینڈ ریکرز' کے دفتر پہنچے اور کلرک سے پوچھا۔

"ساڑھے تیرہ ہزار سر۔ آٹھ ہزار کارگو کا، پانچ ہزار پیکنگ کا، کیمیکل لگانا...... اسپتال سے سرٹیفکیٹ لینا کہ ٹھیک سے پیکنگ ہوا ہے...... یعنی سب کچھ۔" چوڑے چہرے اور بائیں کان میں چھوٹی سی چاندی کی بالی پہنے ناٹے شخص نے جس کا نام مائیکل تھا، ذرا رک کر جواب دیا۔

"سب کچھ یعنی؟" ملک سیٹھ نے اور وضاحت چاہی۔

"یعنی...... آپ مجھے این او سی اور کاز آف ڈیتھ سرٹیفکیٹ لا کر دے دیجئے...... باڈی دے دیجئے، باقی سب ہم کرلیں گے۔ بس آپ کو یہی کرنا ہے کہ باڈی وہاں کولکاتا میں ریسیو کرنی ہے۔"

"جیسے ہی یہ سب ریڈی ہوگا، ہم آپ کو فون کردیں گے، آپ سائن اسپتال آجانا۔" ملک سیٹھ نے اس کی بات سے مطمئن ہو کر کہا۔

"ایڈوانس دیتے ہو کیا؟" کلرک نے پوچھا۔

"دیتے ہیں نا! پہلے پروسیجر تو ہو جانے دو۔ ابھی ایڈوانس کی کیا ضرورت ہے؟" ملک سیٹھ اس کی جلد بازی سے ذرا سا ناخوش ہو کر بولے اور کرسی سے اٹھ کر لائیٹر سے سگریٹ جلائی اور ہونٹوں میں دبالی۔ پھر دھیمی چال چلتے ہوئے اپنی انووا کار کی طرف بڑھ گئے۔

'مائیکل پنٹو اینڈ ریکرز' کے پاس سے ملک سیٹھ سیدھے سائن اسپتال پہنچے۔ کستوربا اسپتال سرکاری ہے، جو سائن اسپتال کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اسپتال کے گیٹ ہی میں پولس چوکی ہے۔ منڈل اور اس کا بھائی وہیں کھڑے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کی لاش مردہ خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ سیٹھ کو لہراتی زلفوں کے ساتھ کار سے اُترتے ہوئے دیکھ کر دونوں انکی طرف لپکے۔

منڈل، ملک سیٹھ کے کنسٹرکشن سائٹ میں سے ایک، مہاراشٹر کے نئے صنعتی علاقے رانجن گاؤں میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو سیٹھ کے پاس کام پر لگانا چاہتا تھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" اپنے ائیر کنڈیشنڈ ہلکے نیلے آفس کے ریوالونگ چیئر سے کمپیوٹر سے گردن اُٹھا کر سیٹھ نے منڈل سے سوال کیا۔

"روحیم!"

"روحیم؟...... رحیم نام ہوگا؟"

"ہاں صاب!"

"مسلمان ہو؟"

"ہاں صاب!"

"کیوں بھئی منڈل! تم شومن منڈل اور یہ رحیم؟ یہ کیسے؟"

"میرا نام شولیمان منڈل ہے صاب۔ اسکول میں ٹیچر نے شومن لکھ دیا۔"

"شومن منڈل، تم سُلیمان منڈل؟؟ اوہ!" سیٹھ اپنی حیرانی کو درگزر کرتے ہوئے بولے۔

"ہاں...... منڈل تمہارا نام نہیں سرنام ہے۔ مگر میں تمہیں اسی نام سے بُلا تا رہا۔ اب گاؤں سے اپنے بھائی کو کام پر لائے ہو، تبھی تمہارے نام پر دھیان گیا ہے، ورنہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ تم مسلمان ہو! شاید کسی اور کو اِس کا پتہ بھی نہیں ہو!"

"جی صاب!" منڈل نے سر جھکایا۔

"اچھا خیر! میں رحیم کو اپنے دوسرے سائٹ، 'پریسیشن میٹل' میں ہیلپر کے طور پر لگا دیتا ہوں۔ یہ سائٹ انگر گاؤں میں واقع ہے۔ پتہ ہے نا؟" سیٹھ کام کی بات پر آگئے۔

"یہیں اپنے رائے گڑھ ضلعے میں نا صاحب؟"

"ہاں ہاں! ارے یار!...... یہیں، خالہ پور سے آٹھ کلومیٹر کی دوری پر!"

"جی صاب۔"

ملک نے رحیم کو ایک اچٹتی نظر سے دیکھا۔ وہ گورا، اونچا تگڑا، تیس سال کا خوبصورت جوان تھا۔ جبکہ اس کا بھائی ٹھگنا اور کچھ گہرا سانولا سا تھا۔ دونوں بغیر مونچھ، داڑھی والے تھے۔ وہ چہرے مہرے اور خاص طور پر اونچی پیشانی سے بھائی نظر آتے تھے۔ رحیم کی طرح اس نے بھی اپنی پتلون کا پائنچہ ذرا سا موڑ رکھا تھا۔ اس کی شرٹ کچھ لمبی تھی، جس کا ایک سرا اس کی پتلون کی کمر میں پھنسا ہوا تھا۔

"جوڑی سے کام کروگے؟ تمہاری بیوی بھی کام کرے گی؟" ملک نے رحیم سے پوچھا۔

"نہیں صاب! میرے سات اور آٹھ سال کے دو بچے ہیں۔ بی بی گر بھ تی ہے۔ گھور میں رہتی ہے۔" وہ بولا۔

"گھور؟"

"ہمارا گھور پرسون نگر میں ہے، تعلقہ جولنگی، ضلعہ مرشد آباد۔"

"اچھا، تو تمہارا گھور پرسن نگر میں ہے۔"

"اور مرشد آباد؟" ملک ابھی چھیڑ کر مزے لینے کے موڈ میں تھا۔

"کولکاتا سے ساڑھے تین گھنٹے کا بس کا سفر ہے۔ ہم لوگ اسی روپے بھاڑا دیتا ہے صاب۔"

"گھور چھوڑ کر تمہیں بھی یہاں کیوں آنا پڑا؟ اور آئے ہی تھے تو بیوی کو لے آتے۔ اسے گھور چھوڑ کر کیوں آئے۔" ملک کو اپنے سوال کرنے کی حماقت پر ہنسی آگئی۔ بیچارے 'روحیم' کو لفظ 'گھور' کو سمجھانے کے لئے اسے اتنی تفصیلات بتانی پڑیں۔ اس نے بنگالی لہجے میں اسکے گھر کو "گھور" بولنے کا مزہ لیتے ہوئے اسے چھیڑا تھا، تا کہ وہ ایک آدھ بار اسے پھر بولے۔ رحیم کے منہ سے اس کا بولنا بھلا بھی تو معلوم ہو رہا تھا۔

"گھور میں کل اگیارہ لوگ رہتا ہے سیٹھ۔ ماں پتا بھی ہیں، پتا جی کی گاؤں میں پانچ بیگھا زمین ہے۔ جوٹ بیرتا ہے۔ جولائی اگست میں کاٹتا ہے۔ پھر چاول یا گیہوں بیرتا ہے۔ میرا عورت گھور چھوڑ کر اِدھر آ نہیں سکے گا۔" رحیم نے گھبرا گھبرا کر سب کچھ کہہ دیا۔

اُس دن رحیم کو بخار تھا مگر اس کا سُبھاؤ ایسا تھا کہ وہ گھر پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ سائٹ پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو انہماک سے پسینہ بہاتے دیکھا تو ہنس کر بولا۔

"کیا چل رہا ہے۔ چار چار لوگ ایک پتھر کے پیچھے پڑے ہیں۔" پچھلے سال بھر میں رحیم اپنے منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو دشمن تو بنا ہی چکا تھا۔ ساتھیوں کو لگتا کہ اپنے سخت محنتی اور صحتمند ہونے کا اسے گھمنڈ تھا۔

"اب یہ آگیا ہے تو اکیلا ہی اٹھا لے گا۔" مذاق اُڑانے کا موقعہ ملتے ہی ساتھی مزدور اس کا فائدہ ضرور اٹھاتے۔

"خود کو جو سمجھتا ہے سمجھ لے، ہم کو کیوں کام چور جتاتا ہے!" چاروں آدمی ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے کہہ رہے تھے۔ پھر وہ پتھر چھوڑ کر پرے ہٹ گئے۔

"کیوں تم چاروں میں دم نہیں ہے کیا؟" رحیم بھی پھبتی کسنا نہیں بھولا۔

"تیرے میں تو ہے نا؟ اٹھالے یار...... اٹھالے......" رحیم نے پوری طاقت لگا کر پتھر کو اٹھا کر پرے پھینک دیا اور بے دم ہو کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ چند منٹوں میں ہی اسے خون کی قے ہوئی۔

"ایسا کیوں ہوا؟" رحیم کے چاروں ساتھیوں کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ "اس سے پہلے بھی وہ

ایک بارایسا کرتب دکھا چکا ہے نا؟'' ایک ساتھی نے شرمندہ ہوتے ہوئے دوسرے ساتھیوں سے پوچھا۔سائٹ پر ہنگامہ ہوگیا۔وہی چاروں ساتھی کمپنی کی گاڑی میں اسے قریبی شہر کھپولی لے گئے۔رحیم کے بھائیوں کو اطلاع دے دی گئی تھی۔وہ اسے مہاویر گارڈن کے قریب کے ڈاکٹر واگھ کے اسپتال لے گئے، جہاں مزدوروں کا بل کمپنی بھرتی ہے۔

''دو بار اور ایسی خون کی الٹی ہوئی تو بچے گا نہیں۔'' ڈاکٹر واگھ نے کہا۔''نئی ممبئی کلمبولی کے سرکاری اسپتال لے جاؤ۔''

دو ہزار روپے خرچ آیا۔رات میں روحیم نوسکھئے ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہا۔اگلی صبح بڑا ڈاکٹر آیا۔بولا۔

''ہمارے پاس اس بیماری کا علاج نہیں ہے۔اس کی اینڈوسکوپی کرنی ہوگی۔یہاں مشینیں نہیں ہیں۔سائن اسپتال لے جانا ہوگا۔سمجھے؟''

''ٹھیک صاب!'' منڈل پریشان ہوکر سر ہلا رہا تھا۔

''یہ دوا انجکشن نیچے کے میڈیکل سٹور سے لے آؤ۔الٹی کنٹرول میں آجائے گا۔پھر تم اس کو لے کر نکل جانا۔'' میڈیکل سٹور والے سے انجکشن کی قیمت سن کر منڈل چکرا گیا۔ایک انجکشن کی قیمت ایک ہزار تین سو تھی۔

''میرے پاس دو ہزار روپے ہیں ڈاکٹر صاب!'' وہیں سے اُس نے ڈاکٹر کو فون لگایا۔

ٹھیک ہے ایک انجکشن ہی لے آؤ۔'' ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

رحیم کی قے کے سلسلے بند ہوئے لیکن کچھ دیر بعد ایمبولینس میں ممبئی لے جاتے ہوئے پھر شروع ہوگئے۔سیٹھ سے پیسے منگوا کر منڈل بھائی کو ایمبولینس میں سائن اسپتال لے گیا تھا۔وہاں وارڈ بوائے سے منڈل نے، آر۔ایم۔او۔ڈاکٹر سے رحیم کو پہلے دیکھنے کی درخواست کرنے کو کہا، تو اس نے بُری طرح جھڑکا۔

''ایمرجینسی ہے صاب۔'' منڈل گڑگڑایا۔

''ڈاکٹر ایمرجینسی کیس نہیں لیتا۔لائن سے لیتا ہے۔''

کافی دیر بعد اُن کی باری آئی۔

''اس کا ایکس رے نکالو۔'' ڈاکٹر نے رحیم کو جانچے بغیر ہی کیس پیپر دیکھ کر منڈل سے کہا۔

''رحیم کو دس بارہ سال میں ایک بار تیز بخار آتا ہے۔ہمارے گھر میں کسی کو ٹی بی نہیں ہے۔''

منڈل نے اپنی سمجھ سے ڈاکٹر کو اطلاع دے کر علاج میں اس کی مدد کی۔مگر وہ کوئی پرائیویٹ

ڈاکٹر تھوڑے ہی تھا کہ اس کی بات پر دھیان دیتا!

''کاؤنٹر پر پیسہ جما کرادو۔'' اس نے کہا اور گھنٹی بجادی۔

وارڈ بوائے کی رہنمائی سے منجھلے بھائی شفیقل کو بنچ پر روحیم کے ساتھ بٹھا کر منڈل نے کاؤنٹر پر دو سو روپے جمع کرائے اور رحیم کو لینے آیا تو اُسے وہاں نہیں پایا، تو منڈل نے پریشان ہوکر بھائی سے پوچھا۔

''روحیم کو کہاں لے گئے شفیقل؟''

''وہ بیہوش ہو چکا تھا اور اسے فوراً کیزوالٹی روم میں لے جاکر آکسیجن ماسک لگایا ہے۔'' شفیقل بولا۔آدھا گھنٹہ مشکل سے گذرا ہوگا کہ وارڈ بوائے نے دونوں کو کیزوالٹی میں بلایا۔

''اس کی عورت کو بُلانے کا، پولس اسٹیشن جانے کا، نوند(؟؟؟؟؟درج) کرانے کا اور پیپر کراکے باڈی لے جانے کا۔'' رحیم کے چہرے سے آکسیجن ماسک نکالتے ہوئے وارڈ بوائے بولا۔اُس کی بات سن کر دونوں بھائیوں کی خشک آنکھیں پھیل گئیں۔چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''کیا وہ مرگیا؟'' منڈل نے چیخنے کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' وارڈ بوائے بولا۔

''وہ اسپتال میں پہنچنے کے گھنٹے بھر میں مرگیا؟؟'' شفیقل نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ پر قابو پانے کی کوشش کی۔دونوں بھائی پولس اسٹیشن کی جانب بڑھے۔

''روحیم کو لے کر کیسے جائیگا؟ اس کی عورت تو گاؤں میں ہے۔تین دن لگے گا ادھر ممبئی آنے کو۔'' گیٹ کے قریب پہنچ کر منڈل نے شفیقل سے تشویش ظاہر کی۔

''گھبراؤ مت دادا، میری عورت تو یہیں ہے نا! اس کو فون کرتا ہوں۔''

''تیری عورت!''

''ہاں، پھر کیا کرے گا؟''

''لڑکا لوگ کو وہ کدھر یہاں اسپتال میں لائے گی!''

''چھوٹا بچہ لوگ کو بازو والوں کے گھر چھوڑ کر بڑے کے ساتھ نکل آئے گی، دادا!''

''وہ یہاں آکر کیا کرے گی؟ یہاں پہلے ہی پریشانی ہے۔''

'' 'میں روحیم کی عورت ہوں'، بول کر وہ یہ کام کردے گی۔''

''تو اپنی عورت کو روحیم کی عورت بتائے گا، شوفیقل!!'' منڈل نے تکلیف کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں۔ورنہ لمبے ٹائم تک باڈی کے لئے لٹکے رہیں گے۔''

''پولس کو معلوم نہیں پڑیگا، دادا؟''

''کیسے معلوم پڑے گا؟ انگوٹھا ہی لگانا ہے نا!''

صبح دس بجے شفیقل کی بیوی سائن اسپتال کے پولس سٹیشن پہنچی۔اس وقت انسپکٹر پاٹل بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ایک حوالدار دوسری میز پر پڑی ہوئی فائلیں ٹٹول رہا تھا۔

''یہ کس کو پکڑ کر لایا ہے؟ تیرا عورت ہے کہ تیرا؟''

انسپکٹر منڈل اور شفیقل ایسے دکھائی دئے جیسے اُن پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔

''باڈی کا عورت تو گاؤں میں ہے۔دو دن کا راستہ ہے۔ہے نا؟''، انسپکٹر پاٹل مسکرا کر شفیقل کی بیوی کو گھورتے ہوئے بولا۔وہ اسے شوخ ہرے رنگ کی لنگی، جبہ پہنے ہوئے ممبئی نگری میں کسی روایتی لباس کے مقابے میں حصہ لینے جارہی خاتون سی لگی۔

''صاحب ایڈجسٹ کر لیجئے۔'' شفیقل کی بیوی نے اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ہمت کی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔''کرپا کریئے صاحب!''

''اے حوالدار، ایسا کر۔یہ بائی کو اندر ڈال رے۔'' انسپکٹر پاٹل چائے کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر ٹھنڈے لہجے میں بولا۔تینوں چپ چاپ وہاں سے نکل آئے۔

''صاحب کو کیسے معلوم ہوا کہ بودی (بھابی)، روحیم کا بی بی نہیں ہے؟'' باہر نکل کر منڈل نے حیرت سے شفیقل کا منہ دیکھا۔

''سادہ لباس میں گیٹ میں سی آئی ڈی گھومتا ہوئے گا، ہماری بات سن لیا ہوگا......ورنہ سائن کرکے لے جاتے!'' منڈل نے افسوس کے ساتھ کہا اور تینوں ایس ٹی ڈی بوتھ کی جانب بڑھے۔

''سیٹھ، یہ لوگ روحیم کا باڈی نہیں دیتا ہے۔'' منڈل نے ملک سیٹھ کو فون کیا۔

''کیا؟؟ روحیم مرگیا؟؟؟''

''آپ آؤ تو کچھ ہوئے گا۔اب بس آپ کا سہارا ہے۔پلیز صاحب!'' منڈل کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ویسے بھی ملک سیٹھ اپنے یہاں کام کرنے والوں کو پریوار کی طرح رکھتا تھا۔فوراً کار نکالی اور ممبئی پہنچ گئے۔

''اس کی عورت آئے گی تو ہی باڈی ملے گی۔'' انسپکٹر نے ملک سیٹھ سے بھی وہی کہا۔

''وہ کولکاتا میں ہے صاحب!''

''معلوم ہے۔کولکاتا میں ہے تو کیا؟ اب اس کی عورت کو فون کرو۔پولس کے سامنے اس کو کھڑا

کرو اور باڈی لے جاؤ۔''

''یہ لوگ بھی ان پڑھ ہیں اور مجھے بھی ضروری کام ہے۔زیادہ دیر رُک نہیں سکتا۔میں تو صرف ان کی مدد کے لئے آیا ہوں۔''

''تو کیا کرنے کا؟''

''اُس کی عورت کو کولکاتا سے ممبئی آنے کو تین دن تو لگے گا۔''

''تین دن لگے گا؟'' انسپکٹر نے ملک سیٹھ کی اس کیس میں دلچسپی دیکھ لی تھی، نرم پڑ گیا۔بولا، ''تو ایسا کرو، وہاں سے اس کی عورت کا فیکس منگوا لو کہ 'میں بیمار ہوں اور میرے مرد کا باڈی میرے دیور کو دے دو۔' پولس اسٹیشن چٹھی دے گا، تبھی باڈی ریلیز ہوگا۔'' منڈل ایس ٹی ڈی بوتھ کی طرف دوڑا۔لوٹ کر بولا۔

''وہاں فیکس نہیں ہے، بولتے ہیں۔کولکاتہ سے پچاس کلومیٹر کی دوری پر مرشدآباد شہر ہے صاب! وہاں سے بائیس سو کلومیٹر پر ہمارا گاؤں ہے۔کوئی مرشدآباد جانے والا نہیں ہے۔کوئی فیکس کرنے والا نہیں ہے۔''

ملک سیٹھ نے انسپکٹر کے آگے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔یکلخت اسے یاد آیا کہ اس کی چھوٹی سالی کے بیٹے نہال کی کولکاتہ میں کسی کمپنی والے سے پہچان ہے۔اس نے نہال کو فون لگایا اور نہال کو اسے فیکس کرنے کو کہنے کے لئے کہا۔ملک سیٹھ کے بھیجے ہوئے فیکس کو کولکاتہ سے پلٹ کر آنا تھا۔

دو گھنٹے انتظار میں گزر گئے مگر کلکتہ سے فیکس نہیں آیا۔ملک سیٹھ نے نہال کو دوبارہ فون کیا۔نہال نے بتایا۔

''میں نے دو بار کمپنی والے کے موبائل پر فون کیا تھا۔کہا کہ بس ابھی فیکس کرنے جارہا ہوں۔میٹنگ میں ہوں۔یار! تھوڑا ٹائم لگے گا۔اور اس کے بعد وہ ناٹ رِیچیبل ہوگیا۔''

''یعنی بالکل غائب!''

''جی......چھوڑئے انکل، میں اپنے دوسرے پہچان والے سے بات کرتا ہوں۔'' ناامید ہوکر نہال نے کلکتہ کے اپنے ایک دوسرے کلائنٹ کو فون لگایا۔اور گھنٹے بھر کے اندر ملک کو اسکے علاقے کے ٹیلیفون بوتھ پر فیکس مل گیا۔

''فیکس کلیئر نہیں آیا ہے۔دوبارہ کرو۔'' فیکس صاف نہیں تھا، کافی دھندلا تھا۔انسپکٹر پاٹل اسے لینے کو تیار نہیں تھا۔ملک سیٹھ نے نہال سے اس کے اسی کلائنٹ کو کہلوایا کہ دوبارہ فیکس کرے۔لگ بھگ پونا گھنٹہ سیٹھ بوتھ پر کھڑے رہے۔تھک ہار کر انسپکٹر کی یاد آئی۔

ملک سیٹھ پولس سٹیشن پہنچتے ہی انسپکٹر پاٹل کے پیچھے لگ گیا اور بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

''انسپکٹر صاحب! ہمارے لئے تو مشکل ہے۔بس آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔''

''لاش کا عورت منگتا ہے نہیں تو اس کا فیکس......ایسا قانونی طریقہ ہے۔اور دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے۔''انسپکٹر نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''کیا صاب!''

''ایک عورت نے کیس کیا تھا۔اس کے آدمی کا باپ اس کے مرد کا باڈی لے کر گیا تھا اور جلا بھی دیا تھا۔''ساتھ بیٹھا انسپکٹر انگو لے ہنسا، بولا۔

''ہمارا اکھٹیا کھڑا کر دیا تھا یار، ساتی نے!''

''اس کا باپ بڈھا ہے۔''ملک نے رحیم کے کیس کو الگ بتلاتے ہوئے سمجھایا۔''وہ بنگالی میں بات کرتے ہیں۔اور کوئی دوسری بھاشا انہیں سمجھ میں نہیں آتی۔منڈل نے ڈکٹیٹ کروایا تھا، مگر لکھ کر فیکس نہیں کروا پار ہے ہیں۔صبح سے شام ہوگئی صاحب!''

''تو ہاتھ سے لکھ کر فیکس کرو، لاش کا عورت کو بولو، کہ وہاں سے اسی کو فیکس کریں۔ سمپل!''

''صاحب!!''

''اب فیکس کلئیر تو آنا منگتا ہے نا!''انسپکٹر پاٹل نے ان کی بات جیسے ان سُنی کی۔

''صاحب! کچھ کیجئے۔شام ہوگئی ہے، چھے بج رہا ہے۔''سیٹھ ایس ٹی ڈی بوتھ کے لئے جانے کے لئے مُڑنے لگے تھے۔

''آپ ذمہ داری لیتے ہیں کیا؟ انڈر ٹیکنگ دیتے ہیں کیا؟''

''نہیں انسپکٹر صاحب۔''ملک سیٹھ نے تھکن بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، کل اس کی عورت لفڑا کرے گی تو؟؟ اس کے بھائی سے لکھوالو نا!''

''نہیں چلے گا۔''

''ایسا فیکس منگواتے ہیں؟ یہ دیکھو یہ تمل ناڈو کا ہے۔ایفیڈیوٹ کرا کے پولس سٹیشن کا ٹھپا لگا کے فیکس کیا ہے......ایسا ہونا منگتا ہے۔''انسپکٹر پاٹل نے کسی اور کی عرضی نکال کر دکھائی۔''اور یہ تمہارا فیکس؟ نہ نیچے سٹیمپ، نہ کچھ! پولس سٹیشن نہیں تو کم سے کم گاؤں کے سرپنچ کا سکہ تو ہونا منگتا ہے نا کہ، عورت کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔فیکس میں کم سے کم پتہ، فون نمبر آنا منگتا ہے۔''

''صاحب چائے پانی......؟''

''ایسا نہیں بولنے کا رہتا ہے! یہ پولس چوکی ہے!''انسپکٹر چونکنے کی اداکاری کرنے لگا۔''ادھر

میں اس کو لالچ بولتا ہے! پولس کو رشوت دینے کا نئیں۔سیدھا اندر کر دے گا۔''پھر وہ ذرا سا ہنسا اور اس کی تو ند ہلی۔''ارے بھاؤ! تم کو کیا لگتا ہے ہم غریب لوگ کو ستانے کو یہ نیم بناتا ہے؟ یہ قانون ہے، قانون! اب فیکس تو کلئیر آنا منگتا ہے نا! تبھی تو باڈی دے سکے گا نا!''

''وہ ابھی ہو جائیگا۔بس دس منٹ دیجئے۔''ملک سیٹھ اُس کے بات سمجھنے کے اشارے سے خوش ہو کر بولا۔

''تو ایسا بولنے کا نا!''ملک سیٹھ کو لگا جیسے انسپکٹر نے بھی مطمئن ہو کر انھیں تسلی دی ہو۔ورنہ پھٹیچر سے دکھائی دینے والے منڈل بھائیوں سے اُسے بھلا کیا امید ہو سکتی تھی!

چوکی سے باہر آ کر ملک سیٹھ نے اپنے ہاتھ سے دوسری عرضی لکھی۔اس پر منڈل کا انگوٹھا لگایا اور کسی دوسرے ایس ٹی ڈی بوتھ سے اسے پولس سٹیشن کے پاس والے اُس بوتھ پر فیکس کرنے کے لئے کہا، جہاں وہ کھڑے تھے۔اب فیکس صاف آیا تھا۔

انسپکٹر پاٹل نے فیکس کے کاغذ کے بائیں کنارے سے ممبئی کا فون نمبر، جو مقامی پی سی او کا تھا، پھاڑ کر کاغذ کے اُس ٹکڑے کو اپنے ٹیبل کے نیچے رکھے کوڑے دان میں پھینک دیا۔اور کولکاتا کے دھندلے فیکس کے ساتھ اسے سٹیپلر سے جوڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

سائن اسپتال کے پچھلے حصّے میں مردہ خانہ تھا۔ملک سیٹھ منڈل کے ساتھ وہاں گئے۔ساری لاشیں ننگی پڑی ہوئی تھیں۔ایک پر ایک ڈالی ہوئی۔ناک پر رومال رکھے ہوئے ملک کو ابکائی آ گئی۔تمیں لاشوں میں سے رحیم کی لاش کی شناخت کر کے نکلے۔باہر ایک چھوٹے سے بچّے کی ڈیڑھ فٹ کی لاش ایمبولینس میں ڈال کر اس کے گھر لے جایا جا رہا تھا۔انکا دل اور بھی بھر آیا۔

''پی ایس آئی میں تیرا نام سمن لکھا ہے۔تو سلیمان ہوئے گا۔سمن کیسے ہو سکتا ہے؟ پولس سٹیشن جا کر اپنا نام ٹھیک کروا کر لا۔''مردہ گھر کے آفس کے کلرک نے اعتراض کیا۔

''ارے یہی تو ہے سمن منڈل۔''حوالدار وہاں آ پہنچا تھا۔

''یہ تو عورت کا نام ہے!''کلرک اَڑ گیا۔

''ہے تو کیا کرے گا؟ پاٹل صاب کا آرڈر ہے......باڈی اس کو دے دے۔''حوالدار نے دھمکانے والے لہجے میں اسے حکم دیا۔

رحیم سائن اسپتال میں علاج ہونے سے پہلے مر گیا تھا۔اسی لئے اس کا پوسٹ مارٹم ہوا۔اور اسے لئے ملک سیٹھ کو اس کی لاش حاصل کرنے میں پسینے چھوٹ گئے۔

''گاڑی بھیج دیجئے۔''لاش کے پیپر حاصل کر کے ملک سیٹھ نے انڈر ٹیکر مائکل پنٹو کو فون کیا۔

''کیا بزنس ہے نا لاش پیک کرنے کا!''سیٹھ کے بڑبڑانے پر منڈل نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔

''صاحب! ہم کو بھی پلین سے گاؤں بھیجو صاب!......نہیں تو ہمارے پہنچنے تک وہ لوگ بھائی کو دفنا دے گا۔''

''تو جا یار! ٹرین سے! اب تجھے بھیجنے پر ایک اور آٹھ ہزار ڈالنا پڑے گا......ایک تو دو ہزار روپے پاٹل کو بھی دینے پڑے ہیں۔''

''کیوں صاب؟''

''تب ہی تو باڈی ملی ہے......تم کیا سمجھے تھے!''

منڈل کی حیرت بھری آنکھوں کی جانب دیکھنے کی فرصت کسے تھی! سب کالی کانچ والی گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے، جو رحیم کی لاش کو اسپتال سے انڈر ٹیکر، پیکر کے یہاں لے جا رہی تھی۔

«•»

Flat No:301, 3rd Floor, Sadiqua Mnsion
Shastri Nagar
Above Axis Bank
Khapoli
Dist:Raigadh-410203,(Maharashtra)
9370821955

● ھما فلک

امپیریا کے مجسمے تلے

پرسکون ماحول میں وہ اپنے بستر کی پشت سے ٹیک لگائے گود میں کاغذوں کا پلندہ لئے بیٹھی تھی پہلے صفحے پر سب سے اوپر اس نے لکھا۔''محبت!''

اور اپنے مخصوص انداز میں قلم دانتوں میں دبا کر سوچنے لگی۔

مجھے محبت پر افسانہ لکھنا ہے !

کیا لکھوں؟

میں نے محبت دیکھی ہے؟

میں نے محبت نہیں دیکھی؟

دیکھی ہے تو اس پر لکھنا اتنا مشکل کیوں ہے؟

نہیں دیکھی تو کیسے کچھ لکھوں گی؟

محبت کیا ہے؟ جیسے سمندروں کی تہوں میں چھپے ہوئے خزانے! جن کی کھوج میں جانے کتنوں کے بیڑے ڈوب گئے۔اس کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے یقین و بے یقینی کے اس صحرا کی خاک میں کتنے مجنوں خاک ہوئے۔اور میں؟ مجھے محبت پر یقین تھا! مجھے محبت پر یقین ہے!

یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا۔

''محبت آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے کا نام ہے۔''

''اور اگر کوئی نابینا ہو تو؟''

''کیا کوئی نابینا محبت نہیں کر سکتا، اس کی محبت کس قسم کی ہوگی؟''

میں نے مذاق میں پوچھا تھا۔

''بالکل کر سکتا ہے وہ لمس سے، لہجے سے محبت کرے گا، محبت کو سُنے گا چھو کر محسوس کرے گا۔''

تم میری مذاق میں کہی ہوئی بات کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔اور میں سنجیدہ ہو جاتی۔

''محبت چھو لینے یا پا لینے کی چاہت کا نام نہیں یہ تو احساس ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، یہ خوشبو ہے جو رگ و پے میں اتر کر روح کو معطر کرتی ہے، یہ تو روشنی ہے جو کائنات کو منور کرتی ہے۔یہ ہر گلی میں بٹنے والی سوغات نہیں......اس کے لئے ہتھیلیاں بھی خاص ہوتی ہیں اور دینے والے ہاتھ بھی۔''

تم سنتے رہتے ،اگر میری کسی بات سے اختلاف بھی ہوتا اسے ہلکی سی مسکراہٹ سے ٹال دیتے۔

میں نے محبت دیکھی ہے!

جانے یہ کب اور کیسے ہوئی تھی؟ لیکن وہ پہلی نظر کی محبت نہ تھی۔

میں پہلی نظر کی محبت کی قائل نہیں، میرا ماننا تھا کہ یہ تو دھیمی دھیمی آنچ کی طرح خود بھی سلگتی ہے اور دوسرے کو بھی سلگاتی ہے۔ یہ کیا کہ دیکھا اور گرفتار ہو گئے؟ سطح آب سے کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ سمندر کے اندر اتنے طوفان چھپے ہیں؟ کسی انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا اس سے مل کر اسے جان کر ہی اندازہ ہوتا ہے پہلی نظر میں تو صرف چہرہ نظر آتا ہے اور چہرے سے محبت کرنے والے تو سطحی لوگ ہوتے ہیں۔

اس بات کو بہت سے برس بیت چکے ہیں۔ جب میں نے محبت کو پانے کے لئے ہی اسے کھویا تھا ،جانے کیوں اس وقت مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے تمہیں کھونے کے ساتھ ساتھ محبت پر اپنا یقین بھی کھو دیا ۔میں جہاں کہیں دو محبت کرنے والوں کو دیکھتی یہی سوچتی کہ ان میں سے کوئی ایک ،دوسرے کو بیچ راستے میں چھوڑ دے گا۔ یا یہ کہ اگر یہ دونوں مل بھی گئے تو کچھ عرصہ بعد ان کی محبت بیزار ہو کر ان کے درمیان سے نکل جائے گی اور یہ بے زاری ایک دوسرے کے لئے ان کے چہروں پر چھوڑ جائے گی۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا..... امپیریا کے مجسمے کے پاس جالیوں پر لگے ان تالوں کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔

''جانے ان میں سے کتنے چابی جھیل میں پھینک دینے کے بعد بھی اس بندھن میں بندھے رہے ہوں گے، تنوں کی محبت کو ان تالوں سے پہلے زنگ لگ گیا ہو گا؟''

کونسٹانس (Constance) میں جھیل بوڈن (Boden) کے کنارے امپیریا کے مجسمے تلے لگی جالیوں پر بے شمار تالے لگے ہوئے تھے..... ہر قسم کے چھوٹے بڑے تالے جن میں سے کچھ پر ان کے لگانے والوں کے نام کندہ تھے۔ دو چاہنے والے اس جگہ پر اپنی محبت کو تالا لگا کر، چابی جھیل میں پھینک دیتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ اب انہوں نے ایک دوسرے کو محبت کے بندھن میں باندھ لیا ہے اب چاہے ان تالوں کو زنگ کھا جائے مگر ان کی محبت کو زنگ نہیں لگے گا۔

اور میں؟..... محبت جسے میں نے دیکھا تھا، اس پر یقین بھی کیا تھا۔ جانتے ہو اس دن بہت عرصہ بعد..... اس مقام پر کھڑے ہو کر میں نے تمہیں سوچا اور یہ کہ..... کاش تم میرے ساتھ یہاں ہوتے تم سے کہتی آؤ امپیریا کے مجسمے کے ساتھ منسلک ان جالیوں پر ہم بھی اپنی محبت کے نام کا ایک تالا لگا کر چابی جھیل میں پھینک دیں..... مگر میں محبت کو باندھنے کی قائل کبھی نہیں رہی تھی اسی لئے تو..... ہاں اسی لئے اب وہاں کھڑی اپنے سوالوں کے جواب تلاش کر رہی تھی۔

وہاں سے کچھ قدم پر سوئیٹزرلینڈ کی سرحد تھی..... وہ ملک جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے..... میں نے دو سرحدوں کے درمیان کھڑے ہو کر ایک طویل سانس لی..... ایک ملک کی ہوا دوسرے ملک کے درختوں کے پتوں کو سہلا رہی تھی۔ ہوا، پھول، پرندے، فطرت کے سب نظارے سرحدوں سے بے نیاز محبت کی زبان بولتے، سمجھتے ہیں۔ مگر پھر..... ہمارے درمیان اتنی سرحدیں کیوں حائل ہیں؟

اس کا جواب بھی صرف میں ہی جانتی ہوں۔

اس نے ایک نظر اس صفحے پر ڈالی جہاں لکھا تھا۔

''محبت!''

وہ قلم ہاتھ میں تھامے بیٹھی تھی، اسے ہر حال میں آج یہ افسانہ مکمل کرنا تھا۔ قلم سے آڑھی ترچھی لکیریں کاغذ پر کھینچتے وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کیا میں نے اسے دیکھا ہے؟ محسوس کیا ہے؟

ہاں میں نے اسے دیکھا بھی!

محسوس بھی کیا!

پا بھی لیا!

اور کھو بھی دیا۔

وہ مجھ سے چھینی تو نہیں گئی تھی میں نے خود ہی.....!

***

میں اور وہ بہت خوش تھے۔ محبت تھی، جوانی، خوشی اور جوش تھا۔ اس سب سے بڑھ کر یہ اطمینان کہ کم از کم اس دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ ہم ملتے تھے ہر اس جگہ جہاں محبوب ملتے ہیں۔ جہاں فطرت کے نظارے دو محبت کرنے والوں کو ملتے ہوئے دیکھ کر جھوم جھوم جاتے ہیں۔ ہم ملتے تھے اس جگہ جہاں چاندنی پانی میں غسل کرنے آتی اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کی آغوش میں دیکھ کر بدلی کے پردے میں چھپ جاتی پھر چور نگاہوں سے ہمیں دیکھ کر مسکراتی اور اپنے چاند کی بانہوں میں سمٹ جاتی۔

محبت ہر چیز کو خوبصورت بنا دیتی ہے!

اتنا کہ وہ خزاں میں بھی بہار کے رنگ دیکھنے لگتا ہے۔

ہم ملتے تھے، ہر اس موسم میں جب خزاں ہمیں بہاروں کی آمد کی نوید دیتے ہوئے خوشی سے معمور کر جاتی۔ جہاں بہاریں پر مسرت اداسی کا احساس دے جاتیں کہ یہ زندگی اتنی مختصر کیوں ہے؟ یہ اتنی

ہی اور ہوتی ہم اسے بھی محبت میں گزار دیتے۔

ہم ملتے تھے محبت کو کوئی نام دیئے بغیر رشتوں کے ہر بندھن سے آزاد ہو کر!

میں محبت میں رشتوں کی پاکی ناپاکی پر یقین نہیں رکھتی۔ محبت پاک ہوتی ہے اور جو پاک نہ ہو وہ محبت نہیں ہوتی۔ جب ہم ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں اور اس بات کا اقرار کر چکے ہیں، ایک دوسرے پر یقین رکھتے ہیں تو دنیا اس رشتے کو جو بھی نام دے پرواہ نہیں۔ ہماری محبت کاغذ کے ایک پرزے کی محتاج نہیں۔

ہم ملتے تھے اور ملتے رہے تب تک جب تک ..... میں نے جدائی کا فیصلہ صادر نہ کر دیا۔

اس رات کھلی ہوئی چاندنی میں تم نے میری ہتھیلی کے ساتھ اپنی ہتھیلی ملا کر کہا تھا۔

''دیکھو! ہمارے ملنے کی لکیریں..... کتنی واضح کتنی روشن ہیں۔''

''ہاں..... مگر مجھے جدائی سے نہیں محبت کے کھو جانے سے خوف آتا ہے۔''

''ہماری محبت کیسے کھو سکتی ہے؟ جدائی مقدر نہیں، ہماری راہیں جدا نہیں۔ ہم ایک قدم کی دوری پر کھڑے ہیں، پھر وصل کے لمحات ہماری خوشیوں کے ضامن ہوں گے۔''

''لیکن اس ملن کے بعد محبت کہیں کھو جائے گی، اس لئے میں اس ملن کو ادھورا چھوڑ کر اسے پورا کرنا چاہتی ہوں۔''

تم اس وقت کتنا حیران ہوئے تھے۔

''جب جدائی مقدر نہیں تو اب یہ ایک نیا فیصلہ کیسا؟ ہمارے ہاتھوں کی لکیروں پر لکھے ہوئے نام بہت روشن نظر آ رہے ہیں تو جدائی کی ایک نئی لکیر کیوں کھینچ رہی ہو؟ ایک راستہ ہے جو سیدھا منزل کی طرف جا رہا ہے تو اسے دو راہے میں کیوں تقسیم کر رہی ہو؟''

''دنیا میں جتنی بھی محبت کی داستانیں امر ہوئی ہیں ان سب میں چاہنے والوں کا مقدر جدائی ٹھہرا تھا۔''

''تم بے وفائی پر آمادہ ہو؟''

''نہیں میری وفا کا تقاضا ہے ہم جدا ہو کر اپنی محبت کو امر کر دیں گے۔ یہ جدائی ہماری محبت کی تکمیل کر دے گی۔''

''جدائی محبت کی تکمیل کیسے؟''

''ہاں جدائی محبت کی تکمیل ہے۔''

مل جائیں گے تو شاید محبت رہے، شاید مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ جائے لیکن نہ ملے تو یہ درد کی صورت سینے میں پلتی رہے گی، ایک کسک ہر پل مجھے تمہاری اور تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔ ہماری محبت کبھی ہمیں ایک دوسرے کو بھولنے نہیں دے گی۔ جو سرشاری جدائی میں ہے وہ وصل میں نہیں۔''

''کیا تم اپنے اس فیصلے پر قائم رہو گی؟''

تمہارے لہجے میں حسرت تھی اور ایک آس بھی کہ شاید یہ سب میں یونہی کہہ رہی ہوں۔ لیکن اس رات تمہاری ہر دلیل رائیگاں رہی، ہر بات کے جواب میں میں نے یہی کہا تھا کہ محبت کو امر کرنا ہے تو ہمیں جدائی کا زہر پینا ہوگا۔''

''آؤ یہ زہر پی لیں اور اپنی محبت کو امر کر دیں۔''

وہ آخری ملاقات بہت خوبصورت بھی تھی اور بہت غمزدہ کرنے والی بھی!

اس رات یوں لگتا تھا کہ چاند ستارے ہماری محبت کی ڈولی سجانے آئے تھے، مگر میں نے اسے میت میں بدل دیا۔ خوشیوں کی شہنائی دکھ کے راگ سنانے لگی، ہنستے کھیلتے ناچتے ہوئے نظارے جدائی کا ماتم کرنے لگے۔ اس رات میں نے محبت کو تڑپ تڑپ کر روتے دیکھا۔ ضبط سے تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، تم اپنے آنسو مجھ سے چھپانا چاہ رہے تھے۔ تم اپنی محبت کی توہین نہیں چاہتے تھے، تم یہ بھی جانتے تھے کہ اب میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گی۔ ایسے میں تمہاری محبت کا تقاضا یہی تھا کہ تم مجھے کوئی احساس گناہ نہ دو۔ میں جانتی تھی اس وقت تم رو رہے تھے کائنات کا ذرہ ذرہ رو رہا تھا۔ جب ہم جدا ہو رہے تھے، تم نے کتنی دیر میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور میری آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ جیسے کچھ تلاش کر رہے ہو، شاید اپنی ہی امید کی کھوئی ہوئی کوئی کرن میری آنکھوں میں ڈھونڈ رہے تھے۔ شاید شرمساری کی کوئی رمق یا پچھتاوے کی کوئی جھلک؟ مگر میں نے دل کے دروازے بند کر کے پلکوں کی جھالریں گرا دیں اور تمہارے لئے آس، امید اور روشنی کا ہر راستہ بند کر کے تمہیں مایوسیوں کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ ہاتھ چھڑاتے ہوئے جب انگلیوں کا آخری سرا ملا ہوا رہ گیا تو تم نے دوبارہ میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھ سے کہا تھا۔

''رکو!''

میں رک گئی مگر پلٹ کر تمہیں دیکھا تک نہیں کہ کہیں اپنے فیصلے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ تم نے کہا۔

''تم نے جدائی کا فیصلہ کیا ہے، کیونکہ تمہیں خوف ہے کہ زندگی کے مسائل میں ہماری محبت الجھ کر کہیں کھو جائے گی، مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوگا اور تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ تو چلو آج ایک وعدہ کرتے ہیں زندگی کے اس پڑاؤ پر جہاں شام ڈیرے ڈالتی ہے، جہاں پچھتاوے واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں،

تم اور میں بھی مل جائیں گے۔ ہم آغاز سفر ساتھ نہ کریں، واپسی کے سفر میں ساتھ ضرور ہو لیں گے، اگر تم نے اس سفر کے لئے کسی ہم سفر کا انتخاب کر لیا، اپنے سفر سے مطمئن ہوئی اور محبت باقی نہ رہی تو اس وعدے سے آزاد ہو گی۔''

تب میں نے مڑ کر تمہیں دیکھا تھا اور کہا تھا۔

''ہاں شاید اس وقت ہم ملیں، شاید نہ مل سکیں، لیکن..... مجھے اتنا یقین ہے کہ محبت باقی رہے گی۔''

تب تمہاری آنکھوں میں میرے وعدے سے ایک چمک تو اتری تھی لیکن تم مجھے یوں تک رہے تھے جیسے میں بہت سنگدل ہوں۔

مگر ..... میں ..... صرف میں ہی جانتی تھی کہ یہ ہماری محبت کی بقاء کے لئے کتنا ضروری ہے۔

ہم مل جاتے اور چند دن گزر جانے کے بعد غم روزگار اور دیگر مسائل ہماری محبت کو نگل جاتے۔ جانتے ہو اس رات میں نے جدائی کا فیصلہ کر کے محبت کا یقین پا لیا تھا مگر شاید تمہارا یقین کھو دیا تھا۔ تمہاری آنکھوں کی بے یقینی جیسے مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''محبت ہوتی تو میں کبھی یہ فیصلہ نہ کرتی۔''

اور پھر ہم جدا ہو گئے!

***

سسی پنوں، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال کی طرح تمہارا میرا نام تاریخ کے صفحات پر رقمہ بھی ہو میرے دل پر آج بھی تمہارا نام لکھا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں، تمہیں سرحدوں نے نہیں ہمارے اس وعدے نے باندھ رکھا ہے کہ ہم عمر کے آخری پڑاؤ پر ملیں گے۔

ہونٹوں کا وہ آخری لمس جو تم نے میری پلکوں سے آنسو چنتے ہوئے میری آنکھوں پر ثبت کیا تھا اس کی نرمی آج بھی وہیں ٹھہری ہوئی ہے۔

میں بھی یہی سوچنے لگی تھی کہ محبت ہوتی تو میں کبھی یہ فیصلہ نہ کرتی۔ لیکن اگر محبت نہ ہوتی تو آج بوڈن جھیل کے کنارے ان جالیوں پر اپنے اور تمہارے نام کا ایک تالا نہ لگاتی۔

سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر بنے اس ہٹ کے لکڑی کے گول ستون پر تمہارا نام لکھ کر یہ خواہش تحریر نہ کرتی کہ ایک دن تم اور میں ایک ساتھ اس جھیل کے خوبصورت نظاروں میں کھو جائیں گے۔

ہاں میں جو محبت کو کسی بندھن میں باندھنے کی قائل نہ تھی اب اپنی محبت کو اس تالے سے باندھ چکی تھی۔ وہیں جھیل کے نظارے کے لئے بنے ہوئے ہٹ کے لکڑی کے گول ستون پر میں نے تمہارا اور اپنا

نام لکھا، اور ساتھ ایک وعدہ بھی لکھ دیا۔

''کبھی نہ کبھی تم اور میں یہاں ہوں گے، مل کر ایک سرحد پار کر کے دوسری سرحد پر قدم رکھیں گے اور اس بات کا اقرار کریں گے کہ محبت سرحدوں کی محتاج نہیں ہوتی۔''

ایک دن بوڈن جھیل کے کنارے تم اس چابی کو ڈھونڈھ لاؤ گے اور اس تالے کو کھول دو گے ..... جانے کیوں؟ اور وہ تحریر جو میں نے سرحد پار اس لکڑی کے ستون پر لکھی ہے اسے پڑھو گے اس تحریر پر اپنی انگلیاں پھیر کر اسے محسوس کرو گے۔ اور میری آنکھوں میں جھانک کر کہو گے۔

''ہماری محبت امر ہو گئی، وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد تھی، سرحدیں اسے ختم نہیں کر سکیں!''

مجھے یقین ہے تمہیں بھی اس وقت کا انتظار ہے۔

****

اس نے افسانہ مکمل کیا۔ اس پر ایک نظر ڈالی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر لفظ ''محبت'' کو بھگو رہے تھے۔ باقی سارا صفحہ خالی تھا۔

Oswald-Hesse Str,53
70469
Stuttgart
Germany

● محمد جمیل اختر

بوڑھے آدمی کا خواب

بوڑھے صادق حسین کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آگئی تھی، اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس تبدیلی کے بارے کچھ بتاؤں مجھے آپ کو اس تبدیلی سے پہلے کی زندگی کے بارے بتانا ہوگا ورنہ یہ افسانہ جھول کا شکار ہو جائے گا اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔۔۔

تو میں آپ کو بتاتا چلوں کہ صادق حسین کو ریٹائرڈ ہوئے دو سال ہو گئے ہیں، بیوی پانچ سال پہلے فوت ہوگئی تھی اور دونوں بچے اپنی گوری بیویوں کے ساتھ کینیڈا ہوتے ہیں اور آخری بار پانچ سال پہلے آئے تھے اب کبھی کبھار اُن کا فون آجاتا ہے، صادق حسین کی زندگی دو ٹیلی فونوں کے درمیانی وقفے میں معلق رہتی ہے۔

پہلے پہل صادق حسین ریٹائر ہوئے تو پھر بھی ایک آدھ دن چھوڑ کر دفتر چلے جاتے، پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی اور ان کا دل بہل جاتا، پھر رفتہ رفتہ انہیں محسوس ہوا کہ دفتر کے لوگ اب تنگ آتے جا رہے ہیں جیسے وہ دفتر جا کر اُن کے کام میں مخل ہوتے ہیں سو انہوں نے دفتر جانا چھوڑ دیا، گھر کا زیادہ تر کام گھر کی پرانی ملازمہ نسرین کر دیتی تھی، صادق صاحب صبح اُٹھتے، ناشتہ کرتے، اخبار پڑھتے یونہی ٹی وی پر چینل بدلتے رہتے ایک آدھ چکر باہر گلی کا لگا کر آجاتے اور پھر سہ پہر تک بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے۔ سہ پہر کو وہ گھر سے تھوڑی دور بنے پارک میں جاتے واک وہ بہت کم کرتے تھے بس ایک بنچ پر بیٹھ کر بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتے رہتے یا پھر باغ میں اُڑتے پرندوں کو دیکھتے۔

وہ سوچتے کہ کاش وہ بچہ ہوتے اور بچوں کیساتھ کھیلتے یا پھر پرندہ ہوتے اور ایک قطار میں اُڑا کرتے لیکن وہ تو ایک تنہا اُداس بوڑھے تھے کہ جس سے سارا دن کوئی بات نہیں کرتا تھا سو انہوں نے اس کا حل نکالا اور وہ ہر شے سے باتیں کرنے لگے مثلاً گھر کی دیواروں، برتنوں، کتابوں، ٹی وی، غرض گھر کی ہر چیز سے وہ باتیں کرتے تھے۔

اُن کے ڈرائینگ روم کی دیوار میں دراڑ پڑتی جا رہی ہے سو وہ روز کئی منٹ تک اُس دیوار سے باتیں کر کے اُسے حوصلہ دیتے ہیں

''پریشان نہیں ہونا، ٹوٹنا ہرگز نہیں، میں اِس دفعہ پنشن ملتے ہی مستری بلالاؤں گا تم بس خود کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔'' اگر کبھی چائے کا کپ گندہ ہی پڑا رہ جاتا تو وہ کہتے ''اوہ ہو! آج نسرین نے

تمہیں دھویا نہیں؟ آہ کتنے میلے ہو گئے ہو آؤ میں تمہیں کچن میں چھوڑ آؤں، کل نسرین کو آتے ساتھ ہی میں کہوں گا کہ سب سے پہلے وہ تمہیں دھوئے''

پھر ایک دن بوڑھے صادق حسین کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آگئی۔

وہ ایک ایسی ہی اداس شام کو اُسی پرانے بنچ پر بیٹھے تھے جب ان کے ساتھ والے بنچ پر ایک تیس پینتس سال کی ایک اداس سی خاتون آکر بیٹھ گئیں صادق حسین کو اُن آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے وہ اُداس آنکھیں اِن کی اپنی آنکھیں ہیں اور وہ خود کو دیکھ رہے ہیں کہ روز انہیں ایسی آنکھیں شیشے میں دکھائی دیتی تھیں۔

انہوں نے سوچا معلوم نہیں یہ خاتون کون ہیں، میں تو بالکل اکیلا ہوں سو اداس ہوں اِس خاتون کو بھری جوانی میں کیا ہو گیا یہ کیوں اتنی اداس ہے۔۔۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں پوچھا، ساری رات خواب میں وہ آنکھیں اُن کے سامنے آنسو بہاتی رہیں، وہ بار بار پریشان ہو کر جاگ جاتے آخر یہ خواب کیا ہے اور وہ خاتون کون ہے۔۔ وہ بھلا کیسے جان سکتے تھے کہ وہ کون ہے کل سے پہلے تو انہوں نے اُسے کبھی پارک میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ اگلے دن وہ سہ پہر سے بھی پہلے پارک پہنچ گئے اور بے چینی سے انتظار کرنے لگے وہ خاتون شام سے ذرا پہلے آئیں اور آکر ساتھ کے بنچ پر بیٹھ گئیں صادق صاحب آج بھی یہ سوچتے رہے کہ آخر وہ کس طرح ان سے پوچھیں کہ وہ اتنی اداس کیوں کر ہے آخر وہ ان کی کون ہے، کچھ بھی تو نہیں۔

ایک ہفتہ یونہی گزر گیا اس ہفتے کے دوران صادق صاحب نے در و دیوار سے کوئی بات نہ کی اور دیوار و در انہیں حیرت سے تکتے تھے کہ بوڑھے کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کئی دنوں بعد انہوں نے تازہ شیو بنایا تھا لیکن وہ اس سارے ہفتے اُس خاتون سے کچھ بھی نہ پوچھ سکے ہاں لیکن ہر رات خواب میں وہ اُسے دیکھتے اُسے حوصلہ دیتے اور وہ خاتون صادق صاحب کو حوصلہ دیتیں۔

صادق صاحب عُمر کے اُس حصے میں تھے جب زندگی انسان سے سب کچھ لے جاتی ہے اور انسان کے حصے میں سوائے تجربے کے کچھ نہیں آتا سو اُن کے پاس تجربہ تھا، شعور تھا وہ جب اپنے اندر اِس تبدیلی کو دیکھتے تو اِس نتیجے پر پہنچتے کہ اُن کی اُس خاتون کے لیے انسیت ایسی ہے جیسی وہ بچپن میں گاؤں سے باہر ہائی سکول جایا کرتے تو مئی جون کی تپتی دوپہر میں جب وہ چھٹی کر کے لوٹ رہے ہوتے تو سکول اور گاؤں کے درمیان راستے میں ایک بہت بڑا شیشم کا درخت آتا کہ جس سے پہلے اور بعد میں سارے راستے پر دھوپ ہی دھوپ ہوتی تھی۔ تو جب وہ اُس گھنے پیڑ کی نیچے پہنچتے، سب بچے اپنے پسینے خشک کرتے

پھر دور گاؤں کی جانب دیکھتے، سب نے گھر جانا ہوتا تھا لیکن انہیں اس تھوڑی دیر کے سائے سے عجیب سی اُنسیت ہو جاتی تھی وہ اُس پیڑ کو گاؤں تک ساتھ تو نہیں لے جا سکتے تھے لیکن اُس تپتی دوپہر میں آدھے راستے میں جو سایہ اُس پیڑ سے ملتا تھا وہ اِن کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا تھا۔

ایسے ہی صادق حسین صاحب بھی اُس اداس آنکھوں والی خاتون کو گھر لے کر نہیں جانا چاہتے تھے وہ اُسے حاصل تو نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ تو صرف اُس کی اداسی، اُس کا دکھ اور اپنی تنہائی اور اداسی اس سے کہنا سننا چاہتے تھے لیکن پھر ایک ہفتے بعد اُس خاتون نے پارک میں آنا چھوڑ دیا، اِدھر صادق حاحب کا یہ حال کہ بیچارے دوپہر کو ہی بنچ پر آ کر بیٹھ جاتے کہ آج تو ضرور بات کروں گا لیکن جس روز خاتون پارک میں نہ آئیں تو صادق صاحب بے حد پریشان ہوئے شام کو دکھی دل کے ساتھ لوٹے، اگلے روز وہ پھر نہ آئیں اور ایسے ہی ایک ہفتہ گزر گیا، صادق صاحب کی یہ حالت کہ خود کو دن رات کوستے رہتے کہ آخر انہوں نے ان خاتون سے پریشانی کی وجہ کیونکر نہ پوچھی شاید وہ ان کے کچھ کام آسکتے وہ اپنی اِس بزدلی پر خود کو بہت برا بھلا کہتے، ایک ہفتے میں شیو بڑھ گیا تھا دیوار و در سے باتیں پھر معمول پر آنے لگی تھیں سوائے رات کے خوابوں کے کہ جس میں اب بھی وہ خاتون آتیں اور رو کر کہتیں ''صادق صاحب پلیز مجھے بچایئے، پلیز میری مدد کیجیے'' اور صادق صاحب ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتے اور سوچتے کاش کہ وہ اُس خاتون سے اُس کے بارے پوچھ لیتے یا اب بھی وہ کہیں انہیں مل جائے تو وہ ضرور اُس کی مدد کریں۔

یہ خاتون کو غائب ہونے کے دس دن بعد کا واقعہ ہے کہ ایک شام صادق صاحب پارک میں بنچ پر بیٹھے تھے کہ انہیں دور سے وہی خاتون آتی دکھائی دیں، صادق صاحب کو پہلے پہل لگا کہ شاید اب وہ دن میں بھی خواب دیکھنے لگے ہیں لیکن وہ خاتون برابر چلتی آ رہی تھیں صادق صاحب نے چشمہ اتارا، صاف کیا پھر لگایا، وہ اٹھے اور تقریباً دوڑتے ہوئے اُس تک پہنچے لیکن قریب جا کر اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ کوئی اور خاتون ہیں اُس موقع پر انہیں اور تو کوئی بات نہ سوجھی کہا

''میں معذرت چاہتا ہوں میری ایک عزیزہ گم ہو گئیں ہیں کیا آپ نے انہیں دیکھا، یہی کوئی پینتیس سال عمر ہوگی سیاہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا رنگ گندمی اور آنکھیں بالکل میری آنکھوں جیسی تھیں'' یہ کہہ کر صادق صاحب نے چشمہ اتارا اور دو انگلیوں کی مدد سے آنکھوں کو پھیلا کر دکھایا۔ ''بالکل ایسی آنکھیں تھیں،

آپ نے کبھی انہیں دیکھا، اِس پارک میں وہ روز آتی تھیں۔''

خاتون قدرے گھبرائے لہجے میں بولیں۔

''نہیں انکل میں نے نہیں دیکھا۔''

''اوہ اچھا شکریہ، میں تلاش کرتا ہوں یہیں کہیں ہونگی۔''

یہ پہلی بار تھا کہ انہوں نے اُس اداس آنکھوں والی خاتون کے بارے کسی سے پوچھا تھا پھر اُس کے بعد یہ اُن کا معمول بن گیا وہ روز پارک میں گیٹ نمبر ۲ سے داخل ہوتے لوگوں کو یہی نشانیاں بتاتے اور پوچھتے کہ شاید انہوں نے کہیں دیکھا ہو، آہستہ آہستہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ بوڑھا اُن سے کیا سوال کرے گا سو وہ نظریں چرا کر تیزی سے گزر جاتے، کئی لوگ بوڑھے صادق حسین کی آواز سنی ان سنی کر دیتے۔ پارک میں آنے والے کچھ نوجوانوں کے ہاتھ یہ شغل لگا کہ وہ صادق حسین صاحب کے پاس آتے اور کہتے

''انکل کیا آپ اُس خاتون کو ڈھونڈھ رہے ہیں جنہوں نے سیاہ دوپٹا اوڑھ رکھا ہے عمر پینتیس سال ہے اور اُن کی آنکھیں بالکل آپ کے جیسی ہیں۔''

''ہاں ہاں بالکل وہ میری عزیزہ ہیں، کیا تم نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟'' صادق صاحب بے چینی سے پوچھتے۔

''جی بالکل وہ گیٹ نمبر ایک پر آپ ہی کے بارے پوچھ رہی تھی''

اور صادق حسین صاحب تیزی سے گیٹ نمبر ایک کی طرف جاتے، پیچھے لڑکے تالیاں بجاتے، خوش ہوتے۔

اگلے دن کوئی اور لڑکا یہی بات دہراتا ہے، صادق حسین صاحب ہر بار یقین کر لیتے ہیں۔

اُن کا شیو بھی ڈرائینگ روم کی دیوار کی طرح بڑھ چکا ہے، گھر کی ہر دیوار حیرت سے بوڑھے کو دیکھتی ہے جواب اُس سے اب بات نہیں کرتا اور ایک ایسی خاتون کو ڈھونڈتا ہے جو کبھی تھی ہی نہیں۔

◄◄ ● ►►

House No: DPN
123/B,Street No:4
Dhok Ponu
Rawalpindi(Pakstan)
03458501168

● ڈاکٹر شکیل احمد خاں

تازہ جھونکا

دن کے تیسرے پہر میکے پہنچ کر موہنی اپنی ماں سے لپٹ کر خوب روئی۔ جب زور کچھ تھما تو اس نے آنسوؤں سے تر اپنے بھیگے چہرے کو چادر کے پلو سے صاف کیا، پھر چادر اتار کر پلنگ پر رکھی اور ماں سے کچھ کہے سنے بغیر زینے کی طرف چل دی۔ ماں نے اسے پیچھے سے آواز بھی لگائی مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے اوپر چڑھتی رہی۔ چھت کی کھلی فضا میں پہنچ کر وہ پھول کی طرح کھل اٹھی، اس کا روم روم خوشی سے جاگنے لگا، اس نے منہ کھول کر ایک گہرا سانس لیا پھر آنکھیں بند کر کے اور دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا کر گول گول گھومنے لگی تین چار چکر کھانے کے بعد اس نے پھر ایک گہرا سانس لیا۔ تازہ ہوا نے اس کے پھیپھڑے جو دوران عدت گھٹے ماحول سے آلودہ ہو گئے تھے، صاف کر دیے اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ پھر وہ مشرق میں بنی منڈیر کی جانب چل دی اور اس کے موکھے میں سے اپنی نظریں باہر کے نظارے پر مرکوز کر دیں۔ یہاں سے کھیت کھلیان صاف نظر آتے تھے۔ گندم کٹ چکی تھی اور کھیتوں میں جگہ جگہ اس کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان چند لڑکے منہ اوپر کیے ایک کٹ کر آنے والی بڑی سی پتنگ لوٹنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ یہ منظر دل چسپی سے دیکھنے لگی۔ پتنگ لہراتے ہوئے اس کے سامنے کھیت میں آ گری۔ ابھی لڑکے اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھے کہ پیچھے سے آئی ایک تیز آواز نے "یہ وڈے سائیں کی پتنگ ہے" سب کے قدم روک دیے اور ان میں سے کسی کو بھی آگے بڑھ کر پتنگ اُٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک لڑکا جو ان لڑکوں سے قد اور عمر میں نسبتاً بڑا تھا پیچھے سے آیا اور پتنگ لے کر چلتا بنا۔ سب لڑکے حسرت کی تصویر بنے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ یہ دیکھ کر موہنی کا دل خراب ہو گیا" کٹنے کے بعد بھی اس پتنگ پر وڈے سائیں کا قبضہ برقرار ہے؟" وہ اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے منڈیر سے ہٹ گئی۔ اس کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ پھر اس کا دل وہاں نہیں لگا اور وہ نیچے اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج موہنی اپنی عدت کا ایک سو تیسواں دن مکمل کر کے اپنے بھائی بھابی کے ساتھ سسرال سے میکے پہنچی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی صرف پانچ سال کا عرصہ گزرا تھا اور وہ خود بھی صرف بیس سال کی تھی کہ ان تکلیف دہ حالات سے دوچار ہو گئی۔ اس کا شوہر جمال شاہ جو اس کا پھوپھی زاد بھی تھا، کار کے ایک حادثے میں موت کا شکار ہو گیا تھا اور جیسا کہ ہمارے معاشرے کا دستور ہے شوہر کے مرنے پر سب سے پہلے اس کی بیوی کو چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھی بیوہ بنانے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور اس کے لیے زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی فرسودہ روایت پر ایسے عمل کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مذہبی فریضہ ہو۔ ایسا ہی کچھ موہنی کے ساتھ ہوا۔ اس کے ہاتھوں کی نازک کلائیوں میں پڑی چوڑیوں

کو، جلد میں کانچ کی چبھن اور پڑنے والی خراشوں کی پروا کیے بغیر بے دردی سے چور چور کر دیا گیا۔ اس کی پازیب اور ناک کی لونگ، جو اسے بے حد عزیز تھیں، اُتروالی گئیں پھر اسے سفید اور سادہ لباس پہنا کر گھر کی عورتوں کے ساتھ پُرسا لینے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ سویم کے بعد وہ ساس کی ہدایت کے مطابق اپنے کمرے میں منتقل ہو گئی۔ کمرے سے ٹی وی، آڈیو ویڈیو پلیئر، آئینہ اور زیبائش کی چیزیں ہٹا کر ان کی جگہ اگربتی کے پیکٹس، مصلہ، قرآن شریف اور مختلف وظائف کی کتابیں رکھ دی گئیں، موہنی کو عدت کی تکمیل تک اب اسی کمرے کی چہار دیواری میں محدود رہنا تھا اسی لیے ایک ملازمہ اس کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی اور ضرورت کی ہر چیز وہیں فراہم کرنا اس کا کام تھا۔ اب موہنی کا صبح فجر سے اُٹھ کر رات سونے تک بس ایک ہی کام تھا، نمازیں، قرآن، تسبیحات اور وظائف پڑھنا اور اپنے شوہر کو بخشنا۔ ویسے تو اس کی ساس اور چھوٹی نند اس کا خیال رکھتی تھیں اور روز اس کے کمرے میں آ کر ان پڑھائیوں میں اس کے ساتھ شریک رہتی تھیں لیکن معمولات کی یکسانیت نے عدت کے آخری دنوں میں اس کے اندر گھبراہٹ پیدا کر دی تھی اور اس کے لیے ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ عدت کے آخری دن جب وہ نہا دھو کر اور میکے کا لایا ہوا نیا جوڑا پہن کر کمرے سے باہر نکلی تو اس کے چہرے پر آئی خوشی دیدنی تھی۔ وہ خود کو اس آزاد پرندے کی طرح محسوس کر رہی تھی جسے اس کی مرضی کے خلاف قید کر دیا گیا تھا۔

موہنی نے ایک نظر اپنے بچپن کے کمرے پر ڈالی۔ وہاں کی ایک ایک چیز صاف ستھری اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی، "یہ کام یقیناً اماں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا ہوگا۔" وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی الماری کی طرف بڑھی اور اس میں سے وہ گڑیا گڈے جو اس نے بچپن میں اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے نکال کر بیڈ پر رکھ لیے اور ایک ایک کو الٹ پلٹ کر کے بڑی دل چسپی سے دیکھنے لگی۔ بچپن کی یادوں نے دل کے تاروں کو ابھی چھیڑا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور سامنے کا منظر دھندلا گیا۔

"موہنی ...... اری او موہنی ......" ماں آواز لگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی "ادی تو یہاں چھپی بیٹھی ہے، میں تجھے سارے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں ...... جواب تو دیا کر ...... اور یہ کیا ...... تو پھر نئی گڑیا سی رہی ہے؟" اس نے موہنی کے ہاتھ سے اَدھ سلی گڑیا لے لی اور اس کے برابر میں بیٹھ کر گڑیا دیکھنے لگی

"اماں نہ کر۔۔۔ تیرے گندے ہاتھوں سے گڑیا میلی ہو جائے گی" اس نے ماں کے ہاتھ سے گڑیا چھین لی۔

"اب تو بڑی ہو گئی ہے، گڑیوں سے کھیلنا چھوڑ دے۔" ماں نے اسے اپنے قریب کھینچ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے گھنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

"میں کہاں سے بڑی ہو گئی؟ ابھی دو مہینے پہلے تو تو نے میری پندرھویں سال گرہ منائی تھی۔" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"ہمارے یہاں بارہ تیرہ یا زیادہ سے زیادہ پندرہ ...... یہی عمریں ہوتی ہیں لڑکیوں کے بڑے ہونے کی۔ انہی میں ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ شام کو تیری پھوپھی بھی اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ تجھ سے کرنے کے لیے آ رہی ہیں۔"

"کیا ......؟" وہ چونک کر اپنی ماں کی گود سے اٹھ بیٹھی۔ "اس بوڑھے سے! وہ تو میرے چاچو کی عمر کا ہے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں ادی ...... وہ تجھ سے اٹھارہ اُنیس سال ہی بڑا ہوگا، داڑھی کی وجہ سے اس کی عمر زیادہ لگتی ہے اور پھر سیانے کہتے ہیں، شادی کے لیے مرد عورت کی عمروں میں جتنا زیادہ فرق ہو، اتنا اچھا ہے۔ عورت جلدی بوڑھی ہو جاتی ہے جب کہ مرد سدا بہار رہتا ہے۔" ماں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"کیا یہ ضروری ہے میری شادی اسی سے ہو، کم عمر والا کوئی اور رشتہ نہیں ہے؟ میری سہیلیاں میرا مذاق اڑائیں گی۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"رشتے تو ہیں لیکن وہ غیر برادری کے ہیں اور ہم برادری سے باہر شادی نہیں کرتے، پھر تیرا بھائی تیری پھوپھی زاد بہن کو پسند کر بیٹھا ہے، بدلے میں بیاہ کر تو وہاں جائے گی۔"

"واہ واہ ...... پسند بھائی کی اور بدلے میں مجھے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے، کیا مجھے پسند کی شادی کا حق نہیں؟" اس نے چمک کر سوال کیا۔

ماں نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔ "نہیں ادی ...... ہم عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ "پسند اور ناپسند کا لفظ ہمارے لیے نہیں بنا، ہمیں تو صدیوں سے پالتو جانوروں کی طرح ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے، بغیر رضا مندی کے باندھا جا رہا ہے۔ ہماری خاندانی روایات بہت طاقتور ہیں بیٹا! مذہب بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ انہی روایات کے تحت آج بھی عورتوں کے فیصلے کا اختیار مردوں کے پاس ہے، وہی ہماری تقدیروں کے مالک ہیں۔"

"ہم عورتیں بھی کتنی مظلوم اور مجبور ہوتی ہیں نا اماں!" یہ کہ کر موہنی نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنا منہ اس کی چھاتیوں میں چھپا لیا۔

"ہاں! ہوتی تو ہیں ...... مگر ظلم کرنے میں یہ بھی مردوں سے کم نہیں ہوتیں، ہم عورتوں کو جیسے ہی بڑھاپا آ لیتا ہے، خاندانی روایات کی پاسداری میں ہم مردوں سے زیادہ مردانگی دکھانے لگتی ہیں۔"

"موہنی ...... ارے او موہنی!"

ماں کی آواز سن کر وہ چونکی اور اپنی آنکھیں ملنے لگی، پچھلا منظر صاف ہو گیا۔

"تو یہاں بیٹھی ہے۔ میں تو تجھے چھت تک دیکھ آئی ...... اور یہ کیا؟" ماں نے بیڈ پر رکھی گڑیوں اور گڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اب تو چھوڑ دے ان کا پیچھا ادی ...... اب تو، تو شادی ......" اچانک اسے کچھ یاد آ گیا اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جملہ کیوں کھا گئی اماں؟ مجھے پتا ہے اب میں کیا ہو گئی ہوں۔"

ماں نے اسے اپنی چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔ "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بیٹا! تجھے یاد ہے جب تو دس سال کی تھی میرے سر کا سائیں بھی مجھے تنہا چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا تھا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، میں اس بیوگی کو بڑی ہمت اور صبر و قناعت سے نبھا رہی ہوں۔ تو بھی حوصلے سے کام لے۔" اس نے موہنی کے ماتھے کا بوسہ لیا اور اس کی بھیگی آنکھوں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے خشک کرنے لگی۔ "اچھا اب اُٹھ، کچھ کھا لے، بہت کم زور ہو گئی ہے میری بچی!" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں نے تیری پسند کے کٹے ہوئے آلو تلے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی موہنی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"اماں انہیں تلے ہوئے آلو نہیں، چپس کہتے ہیں ...... چپس۔" پھر وہ وہاں سے اٹھی اور بوجھل قدموں سے ماں کے پیچھے پیچھے چل دی۔

ایک ہفتے بعد موہنی کو اس کی ساس واپس اپنے گھر لے گئی۔ اس کے کمرے کا وہ سارا سامان جو عدت کے وقت ہٹا دیا گیا تھا پھر سے رکھ دیا گیا اور عدت کے دوران کی پابندیاں اٹھا لی گئیں، لیکن اب اسے دوسری طرح کی پابندیوں کا سامنا تھا جو بالاعلان نہیں تھیں۔ موبائل فون پر وہ کس سے بات کر رہی ہے؟ چھت پر وہ کیوں جا رہی ہے؟ ملازماؤں کے ذریعے کوئی خفیہ پیغام رسانی تو نہیں ہو رہی ...... ان سب باتوں پر خفیہ انداز میں نظر رکھی جاتی تھی۔ اسی طرح خاندان کے نامحرم مردوں کی حویلی میں آمد کے وقت، ساس، چھوٹی نند یا کوئی ملازمہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ کسی تقریب یا سوگ میں بھی یہ لوگ اس کے ساتھ سائے کی طرح چپکے رہتے تھے۔ ساس نے اس کا میکے جانا تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اب وہ سال چھے مہینے میں کبھی کبھار ہی وہاں جاتی تھی وہ بھی گھر کے کسی فرد کے ساتھ۔ ان پابندیوں کا مقصد اسے مرد کی قربت سے دور رکھنا اور اس کے دل میں دوسری شادی کی اُمنگ کو پیدا نہ ہونے دینا تھا۔ خاندانی روایت کے مطابق اب وہ کسی اور کی دلہن نہیں بن سکتی تھی، اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی گئی تھی۔ موہنی کی کم سنی کو وجہ بناتے ہوئے اس کے بھائی اور ماں نے اس کی دوسری شادی کے لیے بڑا زور لگایا مگر ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ساس سسر دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں موہنی سے کوئی رائے نہیں لی گئی۔ اسے بہرصورت بڑوں کی بات قبول کرنی تھی۔ آخر کار خاندانی روایت ہی اس کا مقدر ٹھہریں۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی جس سے اس کا دل بہل جاتا یا ...... جس

کے سہارے ساری زندگی تمام ہوجاتی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے بے رنگ و نور زندگی کے بوجھ کو قبول کیا اور اسے دھکیلنا شروع کردیا۔

مونی کی دل چسپی اب کسی چیز میں نہیں رہی تھی۔ اسے شوخ رنگ اور جدید ڈیزائن کے کپڑے اور ان سے میچ کرتی سینڈل، جیولری پہننے اور شہر جا کر تفریح کرنے کا بہت شوق تھا..... وہ سب بھی اس نے ختم کردیا۔ ساس یا نند اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر چلنے کی لیے کہتی تو وہ صاف انکار کردیتی۔ خاندانی تقریبات میں بھی وہ بہ حالت مجبوری شریک ہوتی۔ اسی طرح کھانے پینے سے بھی اس کی رغبت ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ ساس کے زور دینے پر وہ دو چار نوالے زہر مار کر لیتی تھی۔ پہلے پہل تو وہ اپنی والدہ سے موبائل پر بلا ناغہ بات کرتی تھی لیکن پھر یہ رابطہ بھی واجبی سا رہ گیا۔ حویلی میں ویسے تو کوئی مصروفیت تھی نہیں، سارے کام کاج ملازماؤں کے ذمے تھے مگر اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے باہر، پچی خانے کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ اس کے بعد شام کو وہ کچھ وقت اپنی ساس اور نند کے ساتھ گزار کر اپنے کمرے میں آجاتی اور وقت گزاری کے لیے بلا مصرف ٹی وی پر ڈرامے یا سی ڈی پلیئر پر فلمیں دیکھنے لگ جاتی لیکن اس کا کڑا امتحان اس وقت شروع ہوتا جب وہ سونے کے لیے بستر پر جاتی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی تنہائی جاگ جاتی اور جمال ماضی کے روزن سے جھانکنے لگتا۔ اس کی بے باکیاں اور چنگیاں اس کے جسم میں کرنٹ سا دوڑا دیتیں۔ زیادہ عمر ہونے کے باوجود اس کا مزاج بڑا عاشقانہ تھا۔ وہ رات رات بھر اسے جگا کر رکھتا تھا۔ یہ یادیں اور باتیں مونی کے دماغ کو پگھلا کر رکھ دیتیں جن سے اس کا جوان بدن سلگ اٹھتا۔ رگوں میں دوڑتا جذبات کا ابلتا لاوا اس کے وجود میں اُتھل پتھل مچا دیتا اور آنکھوں میں آتی نیند جل بھن کر خاک ہوجاتی۔ ایسی حالت میں وہ کبھی سینے کے بل لیٹ جاتی، کبھی تکیے کو خود سے لپٹا کر خوب خوب بھینچتی، کبھی دائیں بائیں کروٹیں بدلتی اور کبھی کبھی شاور کے نیچے کھڑے ہوکر گھنٹے گھنٹے بھر نہاتی رہتی۔ یہ سب چیزیں اس کی صحت پر بُرا اثر ڈال رہی تھیں جس کی وجہ سے اس کا غصہ اور چڑچڑا پن روز بہ روز بڑھنے لگا تھا۔ وہ بات بے بات پر آپے سے باہر ہوجاتی، بعض مرتبہ اس ہیجانی کیفیت میں اتنی شدت آجاتی جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہوتا زمین یا دیوار پر دے مارتی، اسی دورے کے زیر اثر ایک بار اس نے ملازمہ کو بھی بری طرح پیٹ ڈالا تھا، اس بیچاری نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔

جوان بہو کی اس حالت سے اس کی ساس بخوبی واقف تھی اور ایک عورت ہونے کے ناطے اس کا سبب بھی جانتی تھی مگر چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرسکتی تھی، البتہ ایک دن وہ اسے ایک نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس شہر لے گئی۔ اس نے بھی دوا کے ساتھ بیماری کا اصل علاج دوسری شادی تجویز کیا، جسے پھر رد کردیا گیا اور صرف دوائیں دی جانے لگیں جن سے اسے وقتی آرام مل گیا۔

مونی کو دوائیں لیتے خاصا عرصہ ہوگیا تھا، اس کی صحت اور معمولات میں خوش گوار تبدیلی دیکھ کر ساس کے علاوہ سب ہی حیران تھے۔ ایک صبح مونی کی بڑی نند جو رات ہی کو حویلی پہنچی تھی، تقریباً دوڑتے ہوئے اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوئی ''امی..... امی غضب ہوگیا..... میں مونی سے ملنے جب اس کے کمرے میں گئی تو ملازمہ مجھے دیکھ کر کوئی چیز جلدی جلدی اپنی چادر میں چھپا رہی تھی، میں نے فوراً چادر اُٹروائی تو اس میں سے یہ بیہودہ انگریزی فلم کا ریپر اور سی ڈی ملی۔'' وہ پھولے سانس کے ساتھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی اور دونوں چیزیں ماں کی طرف بڑھادیں۔ ''اور وہ..... مونی خود غسل خانے میں تھی اور وہاں سے..... تو یہ تو یہ عجیب عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے خود دروازے سے کان لگا کر سنی ہیں۔''

ماں نے دونوں چیزیں اس سے لے کر اور دیکھے بغیر اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیں۔ ''وہ بے چاری کیا کرے..... جب فطری اور جائز طریقے پر ناجائز پابندی لگا دی جائے تو بندہ غیر فطری طریقہ اپنانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔'' ماں نے تاسف سے بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے آپ کو پہلے سے پتا تھا؟''

''ہاں ادی..... مجھے پتا تھا..... مجھے یہ بھی پتا ہے اس نے کئی دنوں سے دوائیں نہیں کھائیں اور وہ ان کے بغیر صحت یاب ہورہی ہے۔ میں خود اس کے ڈسٹ بن میں غیر استعمال شدہ دواؤں سے بھرا شاپر پڑا دیکھ چکی ہوں۔'' وہ کچھ لمحے سانس لینے کے لیے رکی۔ ''میں کئی دنوں سے اس سے بات کرنے کا سوچ رہی تھی، مگر ہمت نہیں کر پائی۔ وہ اگر غلط ہے، تو ہم کون سے درست ہیں؟ اسے غلط راہ اپنانے پر ہم ہی نے تو مجبور کیا ہے، پہلے زمانے میں یہ جدید چیزیں نہیں تھیں۔ ٹی وی تک نہیں ہوتا تھا گاؤں میں اور بیوہ جیسے تیسے یہ دن گزار لیتی تھی لیکن اب نیا دور ہے، نئے تقاضے ہیں۔ ہر چیز بدل رہی ہے۔ ہمیں بھی بدلنا ہوگا، فرسودہ روایات ختم کرنی ہوں گی ورنہ یہ نئی نسل بے راہ روی کا شکار ہوجائے گی اور ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔'' ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر کچھ توقف کے بعد ایک عزم کے ساتھ گویا ہوئی۔ ''میں آج ہی تیرے بابا سے مونی کی دوسری شادی کی بات کروں گی۔''

«« ● »»

Editor,Lauh-e-Adab
A-536,portion no:202
first floor,Block-15,
Gulistan e Jauher
Karachi.

● بلال مختار

اپنا شہر

بچے سکول چھوڑنے کے بعد میں سیدھا گھر لوٹ آئی تھی اور شام ڈھلے طلبا کو آن لائن کورسز کروانے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ یہ ایسی ہی اک عام سے بہاؤ میں بہتی دوپہر کا ذکر تھا۔ گھر میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی اور میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھی نئے سمسٹر کا کورس بُن رہی تھی۔ آج عام دوپہروں سے ہٹ کر گاڑیوں کا شور بھی کم سننے کو مل رہا تھا۔ کمرہ کیا تھا بس اک پلندہ سا تھا، چاروں اطراف کتابوں کا انبار تھا اور بہت سے ادھورے صفحات منہ چڑا رہے تھے۔ دیواریں تک میرے ہفتہ وار اوقات اور مصروفیات سے بھرے ہوئے تھے۔ اکثر میں ہنس بھی دیتی کہ کوئی جاننے والا میرے اس خاص کمرہ تک پہنچ آیا تو وہ کیا سوچے گا۔ اتنا بکھرا بکھرا سا سامان، چپکنے والا نوٹس دروازے سے ایسے لپٹے تھے کہ جیسے بھاگنے کی حتی الامکان کوشش میں ہوں مگر نا کام رہے۔ دراز ادھ کھلے کچھ کہتے ہوئے جیسے توجہ کے طالب ہوں۔ کمپیوٹر چوبیس گھنٹے آن اور آن لائن بھی رہتا۔

یہ میرا برقی طریق سے تدریس کا تیسرا سال تھا۔ گھر بیٹھے مالی ضروریات بآسانی پوری ہوتی رہتیں۔ بچوں کو سویرے سکول چھوڑے دیتی، سہ پہر تک ان کی واپسی ہوتی تو پھر بچوں کی کُل کا نات پر پھیلائے میرے سامنے روبرو ہوتی۔ ان کے ساتھ مل کر ہوم ورک مکمل کرنا، باغ میں کھیل کھیلنا اور شام کو بہترین سا کھانا بنانا اور خوب سیر ہوکر ٹی وی دیکھنا۔

دیکھا جائے تو باہر کی دنیا سے دو طریقوں سے خبریں مجھ تک پہنچ پاتیں۔ اک شام کو ٹیلی وژن دیکھنا اور دوسرا میرے ننھیال بچے اخبار بن کر آتے۔ رابیل کی عمر نو سال جب کہ ارحم پانچویں سال میں تھا۔ ارحم کی دوسری سالگرہ ہی افتخار سے طلاق کا دن بھی تھا۔ جب دونوں بچے سکول سے لوٹتے تو انہیں یونیفارم تبدیل کرواتے ہوئے دن بھر کی مصروفیات پوچھا کرتی۔ ارحم تو بس ماما، نو ماما کہتا ہوا بات کو سمیٹ دیتا۔ دوسری طرف رابیل سے اک سوال کے جواب میں پورے کا پورا تھیسس پیش کردیا جاتا۔

''ماما! وہ اپنی مس روبیسا نہیں ہے ناں! وہی گھنگھریالے بالوں والی۔ وہ آج بہت کم میک اپ کر کے آئی تھیں۔ سرخی تک مکمل کتابوں کو چھو نہیں سکی تھی۔ ہم نے پوچھا تو مس نے ڈانٹ دیا۔ سبق یاد کرنے کے دوران شانی نے جواب نہیں دیا تو انہوں نے خوب سنائیں۔۔۔''

رابیل کی طویل داستان سنتے ہوئے میں تب تک ارحم کے کپڑے بدل دیتی اور میز پہ کھانا چُن لیا

ہوتا۔ میری یہی عام سی روٹین گزشتہ تین سالوں سے چلی آرہی تھی۔ طلاق کے بعد باہر کی دنیا سے کافی حد تک رابطے منقطع کرچکی تھی۔ اول اول تو فون بجتے رہتے اور میں اُوں آں کرتی رہتی۔ آہستہ آہستہ میرے قریبی دائرے میں آباد احباب بھی دور ہوتے چلے گئے اور میں اک طرح سے مکمل گوشہ نشینی میں ڈوب چکی تھی۔ ہفتہ کے ہفتہ بازار سے راشن پانی ایک ساتھ لے کر چلی آتی۔ جو کچھ منصوبہ بندی سے ہٹ کے رہ جاتا تو ڈائری میں درج کرتی جاتی تاوقت یہ کہ اک اور ہفتہ زندگی کے دروازہ پہ دستک دے رہا ہوتا۔

میں نے اپنے کمرے میں مکمل طور پہ مدغم ہوجانے کے بعد کافی کامگ اک طرف رکھا اور معمول کے مطابق ای میلز سے شروعات کیں۔ سب سے اوپر طلباء کے گزشتہ سمسٹر پہ طلباء کے تبصروں کا لنک بھیجا گیا تھا۔ جامعہ کی ویب سائٹ پہ جاتے ہی میں نے باترتیب تبصروں پہ نظریں پھیرنا شروع کردیں۔ مگر یہ سرسری دیکھنا زیادہ طویل ثابت نہ ہوسکا۔ اک طالبعلم نے تبصرہ دیا ہوا تھا:

''کورس کے ساتھ ساتھ مس نازنیں کو بھی اپ گریڈ کیا جائے۔ لفظ اپ گریڈ کو بڑا اور واضح انداز میں ٹائپ کیا گیا تھا۔''

اک اور نے لکھا تھا:

''میں جب بھی مس نازنیں کی جماعت میں شامل ہوتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کس قدیم مصر کی گلیوں میں چہل قدمی کررہی ہوں۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی تھی مگر اب لفظ تاریخ سے بھی دل بھرا بھرا سا رہنے لگا ہے۔''

مجھے پے در پے دھچکے لگے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اک زمانہ میں کالج میں بہترین استانی کا ایوارڈ جیتنے کا اعزاز سجانے والی یوں تبصروں کی زد میں تھی۔ پھر میں نے تیسرے تبصرے پہ کلک کیا کہ ہر کلاس میں کچھ منفی سوچیں ضرور ہوتی ہیں اور بیک وقت سب ہی طلباء کو اپنا گرویدہ بنانا ناممکن سا امر معلوم ہوتا ہے۔ آئندہ تبصرہ جات عمومی سے خانہ پوری والے تھے۔ اک اور کچھ بلا دینے والا محسوس ہوا، لکھا تھا:

''مس اچھا پڑھاتی ہیں مگر ان کا لباس انتہائی پرانا اور گھسا پٹا سا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے صدیوں سے لباس تبدیل نہیں کیا گیا۔'' اس کے آگے بزور ہنسنے والی ایموجی ڈالی گئی تھیں۔ مزید لکھا تھا:

''وہ جب بھی کرسی سے اٹھ کر کوئی کتاب اٹھانے کے واسطہ حرکت کرتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کرسی نامکمل سی ہوگی ہو۔ لباس پہ بے تحاشا شکنیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اک عرصہ سے استری نہیں کی گئی۔'' یہ پڑھتے ہی میں ٹھک ٹھکا سا گئی۔ اب میں اپنے لباس پہ بغور دیکھ رہی تھی۔ کمپیوٹر اسکرین سے ہٹ کر آئینہ دیکھا تو مرجھایا ہوا سا چہرہ نظر آیا۔ آنکھوں کے اردگرد ہلکے سے بنے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے میں اپنے آپ پہ

غور کرتی چلی گئی میرے اندر کا اعتماد مزید پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی سمے بعد میں نے سبھی تبصرے پڑھ ڈالتے اور ایسے نکتہ نظر سے غور کرنے لگی جیسے بھیگی بلی اپنے مالک کے سامنے اپنے تمام تر خامیوں سن رہی ہو۔ اسے لگ رہا ہو کہ جو مالک کہہ رہا وہ سچ ہے۔ اس نے جو جو سوچا تھا وہ اس کی دماغ کا فتور تھا۔ حقیقت صرف وہی ہے جو اسے گوش گزار کی جارہی ہے۔

کیا دنیا میں ایسا بھی کوئی کونہ ہے جو مجھے ان تمام انسانوں سے دور لے جائے۔ مجھے شدید قسم کی گراوٹ کا احساس لمحہ بہ لمحہ چڑھان چڑھتا معلوم ہورہا تھا۔ جہاں بس دو وقت کھانے کو ملے اور کچھ رہنے کو گھر ہو اور بس۔

مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کس نہج پہ سوچ رہی ہوں۔ میری منزل کس رخ پہ ہے؟ بس عجیب عجیب سے خیالات دل و دماغ میں جالے بنتے چلے گئے۔ پر کچھ تھا جو مجھے ان سبھی منفی تجربات سے گزر جانے کے باوجود بھی رو کے جارہا تھا۔

میں باورچی خانہ میں چلی گئی۔ کیوں چلی گئی، کچھ پتہ نہیں۔ واپس آئی اور ملحقہ باتھ روم میں چکر کاٹنے لگی۔ دو منٹ کے بعد میں دوسری دفعہ دانت صاف کررہی تھی۔ حالانکہ صبح سویرے اک دفعہ برش کر چکی تھی۔ چند منٹوں کے بعد میں نے مزید غور کیا تو میں چھت پہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اندھیرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی اور جو تھوڑی بہت روشن دانوں سے پہنچ رہی تھی وہ دیوار پہ دیکھنے میں معاونت کررہی تھی۔ چھت کا دروازہ کھولنے کے بعد میں دوسری چھت پہ چکر کاٹنے لگی۔ اب اک دوسرے گھر کے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد تک گلی کے نکڑ تک جانے کے بعد احساس ہوا کہ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ میرا اپنا گھر کون سا ہے۔ میں واپس پلٹی اور گلی کے دوسرے کونے تک بغور چلتی چلی گئی۔ اس دوران سارے سالوں کے طعنے، منفی احساسات، تہمتیں اور بہت کچھ یکجا ہوتے جارہے تھے۔ آوازیں کا شور کہیں نہیں تھا بس جسم کی اندرونی تہہ پہ خیالات بہت سی مکڑیوں کی صورت میں جالے بنتے جارہے تھے۔

گلی کے اس کونے تک پہنچنے کے بعد بھی اپنا گھر نہیں پہچان رہی تھی۔ گماں گزرا شاید دوسری گلی میں میرا گھر ہے۔ اس طرف آہستہ آہستہ چلتی گئی۔ دماغ پہ عجیب سا بوجھ سوار ہوگیا تھا۔ اچانک دل میں عجیب سا خیال کودا۔ میرے گھر کے باہر پلیٹ پہ میرا نام ہوگا مگر میرا نام کیا تھا؟

"اف خدایا، یہ مجھے کیا ہوگیا، یہ میں کس طرف چلتی جارہی ہوں۔" میں اک طرف رک سی گئی اور سوچنے لگی میرا نام میرے کارڈز یا کسی کاغذ پہ لکھا ہوا ہوگا۔ جیب ٹٹولے مگر ندارد۔ دو مختلف رنگوں کے قلم تھے اور بس۔ ان رنگوں کے نام کیا تھا؟

او میرے اللہ، یہ مجھے کیا ہوگا۔ مجھے اپنا سارا پتہ بھولتا جارہا تھا۔ جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی جا رہی تھی، اتنا ہی بھولتی جارہی تھی۔ مزید خوف کی تہہ دماغ پہ تیرنے سی لگی۔ میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔ پر مجھے گھر جانا، کیوں گھر جانا؟ اک اور سوال آواز وارد ہوئی۔ کیوں، یہ تو مجھے نہیں پتہ۔ پھر اک ترتیب لڑائی کے ہر گزرنے والے کے چہرے پہ بغور دیکھی جاتی تا نکہ کوئی مجھے پہچان سکے۔ شاید میرا نام لے لے یا شاید مجھے گھر چھوڑ آئے۔ مجھے بہت عجیب سا محسوس ہورہا تھا مگر اس کے سوا چارہ نہیں رہا۔

شام ڈھلنے لگی تھے اور میں شاہراہ کے اک طرف چلتی جارہی تھی۔ اتنے میں اک گاڑی میرے آگے آکر رکی اور نوجوان نے شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا:

"ایکسکیوز می! کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟ آپ کدھر جارہی ہیں؟"

میں کچھ دیر کو سوچنے لگی کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اسی دوران مجھے نوجوان کی آواز سنائی دی:

"آئیں! میں آپ کو لاری اڈے تک چھوڑ آتا ہوں۔ شاید آپ دوسرے شہر سے آئی ہیں۔"

میں مسافر سیٹ پہ بیٹھ گئی، ہمارے درمیاں کچھ بات نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے سڑک کے اک کنارے اتارا اور اشارتاً بتایا:

"محترمہ! آپ کو وہاں پہ اندرون اور بیرون شہر کی گاڑیاں مل جائیں گی۔"

یہ اک ایسا لمحہ تھا کہ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا بس اک پریشر تھا جو مجھے چاروں اطراف سے بڑھتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ مجھے کچھ تو کرنا ہے، مجھے شاید کہیں جانا ہے۔ وہ ڈرائیور بھی کچھ ایسا ہی کہہ رہا تھا۔ شاید یہ دوسرا شہر ہے۔ پر میرا شہر کہاں پہ ہے؟

اتنے میں اک نوجوان بہت سی آوازوں میں سے میرے قریب آتا ہوا کسی شہر کا نام پکارنے لگا۔ شاید وہ کنڈکٹر تھا، اس نے ایسا کہا جیسے مجھے لگا میں بھی اسی شہر کو جارہی ہوں۔ شکر تھا کہ ابھی تک کنڈکٹر ٹکٹ کاٹنے کو قریب نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں گاڑی میں سوار اپنے شہر کو جارہی تھی۔ ہاں مجھے اپنا کھویا ہوا شہر مل گیا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

45-Shumack Street
Weetangera , ACT
Canberra
Austrailia
+61- 449 233 820

● **نیاز اختر**

بھیڑیے

راجو کی ماں گزشتہ چھ ماہ سے بستر مرگ پر تھی۔ اس کے کینسر کا علاج سی ایم سی ویلور میں چل رہا تھا۔ شروع شروع میں تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جلد ہی ٹھیک ہوجائے گی، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ دوا دارو اور لیزر سینکائی کے باوجود مرض نے دوبارہ سر ابھارا اور چھ ماہ کے اندر ہی اس نے دم توڑ دیا۔ راجو نے اپنی ماں کی تیمارداری اور علاج معالجہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تاہم ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

علاج کے دوران راجو بیشتر اوقات ماں کے قریب ہی رہتا تھا۔ جب بھی ماں درد اور جلن سے بلبلاتی، وہ بے چین ہو اٹھتا۔ ماں کے پاؤں دباتا، سر سہلاتا، اسے تسلی دیتا۔ ایک دن راجو ماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اس نے جب ماں کے چہرے کو بغور دیکھا تو اس نے پایا کہ ماں کی آنکھوں سے آنسو کی پتلی پتلی دھار گر کر تکیے میں سما رہی ہے۔ وہ مضطرب ہو اٹھا اور ماں کو سمجھانے لگا۔ "ماں تم رو کیوں رہی ہو؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے مایوس کن لہجے میں کہا۔ "بیٹا تیری محنت اور خدمت دیکھ کر ہی تو مجھے رونا آتا ہے۔ بھگوان سب کو تم جیسا نیک اور خدمت گزار بیٹا دے۔" تھوڑے توقف کے بعد پھر بولی۔ "بیٹا میری ایک اچھا ہے۔ میں جب مروں تو میرے نام سے دو بچھیاں برہمن کو دان کر دینا۔"

"تم کیسی بات کررہی ہو ماں۔ ارے تم کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گی۔" راجو نے ماں کو ڈھارس تو بندھائی مگر وہ بھی جانتا تھا کہ اس کی ماں کچھ دنوں کی ہی مہمان ہے۔ ماں کی باتیں سن کر اسے اس کی گئو بھگتی کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کی ماں گھر پر صبح و شام اپنے چولہے پر بنی پہلی روٹی گائے کو ہی کھلاتی تھی۔ گائے سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ لکشمی پوجا کے دن بھی وہ سارے نیم کا پالن کر پوجا کرتی تھی۔

ماں کو مکھاگنی راجو کے بڑے بھائی نے دی اور کریا کرم کی ساری ذمہ داری بھی انہوں نے ہی نبھائی۔ ہاں کریا کرم کا سامان مہیا کرانے اور دیگر انتظامات کی ذمہ داری راجو نے اپنے سر اٹھا رکھی تھی۔ اس کے ذمہ سب سے بڑا کام تھا برہمن دان کے لیے دو بچھیاں خرید کر لانا۔ بچھیوں کی تلاش میں وہ سرگرداں رہنے لگا۔ اس نے آس پڑوس کے کئی گاؤں چھان مارے مگر ایک بھی بچھیا نہ ملی۔ تب اس نے اپنے ایک دوست کو ساتھ لیا اور بچھیا کی کھوج میں نکل پڑا۔ تلاش کرتے کرتے دونوں نے کئی گاؤں کی خاک چھان ماری لیکن کہیں بچھیا نہیں ملی۔ تبھی ایک شخص نے بتایا کہ کچھ دوری پر ایک برساتی ندی ہے، اس کی دوسری طرف مویشیوں کا میلہ لگتا ہے، وہاں ضرور مل جائے گی۔ راجو اور اس کا دوست بنٹی برساتی ندی عبور کر کے اس گاؤں پہنچے۔ وہاں جانوروں کا ایک بڑا میلہ لگا

ہوا تھا۔ راجو کے من کی مراد پوری ہوگئی۔ اس نے جھٹ دو بچھیاں چن کر اس کے مالک کو قیمت ادا کی اور دونوں بچھیاں لے کر گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔

برساتی ندی پار کرتے وقت انھوں نے حاجت محسوس کی۔ انہوں نے دونوں بچھیاں شال کے ایک پیڑ سے باندھ دیں۔ رفع حاجت کے بعد راجو نے سوچا تھوڑا سستا لیا جائے اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے پڑے پتھر پر دونوں بیٹھ گئے۔ گرمی شباب پر تھی۔ سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر انہیں بڑا اچھا لگ رہا تھا کہ اس کی ماں کی اچھا کے مطابق دو بچھیاں مل گئی تھیں۔ ماں کی آتما کو شانتی ملے گی۔ وہ ان ہی باتوں میں لگا تھا کہ کسی نے اچانک شور مچانا شروع کر دیا۔ "اور گاں دھرا (بچا چور)......اور گاں دھرا (بچا چور)...... "

برساتی سوکھی ندی کے کنارے بالو اور کنکر پتھر سے کھیل رہے بچے بھی شور مچاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ پہلے تو راجو اور اس کے دوست بنٹی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیوں کہ جو کچھ وہ بول رہے تھے، وہ ان کی سمجھ سے پرے تھا۔ لیکن جب ڈھیر ڈھیر لوگ ان کی طرف آنے لگے تو انہیں لگا کہ اجنبی جان کر انہیں ہی لوگ مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں اکثر ان علاقوں میں بچہ چور کی افواہیں گشت کرتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے بھک منگے، پاگل، پھیری والے، خوانچے والے اور اجنبی اکثر پٹتے رہتے ہیں، ان کی جان کے لالے بھی پڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف سے لوگ نکل نکل کر راجو اور بنٹی کے نزدیک آنے لگے۔ لوگوں کے نزدیک آنے سے راجو اور بنٹی سہم سے گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لوگوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور سوال پر سوال داغنے لگے۔ حال ہی میں گھٹی شوبھاپور کی وہ گھٹنا راجو کو یاد آنے لگی، جب چھ اجنبی آدمیوں کو لوگوں نے بچہ چور سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ راجو کی آنکھوں کے سامنے میڈیا میں چھپی ان سبھی لوگوں کی تصویریں رقص کرنے لگیں جو ہتھیاروں سے لیس بھیڑ کو، اپنی جان کی امان کے لیے، ہاتھ جوڑ کر منت و سماجت کرتے رہے مگر آدم زاد بھیڑیوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ لاٹھی، ڈنڈا، کلہاڑی، بھالا اور پتھر سے مقامی پولیس کی موجودگی میں سبھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

بھیڑ بتدریج بڑھتی ہی جارہی تھی۔

راجو اور بنٹی بھیڑ دیکھ کر حواس باختہ ہوگئے۔

"تم ہیاں کا کرتا......کا کام......؟" ایک نے اس کے قریب آکر سوال کیا اور دوسرے نے آتے ہی اس کو ایک دھول جما دیا۔ اب راجو اور اس کے دوست کی سمجھ میں آگیا کہ لوگ انہیں بچہ چور سمجھ رہے ہیں۔ تبھی راجو کو اپنی دونوں بچھیاں یاد آئیں۔ راجو نے فوراً ہاتھ جوڑ کر بچھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ میلہ آئے تھے بچھیا خریدنے۔ و......ہاں......گاچھ کے نیچے بندھی ہیں۔"

کچھ لوگوں نے نظریں دوڑائیں تو واقعی دو بچھیاں شال کے درخت سے بندھی تھیں۔ تبھی بچھیوں کو

بیچنے والا شخص بھی سامنے نظر آ گیا۔اس نے اس بات کی فوراً تصدیق کردی۔اس کے تصدیق کرتے ہی بھیڑ میں تھوڑی نرمی آ گئی۔ایک بزرگ شخص نے، جو شائد اس گاؤں کا پردھان تھا، راجو کو بچھیاں لے کر جانے کا اشارہ کیا۔اب راجو اور بنٹی کی جان میں جان آئی۔انہیں اس وقت لگ رہا تھا کہ ان کی زندگی کی گاڑی اسی گاؤں میں ہمیشہ کے لیے رک جائے گی۔دونوں نے بچھیوں کو پرنام کیا کیوں کہ ان ہی کی وجہ سے دونوں کی جانیں بچی تھیں۔جلدی جلدی دونوں نے پیڑ سے بچھیوں کو کھولا اور ان کی رسی پکڑ کر سرپٹ بھاگنے لگے۔

دہشت زدگی میں دونوں دوستوں نے، گرتے پڑتے جلدی جلدی دو گاؤں عبور کر لیے۔تیسرے گاؤں کی سرحد پار کرنے ہی والے تھے کہ اس گاؤں کے شیو مندر کے نزدیک چند لوگ تاش کھیلتے نظر آئے۔راجو اور بنٹی کو پسینے سے شرابور تیز تیز قدموں سے بچھیوں کو ہنکاتے ہوئے لے جاتے دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ایک نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کاٹنے لے جا رہا ہے۔سالا کسائی ہے......''

دوسرے نے کہا۔''کہاں بھاگا جا رہا ہے۔رک......رے رک......سنتا نہیں ہے؟''

ان لوگوں کو نزدیک آتے دیکھ راجو اور بنٹی نے اپنی اپنی چال اور تیز کردی، جس سے ان کا شک اور گہراتا گیا۔ایک نے فوراً دونوں بچھیوں کے ساتھ راجو اور بنٹی کی تصویر کھینچ لی اور اسے وہاٹس ایپ پر ڈال دیا۔دوسرا موبائل پر لوگوں کو فون کرنے لگا۔ایک نے کہا۔''سالا رک پرتی بندھت مانس کھائے گا۔''اتنا کہہ کر وہ شور مچانے لگا۔راجو اور بنٹی یکبارگی بچھیاں لیے رک گئے۔پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے ہوں۔وہاٹس ایپ مسیج اور فون کا ہی فوری نتیجہ تھا کہ گاؤں کے لوگ شور مچاتے ہوئے، دوڑ دوڑ کر ان کے نزدیک آنے لگے۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر دونوں کے اردگرد اکٹھا ہو گیا۔سب کے سب ایک ہی طرح کی باتیں کرنے لگے۔کوئی راجو کے درد کو سمجھنے والا نہیں تھا۔

راجو اور بنٹی اپنے کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔انہیں لگ رہا تھا کہ وہ آدم زاد بھیڑیوں کے بیچ گھر گئے ہوں اور بھیڑیے انھیں ختم کرنے پر تلے ہوں۔فرق صرف اتنا ہی تھا کہ بھیڑیے نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں لیکن آدم زاد بھیڑیے انسانی جان لے کر اس کا تماشہ دیکھتے ہیں، مزہ لیتے ہیں۔ایک بار پھر راجو کو بچھیوں کی رسّیاں چھوٹتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔دونوں کے قریب آتے ہی ایک شخص چلایا۔

''سالا تم لوگ کو یہی کھانے کو ملتا ہے۔دنیا میں اور کوئی جانور نہیں ہے کیا......؟''

دوسرے نے کہا۔''کیا نام ہے تمہارا؟''

''م......م......میرا نام......راجو......ہے۔''

''ہم بن......بنٹی ہیں......''بنٹی نے بھی بلا تاخیر اپنا نام بتا دیا۔

تیسرے شخص نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔''دیکھئے سالوں نے نام بھی ایسا رکھا ہے کہ دھرم کا پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔پکا یہ دونوں بچھیوں کو کاٹنے لے جا رہے ہیں۔''

سہما سہما سا راجو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔''نہیں نہیں، ہم لوگ نرامش ہیں، برہمن دان کے لیے لے جا رہے ہیں۔''

''برہمن دان......کا رے ہم لوگوں کو ہائی کورٹ دکھاتا ہے۔کاٹ کے کھائے گا اور بولتا ہے برہمن دان......سچ سچ بتا، نہیں تو جان سے جائے گا۔''چوتھا آدمی پورے طیش میں تھا۔

اس بیچ مقامی تھانیدار بھی چار کانسٹبل کے ساتھ اس بھیڑ کے پاس پہنچ گیا۔داروغہ جی نے چاہا کہ دونوں کو اپنے قبضے میں لے لیں۔بلکہ انہوں نے دونوں کو جیپ میں بٹھا بھی لیا۔لیکن بھیڑ کے آگے ان کی ایک نہیں چلی۔دونوں کو جیپ سے اتار لیا گیا۔بھیڑ نے داروغہ کو متنبہ کیا کہ دھرم کا معاملہ ہے آپ بیچ میں نہ پڑیں۔اس طرح داروغہ اور اس کے کانسٹبل بھی تماشائی بن گئے۔

اب تو آس پاس کی پوری خلقت سمٹ کر بھیڑ کا حصہ بن چکی تھی۔سب کے سب جوش وولولے سے لبریز تھے۔جیسے کوئی معرکہ سر کرنے والے ہوں۔اتنے میں ایک مسٹنڈا آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا راجو اور بنٹی کے قریب آیا اور کہا''ایسا کرو کہ دونوں کا دستر اُتار کر چیک کرو۔''اس کی اس تجویز پر بھیڑ کے زیادہ تر لوگوں نے ہامی بھر دی۔راجو اور بنٹی کو کاٹو تو خون نہیں۔سکتے میں آ گئے۔سہمے ہوئے تو تھے ہی شرم سے بھی پانی پانی ہونے کی نوبت آن پڑی تھی۔بھیڑ میں سے ایک شخص نے راجو کو ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔''کھول اپنا اپنا پینٹ اور پاجامہ......''

راجو اور بنٹی نے رحم طلب نگاہوں سے ایک نظر بھیڑ کو دیکھا پھر ایک دوسرے کو، جیسے دونوں کی نگاہیں کہہ رہی ہوں کہ اب اس کے سوا چارہ کیا ہے۔ راجو نے پاجامے کا ناڑا اور بنٹی نے پینٹ کا چین کھولا۔اور اسی طرح آنکھیں موندے اپنے اپنے کپڑے نیچے سرکانے لگے۔ابھی دونوں کے کپڑے اترے بھی نہیں تھے کہ ایک نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

''سالا دیکھتا کیا ہے بے۔مارو سالوں کو۔''

اتنا سننا تھا کہ سارے آدم زاد بھیڑیے راجو اور بنٹی پر ٹوٹ پڑے۔

دور کھڑی دونوں بچھیاں جگالی کرتے کرتے رک گئی تھیں۔

◄◄ ● ►►

Flat No.206, T.Khan Complex,Chuna Shah Colony,
P.O:Mango,Jamshedpur-831012 (Jharkhand),
09431398553

● نشاط پروین

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

انسان ابھی ہے، ابھی نہیں ہے۔ سوچ کر کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا آدمی بلبلہ ہے پانی کا

مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ بڑی پھوپھی اب نہیں رہیں۔ جنہوں نے اپنے بال بچوں کی دنیا آباد کی وہ خود اس دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ انہیں تو ابھی حج کو جانا تھا، اگر وہ وہاں چلی گئیں جہاں سے لوٹ کر کوئی واپس نہیں آتا۔ انسان اپنی زندگی میں کیا کیا پلان بناتا ہے، کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہے۔ اور یہ شاید خدا ہی رضا تھی کہ میں نے ان کے انتقال سے بس تھوڑی ہی دیر پہلے انہیں دیکھا تھا۔ میرے نصیب میں شاید ان کا آخری دیدار لکھا تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ پوجا کی چھٹیوں میں وہاں گئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اندر سے اتنی بیمار ہیں۔ پچھلے مہینے تو ان کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ انہیں اسپتال میں داخل کرانا پڑ گیا تھا۔ میرے دل میں انہیں دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی مگر میں چاہ کر بھی انہیں دیکھنے نہیں جا سکی کیونکہ میرے ''اُن'' کے پاس چھٹیاں نہیں تھیں۔ بس دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر خبر ملی کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں اور گھر لوٹ آئی ہیں ہیں۔ دل کو یک گونہ تسلی ہوئی۔

وہ بڑی سے بڑی مصیبت کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ بڑی ہمت اور حوصلے والی خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں کئی حادثے ہوئے، کئی طوفان آئے، ان کے خرمن پر کئی بار بجلیاں گریں مگر ان کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ اگر کبھی کوئی افسوس ظاہر کرتا تو کہتیں کہ اس میں کون سی نئی بات ہے۔ دنیا تو غم اور خوشی دونوں کا نام ہے۔ دیکھو فلاں کے ساتھ ایسا ہوا، فلاں کے ساتھ ویسا ہوا، اگر میرے ساتھ بھی ہوا تو کیا برا ہوا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے میں تو ماہر ہے مگر خدا کی نعمتوں کا حساب بھول جاتا ہے۔

میں جب بڑی پھوپھی کی زندگی پر نظر ڈالتی تو آنکھوں کے سامنے ایک ایسی عورت کی تصویر آ جاتی ہے جو طوفان میں دیا جلائے کھڑی ہو۔ ابھی ان کی شادی کو چند ہی سال ہوئے تھے کہ ان کے شوہر یعنی میرے پھوپھا جان ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی اور ساری باتوں کو ٹھیک طور سے سمجھ نہیں پاتی تھی۔ بہت سی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ ان میں کچھ سمجھ میں آتی تھیں اور

کچھ نہیں۔ گاؤں میں ان کا سسرال ہمارے گھر کے پاس ہی تھا۔ بیوگی کے بعد وہ چند مہینوں تک گاؤں میں رہیں پھر اپنے بچوں کو لے شہر شفٹ کر گئیں۔ شہر میں بھی ہم لوگوں کا ایک آبائی مکان تھا جس کے ایک حصے میں ان کا فلیٹ تھا اور دوسرے حصے میں ہم لوگوں کا۔ اب ان کی زندگی کا محور و مرکز ان کے بچے تھے۔ سبھوں کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کی ذمہ داری اب ان کے سر تھی اور انہوں نے یہ ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائی۔ شوہر کی قلیل پنشن اور گاؤں سے آنے والی محدود آمدن ہی ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ اور اتنی کم آمدنی میں بھی انہوں نے اپنے بال بچوں کی پرورش شاندار طریقے سے کی۔ اچھا کھانا عمدہ لباس اور بہترین تعلیم۔

وقت گزرتا گیا اور ننھے ننھے پودے تناور درخت میں تبدیل ہوتے گئے۔ بیٹے پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گئے اور غیر ممالک میں جا بسے۔ روپے پیسے کی ریل پیل ہونے لگی لیکن بڑی پھوپھی جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ پیسہ آ جانے سے ان کے رہن سہن اور طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پہلے بھی صابر و شاکر تھیں اور ابھی بھی وہ ہر حال میں خدا کا شکر بجا لایا کرتی تھیں۔ لیکن انسان کا مصیبت اور پریشانی سے تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی انہوں نے بڑی دھوم دھام سے کی اور دل کے سارے ارمان نکالے۔ شادی کے ایک سال بعد جب انہوں نے نواسی کا منہ دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کیسی نرم و نازک سی، پیاری پیاری گڑیا تھی ان کی نواسی۔ خوب گورا رنگ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک اور گلابی ہونٹ۔ نواسی کی آمد نے گویا ان کے جسم میں نئی روح پھونک دی تھی اور وہ اسے ہر وقت گود میں اُٹھائے پھرتیں۔ لیکن ابھی جی بھر کے خوش بھی نہ ہو پائی تھیں کہ تقدیر کا بے رحم طمانچہ اس خاندان کے منہ پر پڑا۔ ان کے داماد ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ بیٹی بیوہ اور نواسی یتیم ہو گئی۔ ان کے چہرے پر غم کی لکیریں نمایاں ہو گئیں لیکن جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ بیٹی کی پہاڑ جیسی زندگی سامنے کھڑی تھی۔ انہوں مے ہمت نہ ہاری اور بیٹی کا گھر ایک بار پھر بسا دیا۔

یادیں بہت ساری ہیں۔ کچھ روشن کچھ دھندلی، کچھ کھٹی کچھ میٹھی۔ انہیں قصے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے گاؤں کے واقعات، خاندان بھر کی کہانیاں، عورتوں اور مردوں کے ناجائز تعلقات کے قصے۔ اور یہ سب باتیں مزے لے لے کر بیان کرتیں۔ انہیں اس وقت اس بات کا خیال نہ رہتا کہ آس پاس چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں بھی ہیں جو اُن کی باتوں کو غور سے سن رہے ہیں۔ اور انہیں خیال بھی کیسے آتا کیونکہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے وقت ان کی نگاہیں دور کہیں خلاؤں میں بھٹکتی رہتیں۔ وہ سناتی جاتیں اور ہم لوگ سنتے جاتے۔ افسوس کہ ماضی کی داستانیں سنانے والی آواز سدا سدا کے لیے خاموش ہو چکی ہے اور دل

کے اندر سناٹا پھیلتا جا رہا ہے۔ لیکن باہر والوں کے کسی کے دل میں پھیلتے ہوئے سناٹے سے کیا مطلب؟

شہر بھر میں دسہرہ کی دھوم تھی۔ سڑکوں پر لوگوں کا اژدحام تھا۔ ہم لوگ بھی شام سے اس بھیڑ کا حصہ بنے گھوم رہے تھے۔ پھر ہم لوگ جب چلتے چلتے تھک گئے تب گھر جانے کے لیے مڑے۔ گلی میں داخل ہونے کے بعد پہلے بڑی پھوپھی کا گھر ملتا تھا۔ ہم لوگ ان کے گھر بغیر درواز ہ کھٹکھٹائے داخل ہو گئے۔ دروازہ تو غیروں کا کھٹ کھٹایا جاتا ہے، اپنوں کا نہیں۔ وہ تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور میں اندر والے کمرے میں پھوپھی جان کے پاس چلی گئی۔ وہ بستر پر لیٹی تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ لیکن اس حال میں بھی وہ برابر بولے جا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کا سینہ زور زور سے چل رہا ہے اور انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ مگر وہ اپنی تکلیف کو چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کی نواسی فاطمہ ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگا کہ پھوپھی جان کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ تو مسلسل دھیرے دھیرے بولے جا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے فاطمہ سے کہا کہ وہ خالو جان کو ناشتہ کرائے۔ ان کا اشارہ میرے شوہر کی جانب تھا۔ اس وقت گھر میں ان کی بڑی بیٹی اور بہوئیں بھی موجود تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محبت کی گرمی ان کی ہتھیلی سے پھوٹ رہی تھی۔ رات کے نو بج گئے تو ہم لوگ اپنے فلیٹ پر چلے گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فاطمہ کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ بڑی پھوپھی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی ہے اور انہیں ہاسپٹل لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے لیے دعا مانگی اور پھر کچن میں مصروف ہو گئی۔

ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ پھر کسی کا فون آیا۔ بڑی پھوپھی گزر گئیں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں گرتے پڑتے پھوپھی کے فلیٹ کی جانب دوڑ پڑی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ ابھی تھیں ابھی نہیں ہیں۔ کیا ان کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی؟ کیا ان کی آنکھیں سدا کے لیے بند ہو گئیں۔ دل ماننے کو تیار نہ تھا مگر حقیقت حقیقت ہے۔ ان کے فلیٹ پر کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ ہر شخص فون لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ اور رشتہ دار سب جمع ہونے لگے۔ مرد ہاسپٹل کی طرف دوڑ پڑے اور ادھر میت کا انتظار ہونے لگا۔ فاطمہ ان کے ساتھ رکشے پر سوار ہو کر گئی تھی۔ مرد لوگ موٹر سائکل پر تھے۔ ہاسپٹل میں ان کے ٹیسٹ لیے گئے۔ بی پی اور بلڈ شوگر دونوں بڑھے ہوئے تھے لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر انہیں ایک انجکشن لگایا گیا اور انہیں گھر واپس لے جانے کو کہا گیا۔ فاطمہ نے انہیں سنبھال رکھا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ سنبھلی اور وہ پھر فاطمہ سے باتیں کرنے لگیں۔ شہر کی جگ مگ روشنیاں انہیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ لیکن اچانک باتیں کرتے کرتے ان کی گردن

ڈھلک گئی۔ فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے رکشے والے کو رکنے کو کہا۔ رکشے کے پیچھے پیچھے گھر کے جو لوگ موٹر سائکل پر دھیرے دھیرے آ رہے تھے وہ بھی رک گئے۔ رکشے کو واپس اسپتال کی جانب موڑ دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا اور ان کے چہرے کو چادر سے ڈھک دیا گیا۔ پھر یہ اندوہناک خبر پورے میں بجلی طرح پھیل گئی۔ ان کا فلیٹ آدمیوں سے بھر گیا۔ گلی بھی بھر گئی اور ہر شخص کی نگاہیں سڑک پر ٹک گئیں۔ اسپتال میں خانہ پُری ہوئی اور ان کا تابوت رات کے ایک بجے گھر پہنچا۔ آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی اور پوری فضا پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ گھر کے لوگ تو میت کے ساتھ ساتھ فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ ہر طرف چیخ پکار کی آواز بلند ہو رہی تھی مگر میرے سناٹا تھا، صرف سناٹا۔

«●»

Shah Colony
Shah Zubair Road
Munger-811201
8210489478

جوانی میں صحبت غلط مل گئی تو میں گھر دیر سے آنے لگا، رات دیر تک گھر سے باہر رہنا اور سارا سارا دن سوئے رہنا معمول بن گیا۔ امی نے بہت منع کیا لیکن میں باز نہ آیا۔ شروع شروع میں وہ میری وجہ سے دیر تک جاگتی رہتیں بعد میں سونے سے پہلے فریج کے اوپر ایک چٹ چپکا کر سو جاتیں جس پر کھانے کی نوعیت اور جگہ کے بارے میں لکھا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ چٹ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور ''گندے کپڑے کہاں رکھتے ہیں اور صاف کپڑے کہاں پر رکھے ہیں'' جیسے جملے بھی لکھے ملنے لگے، نیز یہ بھی کہ آج فلاں تاریخ ہے اور کل یہ کرنا ہے پرسوں فلاں جگہ جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ ایک دن میں رات دیر سے آیا، بہت تھکا ہوا تھا۔ حسب معمول فریج پر چٹ لگی ہوئی دیکھی لیکن بغیر پڑھے میں سیدھا بیڈ پر گیا اور سو گیا۔ صبح سویرے والد صاحب کے چیخ چیخ کر پکارنے سے آنکھ کھلی۔ ابو کی آنکھوں میں آنسو تھے انہوں یہ اندوہناک خبر سنائی کہ بیٹا تمہاری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ میرے تو جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، غم کا ایک پہاڑ جیسے میرے اوپر آ گرا...... ابھی تو میں نے امی کے لئے یہ کرنا تھا، وہ کرنا تھا...... ابھی تو میں سدھرنے والا تھا...... میں تو امی سے کہنے والا تھا کہ اب میں رات دیر سے نہیں آیا کروں گا......

تدفین وغیرہ سے فارغ ہو کر رات کو جب میں نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہوا تو اچانک مجھے رات والی چٹ یاد آ گئی۔ فوراً گیا اور اتار کر لے آیا، اس پر لکھا تھا:-

''بیٹا آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں سونے جا رہی ہوں، تم جب آؤ تو مجھے جگا لینا، مجھے ذرا اسپتال تک لے جانا۔''

☆☆☆

(نامعلوم)

● ناول کا ایک باب

● **اقبال حسن خاں**

راج سنگھ لاہوریا

(گذشتہ سے پیوستہ) بڑی سڑک قریب تھی اور ضامن بھائی عجیب وغریب حرکتیں کر رہے تھے، چنانچہ لوگ سمجھے کہ شاید کوئی منچلا بجائے سائیکل کے موٹر سائیکل ایک ہفتے چلانے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اُن دنوں ایسے لوگ بھی تھے جو باقاعدہ اعلان کر کے ایک ہفتے سائیکل چلایا کرتے تھے اور جملہ ناگزیر ضروریات اسی دوران پوری کیا کرتے تھے اور جب اُترتے تھے تو وہاں جمع لوگ اُنہیں، سائیکل چلانے یا سائیکل چلانے کے دوران قدرتی افعال سرانجام دینے کی وجہ سے، حسب استطاعت انعام واکرام دیتے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہاں ٹھٹ لگ گئے۔

"ابا یہ آدمی کب تک موٹر سائیکل چلائے گا؟" میں نے سنا ایک معصوم بچہ اپنے باپ سے سوال کر رہا تھا۔

"دیکھتے رہو۔ مجھے نہیں لگتا ایک ہفتے سے پہلے اُترے گا۔"

ہجوم جاننے کو بے چین تھا کہ یہ کون آدمی تھا، کب سے چلا رہا تھا اور کب تک چلانے والا تھا۔ میرا جی چاہا کہ چپکے سے نکل جاؤں مگر ضامن بھائی کو اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔

مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب میں ضامن بھائی کے چہرے پر بیچارگی دیکھ سکتا تھا۔ وہ جب بھی ڈولتے ہجوم تالیاں بجاتا اور کچھ لوگ نجانے کیوں زندہ باد کے نعرے بھی لگاتے۔ اور اس دوران اگر ضامن بھائی ہجوم کے قریب سے گزر رہے ہوتے تو میں اُن کے لبوں کی جنبش سے اندازہ کر لیتا کہ وہ ہجوم کو کس قبیل کی گالی دے رہے ہوں گے۔

پھر مجھے لگا جیسے ضامن بھائی اشارے سے کچھ مانگ رہے تھے۔ میں انتہائی شرمندگی کے عالم میں کچھ دیر موٹر سائیکل کے ساتھ بھاگا اور فقط اتنا ہی سمجھ پایا کہ وہ کھانے کو کچھ مانگ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُنہیں کیا اور کیسے کھانے کو دوں۔ جب میں ہجوم میں واپس آیا تو لوگ یہ جاننے کو میرے گرد جمع ہو گئے کہ میرا ضامن بھائی سے کیا تعلق تھا اور یہ بھی کہ کیا میں اُن کا منیجر تھا؟ اب شام ہو رہی تھی۔ میدان میں اندھیرا دھیرے دھیرے اُتر رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ایک ایسی موٹر سائیکل جو اپنی مرضی کرتی تھی اُس میں روشنی کا انتظام بھی ہوگا۔ لیکن یہ مشکل جلد ہی حل ہو گئی۔ ہجوم دیکھا تو چند ٹھیلے والوں نے بھی اُدھر کا رخ کر لیا۔ اُن میں سے چند کے ٹھیلوں پر گیس کی تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہاں خریداری

شروع ہو گئی۔ لوگ کھا رہے تھے، پی رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ صرف میں ہی جانتا تھا یہ وہ شخص جس کے دم سے یہ ساری رونق وہاں لگی ہوئی تھی کس مصیبت سے گزر رہا تھا۔

رات بھیگنے لگی۔ مجمع منتشر ہونے لگا اور میں نے سنا کئی لوگ کل سویرے سے آنے کو کہہ رہے تھے کیونکہ اُن کا اندازہ تھا کہ یہ آدمی ایک ہفتے سے پہلے اس موٹر سائیکل سے نہیں اُترنے والا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ موٹر سائیکل کا پٹرول ختم ہو گیا اور اُس کی رفتار سست پڑی اور پھر وہ رک گئی۔ میں بھاگ کر موٹر سائیکل اور ضامن بھائی کے قریب گیا۔ گو موٹر سائیکل رکی ہوئی تھی مگر ضامن بھائی اُس سے نیچے نہیں اُتر رہے تھے۔ میں نے جیسے ہی اُن کی کمر میں ہاتھ ڈالا وہ میرے اُوپر دھڑام سے آن گرے۔ موٹر سائیکل دوسری طرف گری۔ جب میں نے اُنہیں سہارا دے کر اُٹھایا تو اُنہوں نے بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ دیئے اور میرے سہارے چند قدم چل کے گھاس پہ بیٹھ گئے اور بولے۔

"مجھ سے دور ہی رہیو۔ کپڑے سنے ہیں میرے۔"

اگلے دن ہم نے موٹر سائیکل پچاس روپے نقصان کے ساتھ بشیر کباڑیئے کے حوالے کر دی۔

راج سنگھ ابھی تک حنیفے پہلوان کے گھر میں رہ رہا تھا۔ محلے کے قدیمی لوگوں کے اُس کے بزرگوں سے تعلقات رہے تھے اس لئے اُن کے لئے تو وہ کسی حد تک قابل قبول ہو چکا تھا لیکن وہ لوگ جو سرحد پار کر کے آئے تھے اور جنہیں سکھوں کے ہاتھوں کئی قسم کے نقصانات پہنچے تھے، اُس سے بے حد نفرت کرتے تھے۔ میں راج سنگھ سے جب بھی ملا میں نے اُسے ایک خلیق اور شریف آدمی پایا جو اپنی بیٹی پریتی کی تعلیم کے سلسلے میں پریشان تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو دو تین سکولوں میں داخلے کے لئے لے جا چکا تھا لیکن اُسے صاف بتلا دیا گیا تھا کہ چونکہ وہ ایک سکھ تھا اس واسطے اُس کی بیٹی کو داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ اُس کا بیٹا ابھی چھوٹا تھا اس لئے اُس کے داخلے کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔

راج سنگھ سے سب سے زیادہ نفرت وہ لوگ کرتے تھے جنہیں اُس کا گھر اُس کی غیر موجودگی میں الاٹ کر دیا گیا تھا۔ راج سنگھ نے اس سلسلے میں پہلے محکمہ بحالیات سے رجوع کیا تھا لیکن وہ شخص جس نے یہ مکان چھے سو روپے رشوت لے کر الاٹ کیا تھا، سدراہ بن گیا تھا۔ راج سنگھ کو جن لوگوں نے ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کیا تھا اُن میں تاری، ٹھیکیدار فتح خان اور بجی گڈیوں والا سرفہرست تھا۔

جالندھر کے وہ لوگ جنہیں راج سنگھ کا گھر اُس کی غیر موجودگی میں الاٹ ہوا تھا، اُس کے خلاف تو تھے مگر وہ اندر سے ڈرے ہوئے بھی تھے کیونکہ ایک تو اُن بیچاروں کی اس میں کوئی غلطی نہیں تھی اور دوسرے وہ تازہ تازہ ہجرت کے صدمے سے گزر رہے تھے۔ وہ اپنی عزتیں تو بچا لانے میں کامیاب ہو گئے

تھے اور جانیں بھی مگر تین بیٹوں میں سے بڑا بیٹا نیم پاگل ہو گیا تھا اور اس کا سبب اُس کے سر پہ لگنے والی کوئی شدید ضرب تھی۔ پاگل بیٹا سارا دن محلے میں گھومتا پھرتا اور اِدھر اُدھر بکھرے ردی کاغذ جمع کرتا تھا۔ وہ ایک بے ضرر پاگل تھا اس واسطے محلے کی عورتیں اُسے کھانے پینے کو بھی دیا کرتی تھیں اور اُس سے اپنے حق میں دعا کرنے کو بھی کہتی تھیں۔

راج سنگھ کے خلاف پرچہ درج کروا دیا گیا۔ پرچے میں لکھوایا گیا تھا کہ وہ ایک ہندوستانی شہری ہے جو پاکستان میں گڑبڑ پھیلا رہا ہے اور اس سلسلے میں محلے کا امن وسکون برباد کرنے کو اُس نے اپنے ساتھی بدمعاشوں کی مدد حاصل کر رکھی ہے۔ راج سنگھ اور حنیفے پہلوان کو، جس کے گھر میں راج سنگھ وقتی طور پر مقیم تھا، اُسی شام گرفتار کر لیا گیا۔ اس بات کا محلے میں بڑا چرچا ہوا۔ محلے کی رائے عامہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ وہ لوگ جو راج سنگھ اور اُس کے خاندان کو پہلے سے جانتے تھے، گو اُس کے ہمدرد تھے لیکن کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرنے سے ڈرتے تھے۔ بس شوکی اور ضامن بھائی جیسے لوگ ہی اُس کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ تھے۔ میں دل سے راج سنگھ کے ساتھ تھا مگر اپنے گھر والوں اور خاص طور پر اپنے شرارتی ماموں کی وجہ سے کھل کر نہیں بول سکتا تھا۔ ہم شام کو راج سنگھ اور حنیفے کے لئے کھانا لے کر تھانے گئے۔ ضامن بھائی ایسے کاموں کو سیدھا کرنے میں ید طولی رکھتے تھے، چنانچہ وہ ہمیں تھانے کی بنچوں پر بٹھا کر چند لمحوں کو تھانیدار کے کمرے میں گئے اور جب واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔

"اب چلو اور ملاقات کر کے یہ کھانا ٹھسا دو سالوں کو۔"

اُنہوں نے یہ کہہ کر مجھے اور شوکی کو آنکھ ماری۔

راج سنگھ اور حنیفا ایک نیم تاریک کوٹھری میں تھے۔ جب ہم سلاخوں کے قریب پہنچے تو حنیفا بیٹھکیں لگا رہا تھا اور راج سنگھ چت لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر دونوں قریب آ گئے۔ شوکی نے کھانا سلاخوں سے راج سنگھ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"رات گزارو کسی طرح۔ صبح تمہاری ضمانت کا بندوبست کرتے ہیں۔"

حنیفے نے کھانا ایک طرف رکھا اور کسی کو گالی دے کر بولا۔

"شوکی باؤ۔ کس بات کی ضمانت؟ ہم نے جرم ہی کونسا کیا ہے؟"

اس پر ضامن بھائی بھڑک کے بولے۔

"سالے ہر وخت پہلوانوں کی طرح پیٹ سے مت سوچا کر۔ وہ سالے وِس راج سنگھ کو ہندوستانی بتا رہے ہیں۔ یہ غیر قانونی طور پر پاکستان میں آیا ہے اور یہاں فساد پھیلانا چاہتا ہے۔ میں اپنی

آنکھوں سے رپوٹ دیکھ کے آ ریا ہوں۔"

راج سنگھ خوفزدہ تھا۔ وہ بولا۔

"یار کیا ظلم ہے۔ یہ لوگ پاکستان کا نام بیچ میں رکھ کر مجھ سے میرا وطن چھین رہے ہیں۔ مجھ پہ یہ مقدمہ ٹھونک دیا ہے کہ میں سکھ ہوں تو پاکستان میں نہیں رہ سکتا؟ اوئے یہ کدھر کا انصاف ہے؟ میں جان دے دوں گا پر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

پھر اُس نے ہوا میں ایک گالی نجانے کسے دی اور غیر ارادی طور پر سلاخیں دھیرے دھیرے بجانے لگا۔ شوکی نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو فکر کیوں کرتا ہے؟ تیرے لئے ہر کوشش کریں گے۔ تو جانتا ہے میں لیڈری کرتا ہوں اُدھر یونیورسٹی میں۔ ایک اشارہ کر دوں تو پانچسو لڑکے اس تھانے کو گھیر لیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ ابھی اس کی نوبت آئی ہے۔ بے غم ہو جا یار۔"

میں نے دیکھا ان باتوں سے راج سنگھ کچھ حوصلہ مند ہوا اور اُس نے کتنی ہی مرتبہ کی کی ہوئی بات ایک مرتبہ پھر دہرائی۔

"ٹھیک ہے یار۔ بڑے دنگے ہوئے تھے اور سکھوں نے بڑی حرام توپی بھی کی تھی۔ پر جیسے مسلمانوں نے ہندو سکھوں کو مارا تھا اور اُس میں تم اور یہ ضامن بھائی شامل نہیں تھے، ویسے ہی اُن دنگوں میں میں بھی شامل نہیں تھا۔ میری طرح کے بہت سے سکھ شامل نہیں تھے۔ یہ بات کیوں سمجھ نہیں آ رہی ہے ان بھڑ ووں کو؟"

ضامن بھائی نے نظریں بچا کر، برآمدے میں رکھے انگریزوں کے زمانے کے ایک بڑے گملے میں، جس کا پودا کبھی کا سوکھ گیا تھا، پیک کی پچکاری ماری اور آستین سے منہ صاف کر کے بولے۔

"ابے ٹھاٹھ سے رہ یہاں۔ میں نے بات کر لی ہے تھانیدار سے۔ اپنی دلی کا نکلا سالا۔ خیر چونکہ محکمہ ہی حرامیوں کا ہے تو خدمت تو کچھ کرنا پڑی بھینچو کی، مگر تجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ ضامن بھائی جو تھوڑی دیر کو غائب ہوئے تھے تو وہ کیا کرتے پھر رہے تھے۔

واپسی میں ہم شوکی کی بیٹھک میں کچھ دیر کو رکے تو ضامن بھائی بہت مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ شوکی تلخی سے بولا۔

"ایک سکھ اپنے آبائی وطن واپس آ گیا ہے تو سب سالوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اصل قصہ کیا ہے۔ سب کو پتہ ہے۔ اس چھوٹے سے گھر پہ وہ سالا مولوی دانت لگائے بیٹھا ہے اور اپنی حیثیت کا فائدہ اُٹھا رہا

ہے۔میں کہتاہوں کہ مذہب کانام اوروسیلہ ایسے کاموں میں استعمال ہوگاتو یہ تمہاراپاکستان کہاں جائے گا؟''

ضامن بھائی نے سگریٹ کے دوٹکڑے کئے اورایک مجھے دیتے ہوئے بولے۔

''ابے پاکستان سالے کی کیاغلطی ہے وِس کے اندر؟تم توپڑھے لکھے ہو۔زمین کی کبھی غلطی نہیں ہوتی۔وِس کے اندر رہنے والے اگر حرامی پنا کریں گے تو وِس جگہ ویسے ہی فساد پھیلے گا جیسے وِس وخت وِس پاکستان کے اندر مولوی شاکر اللہ پھیلا ریا ہے۔میں کہتا ہوں سالے کو وِہی مکان سے کیوں محبت ہو گئی ہے؟ابے اپنے رشتے دار سالے کواور کوئی مکان کیوں نہیں دلوادیتا؟اِتے سارے سالے گھر خالی ڈھنڈار پڑے وے ہیں وِس شہر کے اندر؟''

بات درست تھی لیکن مولوی صاحب کووہی مکان چاہئے تھاتو کیاہوسکتاتھا؟شوکی مسکراکر بولا۔

''ضامن بھائی۔جانتے ہو دنیامیں انسانوں کو کن دو چیزوں نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے؟مذہب اورسیاست نے۔''

ضامن بھائی کانوں کوہاتھ لگا کر بولا۔

''بس تمہاری وِہی بات سے میرے مرچیں لگ جاتی ہیں۔ابے مذہب کو کیوں گھسیٹ کے بیچ میں لے آتے ہو؟بھیاہم مسلمان ہیں اور ہمارے باپ دادامسلمان تھےتو ہم مذہب کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

سگریٹ کے دوچارآخری کش لگائے اوراُسے گلی میں پھینک کر بولے۔

''ایک تو اللہ میاں ہر بات سن لیتے ہیں تو میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔مگر بھیااللہ میاں سے بہت سی معافی مانگ کے کہتاہوں کہ بات تمہاری دل کولگتی ہے۔''

پھر زبان باہر نکالی،دونوں کانوں کوباری باری چھوا،دونوں ہاتھ جوڑے،اُوپر کی طرف دیکھااور بولے۔

''مالک تُو گواہ رہیو۔میں نے خود سے نہیں سوچی یہ بات۔وِس سالے شوکی نے سجھادی تو میں نے بھی کردی۔میری توبہ۔میری توبہ۔''

اُن کاانداز ایساتھا کہ میں اورشوکی بے اختیار ہنسنے لگے۔ہمیں گھورکر دیکھااور تلخی سے بولے۔

''سالو۔دوسرے کوگناہ گار بھی کرتے ہواورٹھی ٹھی کر کے ہنستے بھی ہو؟خوب بھنوگے دوزخ میں۔''

چندلمحوں تک سوچااور بولے۔

''سیاست والی بات خوب کہی تم نے۔سب سیاست کا کمال ہے کہ ہندوستان آزاد ہواتو سالا آگ اورخون میں نہا گیا۔ان سالے ہندوستانیوں نے خوب خوب ایک دوسرے کی عزتیں لوٹیں،جانیں لیں اور جائیدادوں پہ قبضے کئے۔کل کو یہی سب بگلا بھگت بن کے بیٹھ جائیں گے اور دنیا کوانسانیت کا سبق

پڑھائیں گے۔یہاں والے بھی اوروہاں والے بھی۔ہت تیری......''

سن سینتالیس سے پہلے کا برصغیری بندوبست انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔۱۹۱۹ء تک ہندوستانی بیوروکریسی میں نوے فیصد انگریز تھے۔یہ تو پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد ہواتھا کہ ہندوستانی بھی اس میں کثیر تعداد میں شامل ہونے لگے تھے لیکن ان میں آئی سی ایس کی دوقسمیں تھیں۔ایک وہ جنہوں نے مقابلے کا امتحان پاس کیاہوتاتھااور برطانیہ جاکر سال دوسال کی تربیت حاصل کی ہوتی تھی اوردوسرے وہ جنہیں ''کوٹے'' کی بنیاد پر بھرتی کیاجاتاتھااوراکثروبیشتر یہ حضرات گنگاجمنی تہذیب کے پروردہ ہوا کرتے تھےاور بیوروکریسی کے لئے پرابلم آفیسرز ثابت ہوتے تھے۔برسوں گزرنے کے باوجودان کی ترقیاں نہیں ہوتی تھیں اورانہیں ایک سے دوسرے محکمے میں تبدیل کیاجاتاتھا۔ان میں سے اکثریت توازن،،برقراررکھنے کی بناپرمسلمان ہوتے تھے اوران میں انتظامی یا قابلیت کاوہ جوہرنہیں ہوا کرتا تھاجس کے بل پرانگریز برصغیر پرحکومت کرتا تھا۔چونکہ پاکستان بننے کی صورت میں ان حضرات کوایک نئے ملک میں مسلمان اورآئی سی ایس ہونے کی بناپراپنے لئے ماحول زیادہ پرکشش دکھائی دیتاتھاتو پاکستان بنتے ہی ان نالائقوں کی اکثریت نے پاکستان کے لئے آپٹ کرلیا اورجلد ہی اہم عہدوں پرفائز ہوگئے۔ہندوستان کے حصے میں جوہندوبیوروکریسی آئی،اُسے ہندوستان میں وہی عزت اورمرتبہ دیا گیاجو برٹش راج میں ملاکرتاتھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے ہندوستان کواپنا آزادوطن سمجھ کراس کی خدمت زیادہ تندہی سے کی اور ہندوستان کوانتظامی اُمور کے حوالے سے بے ایمانی اور کرپشن کے اُس طوفان کاکم مقابلہ کرناپڑاجس سے پاکستان گزرااورگزرر ہاہے۔پاکستان میں نوکرشاہی کی تاریخ پرنظر رکھنے والے بخوبی اس امر سےواقف ہوں گے کہ پاکستان میں کلی اختیارات ایک ایسےصاحب کے ہاتھ میں چلے گئے جونہ صرف مشرقی پاکستان کے چیف سیکریٹری مقرر ہوئے بلکہ ایوب خان سے ذاتی دوستی کی بناپرایک ایسا ادارہ بنانے میں کامیاب بھی ہوئے جس نے ''سکریننگ'' کے نام پر،انگریزوں کی تربیت یافتہ بیوروکریسی کے جوہر قابل کونکال باہر کیااوراُس انتظامی خلا کے بارے میں ایک پل کوبھی نہیں سوچا جسے نااہل اوراقرباپرور افسران سے پُرکیا گیا۔شروع کے پانچ سال مشرقی پاکستان ایک نااہل اورنالائق بیوروکریٹ کے ہاتھ میں رہا اوروہیں سےوہ تخم اُس زمین میں بویا گیاجس نے آخرکاراُسے بنگلہ دیش بنادیا۔پاکستان کےانتظامی ڈھانچے میں جوکجی ان حرکتوں کی وجہ سے پیداہوئی تھی،وہ آج تک بدستور چلی آتی ہےاوراسی کجی نے اس ملک کی جغرافیائی بنیادیں تک ہلارکھی ہیں۔

اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ضامن بھائی اور میں راج سنگھ اورحنیف پہلوان کوکھانا پہنچانے تھانے گئے۔ضامن بھائی تھانیدارکو پہلے ہی دن خوش کر چکے تھے۔جب ہم تھانے پہنچےتو تھانیدارنہیں تھا

لیکن محررکوشاید ہمارے بارے میں ہدایات مل چکی تھیں تو اُس نے نہ صرف ہمیں راج سنگھ اورحنیف پہلوان سےفوراًملوادیا بلکہ ہم سے چائے کوبھی پوچھا۔ضامن بھائی نے منع کردیااور جب ہم ملاقات کے بعد تھانے کی عمارت سے باہر نکلےتو اُنہوں نے میراہاتھ پکڑکر مجھے روکااورراز دارانہ انداز میں بولے۔

''بھلامیں نے وِس پولیس والے کی چائے کوکیوں منع کرا؟''

میرے پاس سادہ ساجواب تھاسومیں نے دیا۔

''تم ابھی گھرسے ناشتہ کرکےآئے ہواور بھلا کیوں؟''

چندلمحوں تک مجھے دیکھااورافسوس کرنے والے انداز میں سرنفی میں ہلاتے رہےاور بولے۔

''کِتے سال ہوگئے ہماری تمہاری دوستی کومگر تم نے کچھ سیکھ کے نہیں دیا۔میاں پولیس والوں کی کمائی میں حرام پڑاہوتا ہےاورحرام کاایک لقمہ جس کے بدن میں چلا جائے وِس سالے پہ جنت حرام ہوجاتی ہے۔''

اپنی بات مکمل کرکے مجھے فخر سے دیکھااور بولے۔

''سئی کہہ ریاہوں نا؟''

میراجی چاہاضامن بھائی کامنہ چوم لوں۔کس قدرسادہ اورمعصوم آدمی تھے وہ۔ہم سڑک پرنرم قدموں سے چلنے لگے۔میں نے کہا۔

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں مگر پاکستان میں اس وقت جو ہورہا ہے،اُس کودیکھیں تو یہاں کا شایدکوئی آدمی ہی جنت کی خوشبوبھی پاسکے گا۔''

میری بات پر پھڑک گئے اور مجھے بیچ سڑک میں روک کر گلے لگایا۔اتوار کی وجہ سے سڑک سنسان تھی۔ایک گندے نالے کی پُلیاپر بیٹھے اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کرایک سگریٹ کے دو ٹکڑے کئےاورایک مجھے دیتے ہوئے بولے۔

''دل خوش کردیاتم نے وِس وخت۔بالکل یہی بات ہے۔لوسگریٹ دھونکواور سنو وِسے اپنی عادت مت بنائیو،بڑی منحوس چیز ہے۔''

جب ہم دونوں سگریٹ کےٹکڑے سلگا چکےتو کہا۔

''یاراچھا ہواجناح صاب اورلیاقت علی جلدی مرگئے ورنہ اپنی قوم کاحال کے دیکھ صدمے کے مارے ہی اُوپرکوٹہل لیتے۔ابے حد ہے بھائی۔وِس پاکستان میں تو ایسے لگ ریا جیسے لوگ لالچ اورحرص کے مارے پاگل ہوگئے ہوں۔رشوت اور''شفارش'' کاوہ بازارگرم ہے کہ اب تو حیرت بھی نہیں ہوتی۔ابے وہ سلطان ٹھیکیدار نہیں ہے؟وِس کے بیٹے نے ایک پُل کاٹھیکہ لیا تھا۔وہ پُل بنااور پہلی بارش میں ہی گرگیا۔وِس

پہ مقدمہ بھی بنااوروہ چھوٹ بھی گیااوراب وِہی کودوبارہ وِہی پُل کی تعمیر کاٹھیکہ مل گیا۔میں کہتاہوں کہ کیاہوریا ہے وِس مملکت خداداد کے اندر؟''

اُنہوں نے اپنی بات کاآخری حصہ مجھے گھورکر دیکھتے ہوئے یوں مکمل کیاجیسے میں پاکستان میں ہونے والی ہر بددیانتی کاذمہ دارتھا۔پھر بولے۔

''تمہیں پتہ ہے بجی گڈیوں والاوِس گلی میں مہاجروں کی آبادکاری کا کِتنا بڑا مخالف ہے؟ہمیں کبھی بھیے کہتاہے،کبھی ہندوستوڑے۔بزدل سمجھتاہے۔وِس دن گلی میں جو پاگل کتا آگیا تھا،ابے وہی جس نے چنن دین ٹھیلے والے کی لونڈیا کوکاٹ لیا تھا۔میں نے وِسے مارنے کی کوشش کی تو بولا۔بھیاتم ہٹ جاؤ۔یہ ہندوستوڑوں کے بس کی بات نہیں۔میں پوچھ ریاہوں وہ سالے مسلم لیگی مسلمانوں سے اتنا جھوٹ کیوں بولتے تھے کہ پاکستان بن جائے گاتو یوں ہوجائے گا۔ووں ہوجائے گا۔ابے کچھ بھی نہیں ہوااورنہ وہی ہوگا۔پاکستان بننے سےلوگوں کی ذہنیت تھوڑی بدل گئی۔''

اُن کی باتیں تلخ مگر سچ تھیں۔ہم چونکہ پنجابی بولتے تھےتو ہمیں کم نفرت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ضامن بھائی اردو بولنے کی وجہ سے زیادہ تکلیف سے گزررہے تھے۔یہ کہنازیادتی ہوگی کہ سبھی مقامی لوگوں کارویہ ایساتھا،لیکن اگرایک کابھی تو یہ قابل قبول یوں نہیں تھا کہ اس ملک کواسلام کانعرہ لگا کر بنایا گیا تھا۔پھر کہنے لگے۔

''میں قسم کھاریاہوں کہ راج سنگھ صرف وِس لئے مشکل میں پھنس گیاہے کہ بیچ میں اُس کے گھر کا چکرآگیا ہے۔وہ مولوی وہ گھرلینا چاہتا ہے۔اگر یہ سالا ہندوستان سے واپس آکے کان لپیٹ کے یہاں رہنےلگتاتو کوئی دوسری دفعہ وِس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔سچ کہہ ریاہوں نامیں؟''

وہ سچ کہہ رہے تھے۔

حنیفے پہلوان کی ضمانت اگلے دن ہوگئی۔جج نے راج سنگھ کوجیل بھجوادیااوراگلی سماعت کے لئے تاریخ دے دی۔

حنیفے پہلوان پرکوئی خاص بڑاالزام بھی نہیں تھا۔وہ راج سنگھ کادوست تھااوراُس کی حمایت کررہا تھااوراس حمایت کے سلسلے میں اُس کی طرف سےنقص امن کاخطرہ تھا۔مولوی شاکراللہ اوراُن کی پارٹی نے ایک نیاشوشہ چھوڑاجس کاعلم مجھےجانی نائی کی زبانی ہوا۔

جانی نائی اُس وقت میرے چہرے پرصابن پھیلارہاتھا۔میں گدلے آئینے میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتاتھاجومجھ سے کہہ رہے تھے کہ وہ کچھ کہنے کوبے چین تھا۔جب وہ چھوٹے پراپنا اُسترا تیز

کرر ہاتھا تو میں نے یونہی کہا۔

''جانی۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔ ہے نا یہی بات؟''

جانی کے چہرے پر یک بیک ایسا سکون جاگا جیسے میرے اس ایک فقرے نے اُسے کسی بڑی اذیت سے نجات دلا دی ہو۔اُس نے بات کرنے میں وقت لیا۔وہ اس دوران شاید یہ فیصلہ کرر ہاتھا کہ اُسے یہ بات میرے سامنے کہنا بھی چاہئے یا نہیں۔پھر مسکرا کر بولا۔

''باؤ۔بات یہ ہے کہ میں بدنام آدمی ہوں کہ ادھر کی بات اُدھر لگاتا ہوں اور پھر تم اور ضامن بھائی راج سنگھ کے یار بھی ہو تو میں کچھ کہتے ہوئے ڈرتا بھی ہوں۔''

مجھے جانی کا اعتبار تو نہیں تھا لیکن راج سنگھ اور ضامن بھائی کا تذکرہ سن کر مجھے یہ جاننے کی خواہش ہوئی کہ وہ آخر کیا کہنا چاہتا تھا۔

''ایسی بھی کیا بات ہے یار؟ میں کسی سے کہوں گا تھوڑی۔تم کھل کر بات کرو۔''

جانی اُس وقت میرے نرخرے کے قریب اُسترا چلا رہا تھا۔اُس نے اس کام سے فارغ ہو کر اُسترا صاف کیا،رکھا اور میرے چہرے پر تبت سنو ملتے ہوئے بولا۔

''باؤ۔یہ بات سو فیصد ٹھیک ہے مگر حنیفے پہلوان تک نہ پہنچے ورنہ وہ میری گردن کا منکا ایک منٹ میں توڑ دے گا۔''

اب مجھے یہ بات سننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔میں نے کہا۔

''اب اگر تم نے یہ بات مجھے نہ بتائی تو میں تمہاری گردن کا منکا توڑ دوں گا۔ بات ہے کیا آخر؟۔''

اس پر جانی نے دروازے پر جا کر دائیں بائیں دیکھا اور جب یقین ہو گیا کہ گلی سنسان پڑی تھی تو میرے قریب آ کر میرے شانوں سے تولیہ اُتارتے ہوئے بولا۔

''وہ حنیفا پہلوان چھوٹ کے آ گیا ہے تھانے سے۔تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ راج سنگھ اندر ہے اور اُس کی بیوی اور بیٹی حنیفے کے گھر میں رہتی ہیں۔تاری بدمعاش مجھے بتا رہا تھا کہ حنیفے نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر راج سنگھ کی بیوی سے اپنے معاملات ٹھیک کر لئے ہیں۔اگر ایسا ہے تو پھر حنیفے پہلوان پر نالت ہے۔''

مجھے معاملات والی بات سمجھنے میں قدرے دیر لگی مگر میں سمجھ گیا۔مجھے یہ بات سن کر بہت غصہ آیا اور میں نے کھڑے ہو کر قمیص سے بال جھاڑتے ہوئے کہا۔

''یہ بکواس کس نے کی ہے؟ تاری نے؟''

جانی نائی غالباً یہ بات کہنے کے بعد اب پچھتا رہا تھا تو وہ بولا۔

''میں نے فقیرے تانگے والے سے سنی ہے۔اُس نے حمیدے قلفیوں والے سے سنی تھی اور......''

اس کا مطلب تھا کہ بات محلے بھر میں مشہور ہو چکی تھی۔راج سنگھ،حنیفے پہلوان کا یار تھا۔یہ دوستی ان کے بچپن سے چلی آ رہی تھی۔وہ راج سنگھ کی شادی کے موقع پر باراتیوں میں بھی شامل تھا۔اُس نے راج سنگھ کو اُس وقت اپنے گھر میں پناہ دی تھی جب سلطان ٹھیکیدار کی سرکردگی میں ہر کوئی اُسے واپس ہندوستان چلے جانے کا مشورہ دیتے ہوئے دھمکا بھی رہا تھا۔یہی نہیں وہ اُس کے گھر کے مقدمے کے سلسلے میں عدالتوں اور وکیلوں کے دفتروں میں مارا مارا ابھی پھر رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ابھی حال میں ہی راج سنگھ کی وجہ سے تھانے میں چند دن بھی گزار آیا تھا۔ایسے آدمی کے بارے میں یہ بات کرنا انتہائی غلیظ اور چھوٹی حرکت تھی۔میں نے یہ بات ضامن بھائی کے گوش گزار کی تو وہ بولے۔

''میں نے سنی ہے یہ بات اور وِس کے پیچھے یہی پالٹی ہے۔مولوی شاکر اللہ والی۔جھوٹا الزام لگانے والے کی قبر میں کیڑے پڑتے ہیں اور وِس سالے کو کھا کھا کے مٹی کر دیتے ہیں اور اللہ میاں کے گھر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ بات کس نے کری ہے؟''

اللہ میاں والی بات ٹھیک تھی لیکن یہ الزام بہت بڑا تھا۔اگر اتنے سارے مردوں کو اس کا علم تھا تو پھر محلے کی عورتوں کو تو ضرور ہی ہو گا اور اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ بات گلی محلے سے نکل کر شہر بھر میں پھیل سکتی تھی۔راج سنگھ شریف اور باعزت آدمی تھا۔اُسے اس محلے اور شہر کے لوگ مدتوں سے جانتے تھے۔وہ اس وقت جیل میں تھا اور ہمیں پوری اُمید تھی کہ وہ نہ صرف جیل سے رہا ہو جائے گا بلکہ اپنا مقدمہ بھی جیت جائے گا۔اگر ایسا ہو بھی جاتا تو اُس کی بیوی اور حنیفے پہلوان کے تعلق سے جو کہانیاں لوگ مشہور کر رہے تھے،وہ اُس تک ضرور پہنچتیں اور وہ کس منہ سے شہر بھر کا سامنا کرتا۔

میں اس سلسلے میں بہت پریشان تھا۔یہ باتیں یقیناً حنیفے پہلوان نے بھی سنی ہوں گی اور راج سنگھ کی بیوی نے بھی۔اُس کی بیٹی پر تو بھی جوان تھی اور یہ جاننے کے بعد اُس کا ردعمل جانے کیا ہوا ہو گا۔صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔(جاری)

◄◄ ● ►►

C/O,Dr.Rehana Eqbal
Hazra Road,Hasan Abdal,
Dist: Attak(Pakistan)

''ثالث'' پر تبصرہ

● ڈاکٹر منصور خوشتر

''ثالث'' شمارہ نمبر ۱۳

پٹنہ سے واپسی میں جب دفتر گیا تو میز پر ''ثالث'' شمارہ نمبر ۱۳ کو اپنا منتظر پایا۔فیس بک کے ذریعہ یوں تو پتہ تھا کہ ثالث کے اس شمارے میں کون کون سی چیزیں شائع کی گئی ہیں لیکن شمارہ کی ورق گردانی کرتے کرتے آپ کی محنت،آپ کے جذبے اور آپ کی کوششوں کو سلام کئے بغیر نہیں رہ سکا۔آپ نے ثالث کو اپنی محنت سے وہاں وہاں پہنچا دیا ہے جہاں جہاں اردو بولی،پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ کی محبت اور شفقت مجھے ہمیشہ سے ملتی رہی ہے۔آپ نے شمارہ میں سب سے پہلے 'مجھے کچھ کہنا ہے' کے تعلق سے بہت ہی جامع اور پُر مغز گفتگو کی ہے۔اردو کا رسالہ نکالیں اور دشواریاں نہ ہوں یہ کہاں ممکن ہے۔اردو کا کام،اپنوں کی نکتہ چینی اور پھر اس کی ترقی،آپ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔پھر بھی یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ خوبصورت جاندار رسالہ بہار سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جو قارئین کے لئے باعث مسرت ہے۔الحمدللہ ثالث اپنی عمر کے چھٹے سال میں قدم رکھ چکا ہے۔یہ محبان اردو کے لئے فخر کی بات ہے کہ اس کے ویب سائٹ کو وزٹ کرنے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے زائد ہو گئی ہے۔آپ کے اندر یہ خاص خوبی ہے کہ نئی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو واجب جگہ دیتے ہیں۔آپ کی کوشش کو یقیناً اردو دنیا ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔اس شمارہ میں آپ نے میرے بڑے ہی محترم معروف افسانہ نگار شموئل احمد پر جامع گوشہ شامل کیا ہے۔شموئل احمد واقعی زندہ دل انسان ہیں۔ان کے افسانوں نے ہمیشہ متاثر کیا اور کبھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔سوانحی کوائف میں آپ نے ان کی زندگی نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ڈاکٹر سرور حسین نے شموئل احمد سے انٹرویو میں ان تمام پہلوؤں پر خصوصی روشنی ڈالی ہے جس کے لئے شموئل جانے پہچانے جاتے ہیں۔

رسالہ میں دو افسانے ''ریپ سنسکرتی اور قطعہ تہنیت'' شامل ہیں۔غزلوں کے باب میں سلطان اختر،خالد عبادی،ذوالفقار نقوی،ماجد جہانگیر مرزا،عرفان وحید،نوشاد احمد کریمی،اصغر شمیم،مصداق اعظمی کی

غزلیں اور دو نظمیں سرجیکل ماسک (صبا اکرام) اور نفی اندر نفی (کے۔بی۔فراق) متاثر کرتی ہیں۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن فیصل،ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر شہناز یوسف کے مضامین توجہ طلب ہیں۔کچھ کتابوں پر شامل کئے گئے تبصرے بھی اچھے ہیں۔مکتوبات کے ضمن میں چند اہم دانشوروں کے خطوط شامل اشاعت ہیں۔میں آپ کو اس شمارے کی اشاعت پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کروں گا کہ آپ حوصلہ نہیں ہاریں گے اور یونہی عزم و شجاعت کے ساتھ رسالے کی اشاعت کو جاری رکھیں گے۔

◄◄ ● ►►

تبصرے

نام مجلّہ: عالمی اردو ادب (مشتاق احمد یوسفی نمبر)

مدیر: نند کشور وکرم

شمارہ نمبر: 46/اشاعت: دسمبر 2018/صفحات: 400/قیمت: 400 روپے

مبصر: اقبال حسن آزاد

مشتاق احمد یوسفی اردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ان پیدائش 4/ستمبر 1923ء کو ٹونک (انڈیا) میں ہوئی اور انتقال 20/جون 2018ء کو کراچی (پاکستان) میں ہوا۔مرحوم کا ادبی سفر 1955ء میں شروع ہوا۔ چراغ تلے،خاکم بدہن،زرگشت،آب گم اور شام شہر یاراں ان کی تصانیف ہیں۔شام شہر یاراں کو چھوڑ کر ان کی بقیہ کتابیں ہندی میں بھی شائع ہوئی ہیں۔انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز اور اعزاز نشان امتیاز سے نوازا گیا۔ان کے علاوہ آدم جی ایوارڈ،کمال فن ایوارڈ،بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ اور ہلال امتیاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔

جناب نند کشور وکرم ایک سچے خادم اردو تھے جو گزشتہ کئی برسوں سے ''عالمی اردو ادب'' کے نام سے ایک ادبی مجلّہ شائع کرتے آ رہے تھے۔اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔اس مجلّے کا ہر شمارہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔زیر نظر شمارہ مشتاق احمد یوسفی نمبر ہے جس میں پیش لفظ کے علاوہ ''سوانحی کوائف''،''رو برو (انٹرویو)''،''تحریریں (مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات)''،''نقد و نظر''،''تبصرہ و تجزیہ''،''شخصی تجزیے'' اور ''اختتامیہ'' کے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔اس شمارے کے قلم کاروں میں طارق حبیب،آصف فرخی،رحمان فارس،شکیل الرحمٰن،عبدالرشید،احسن فاروقی،اشفاق ورک،انوار احمد،ایس۔ایم۔معین

قریشی، پرویز ید اللہ مہدی، رشید امجد، رضا علی عابدی، رؤف پاریکھ، زاہدہ حنا، سحر انصاری، سید ضمیر جعفری، سید عبدالکریم رضوان، شان الحق حقی، شاہ محمد مری، عنایت علی خاں، غزالہ انجم، فاطمہ حسن، قمر الزماں یوسف زئی، مہیب مرزا، مجتبیٰ حسین، محمد اشرف کمال، محمد تقی، محمد یار گوندل، محمود احمد قاضی، معصوم مرادآبادی، جمیل جالبی، رضیہ فصیح احمد، محمد خالد اختر، محمد علی صدیقی اور عمران عاکف خاں شامل ہیں۔

چارسو صفحات پر مشتمل اس شمارے کی قیمت چارسو روپے ہے اور اس کی افادیت کے پیش نظر یہ نہایت مناسب اور موزوں ہے۔

«•»

نام کتاب: مطالعے کا سفر
صنف: تنقید
مصنف: سلیم انصاری
صفحات: 214/ قیمت: 137 روپے/ سن اشاعت: 2019
مصنف کا پتہ: ایچ، آئی، جی 3 آنند نگر، آدھارتال، جبل پور، ایم پی-482004
رابطہ: 07070135643/07354308999
مبصر: اقبال حسن آزاد

کہتے ہیں کہ ہر تخلیق کار کے اندر ایک ناقد بھی چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ سلیم انصاری بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں لیکن انہوں نے تنقید کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''میری کتاب مطالعے کا سفر میرے ان مضامین کا انتخاب ہے جو وقتاً فوقتاً تحریر کیے گئے ہیں اور رسائل و جرائد میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کئی مضامین اب تک رسائل و جرائد میں اشاعت سے محروم ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین میں نے اپنے ہم عصر تخلیق کاروں کی نگارشات پر تحریر کیے ہیں جو میرے ترجیحی مطالعے کا نتیجہ ہیں اور مجھے یہ خوشی بھی ہے کہ یہ مضامین نہ تو ضرورتاً لکھے گئے ہیں اور نہ ہی کسی فرمائش اور سفارش پر بلکہ اپنے ذہن و ضمیر کی روشنی میں کسی بھی ذہنی تحفظ کے بغیر لکھے گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کتاب میں شامل میرے مضامین مروجہ تنقیدی اصول و ضوابط کی کسوٹی پر کس قدر کھرے اُترتے ہیں مگر یہ اطمینان ضرور ہے کہ میں نے ان مضامین میں کتابوں کے حقیقی مطالعے کے بعد ہی اپنے تاثرات اور ردعمل کا اظہار کیا ہے۔

اس کتاب میں کل ستائیس مضامین شامل ہیں۔ 1۔ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر، 2۔ غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش، 3۔ ستیہ پال آنند کا تخلیقی شعور اور عالمی عصری آگہی، 4۔ مابعد جدید نظم......ایک نا تمام جائزہ، 5۔ ۱۹۸۰ء کے بعد شاعری کے تخلیقی خد و خال، 6۔ خاک خمیر کی تخلیقی کائنات، 7۔ شموئل احمد کے ناول گرداب پر ایک نظر، 8۔ مانک موتی کی تخلیقی اساس، 9۔ لے سانس بھی آہستہ......ایک مطالعہ، 10۔ وحشی سعید کے افسانوں میں زندگی کی تلاش، 11۔ حیدر قریشی کے افسانوں کی حقیقت، 12۔ دکن کی پیش رو غزلیں......ایک مطالعہ، 13۔ مے خانۂ اردو کا پیر مغاں......ایک جائزہ، 14۔ غضنفر کی شاعری سے ایک مکالمہ، 15۔ خالد جمال کی شاعری کا فکری اور تخلیقی نظام، 16۔ زندگی سے مکالمہ کرنے والا شاعر......خوشبیر سنگھ شاد، 17۔ ایک آنسو کہ جو آنکھوں کو منور کر دے، 18۔ کبیر اجمل......خوشگوار حیرتوں کا شاعر، 19۔ نذیر فتح پوری کی نظم......ایک جائزہ، 20۔ استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے، 21۔ اگلے پڑاؤ سے پہلے......ایک خوشگوار تخلیقی تجربہ، 22۔ ظفر گورکھپوری کی غزل......نئے تخلیقی تناظر میں، 22۔ عطا عابدی......زخم، زندگی اور خواب کا شاعر، 24۔ موجِ خیال کا فکری اور تخلیقی نظام، 25۔ نئی تنقیدی جہات......ایک جائزہ، 26۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ پر ایک نظر، 27۔ کوئی صورت تو خرابے میں نمو کی نکلے۔

درج بالا عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ سلیم انصاری کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہوں نے ادب کی مختلف اصناف کے قلم کاروں کو اپنے احاطۂ تحریر میں جگہ دی ہے۔ افسانہ، ناول، غزل اور نظم کے علاوہ مکتوب نگاری (استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے از ڈاکٹر مختار شمیم) پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ گو کہ سلیم انصاری کا زیادہ زور ہمعصروں کی تخلیقات پر ہے لیکن انہوں نے اساتذہ پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور نہ صرف قلم اُٹھایا ہے بلکہ قلم کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔ غالب اور اقبال پر تحریر کردہ مضامین خاصے کی چیز ہیں۔

اُمید کہ جناب سلیم انصاری کا مطالعے کا سفر جاری رہے گا اور وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی نگارشات سے اردو ادب کا دامن مالا مال کرتے رہیں گے۔

«•»

نام رسالہ: ندائے گل
شمارہ نمبر: 2/ جلد نمبر: 6/ ستمبر 2018/ سالنامہ: 2018-2019
چیف ایڈیٹر: قاری ساجد نعیم

مدیر اعزازی: سید تحسین گیلانی، محمد جاوید انور/ معاون مدیر: شہزاد شاکر
پتہ: A-38 خلیج ٹاور، جیل روڈ، لاہور (پاکستان)
رابطہ: 0322-4105048/ 042-37586573
صفحات: 516/ قیمت: /600 روپے
مبصر: اقبال حسن آزاد

فی زمانہ اردو کا رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ لیکن چند سر پھرے آج بھی اس مشکل کام میں جی جان سے لگے ہوئے ہیں اور اپنا تن، من اور دھن اردو کی راہ میں لٹاتے رہتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے جاں نثاروں کی ہم اردو والے ذرا بھی قدر نہیں کرتے جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان سرفروشوں کو آنکھوں کا سرمہ بنایا جاتا اور دل میں بسایا جاتا۔

جہازی سائز میں شایع شدہ ''ندائے گل'' کا زیر نظر شمارہ پانچ سو سولہ صفحات پر محیط ہے جس کی ابتدا میں حمد (فاخرہ گل، شہزاد شاکر طور)، نعت (حسن عسکری کاظمی، سید لیاقت حسین گیلانی) اور سلام (توقیر تقی، شہزاد شاکر طور) پیش کیے گئے ہیں۔ گو کہ اردو فکشن اس شمارے پر غالب ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ شاعری، تنقید، انٹرویو بھی اس میں شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دو مختصر گوشے ''حصۂ پنجابی'' اور ''حصۂ طنز و مزاح'' کے عنوانات سے بھی دیے گئے ہیں۔

افسانوی حصے میں ہند و پاک کے قلمکاروں کے علاوہ تارکین وطن ادیبوں کی نگارشات بھی اس رسالے کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، مشتاق احمد نوری، اقبال حسن آزاد، محمد حامد سراج، اسلم جمشید پوری، ریاض توحیدی، امین صدر الدین بھایانی، افشاں ملک، نگار عظیم، احسان قاسمی، شاہد جمیل احمد، زین الحق، ڈاکٹر شاہد جمیل، راجہ یوسف، طارق شبنم، معظم شاہ، محمد جمیل اختر، فارس مغل، اسماء حسن، سلمیٰ صنم، فرحین جمال، ہما فلک، شفقت محمود، سارہ احمد، فوزیہ قریشی، فاطمہ عمران، صبا ممتاز بانو، قاسم کیانی، شہریار قاضی اور سیدہ آیت گیلانی کے افسانے خوب ہیں۔ افسانوں کے علاوہ مائکرو فکشن اور فلیش فکشن کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ محمود ظفر اقبال ہاشمی، شفقت محمود، سلمیٰ جیلانی، رضیہ کاظمی، ہما فلک، محمد شاہد محمود، فارس مغل، سیدہ آیت گیلانی، سید تحسین گیلانی کے مائکرو فکشن اور عاکف محمود، امجد جاوید، شاہد جمیل احمد، ریاض توحیدی، طلعت زہرا، فارس مغل، نور العین ساحرہ، بختیار خاں خویشگی، نصرت اعوان اور سید تحسین گیلانی کے فلیش فکشن دعوت فکر و نظر دیتے ہیں۔

فکشن کے علاوہ زیر نظر شمارے میں شعری تخلیقات بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں

چند غزلیں اور نظمیں واقعی قابل مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر شفیق آصف، عزیز اللہ عابد، افتخار حید، لیاقت علی عاصم، سلیم انصاری، مبشر سعید، شمسہ نجم، یوسف عزیز زاہد، اصغر شمیم، عاصم تنہا، فوزیہ اختر ردا، رخشاں ہاشمی کی غزلیں اور چند ایک نظمیں دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ اس شمارے میں شامل تنقیدی مضامین کی حیثیت ثانوی ہے۔ چودھری محمد بشیر شاد کا انٹرویو (قاری ساجد نعیم)، گوشۂ غلام حسین ساجد، گوشۂ اقتدار جاوید، گوشۂ جمیل احمد عدیل اور گوشۂ محمد جاوید انور اس شمارے کی معنویت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

بندہ چونکہ پنجابی زبان سے نا آشنا ہے لہٰذا اس حصے سے بالا بالا ہی گذر گیا۔ حصۂ طنز و مزاح کو میں نے بونس کے طور پر دیکھا۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ نثری اور شعری تخلیقات کو حصۂ اول، حصۂ دوم اور حصۂ سوم میں کیوں تقسیم کیا گیا ہے۔ خیر جو بھی ہو یہ ایک قابل قدر شمارہ ہے اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

«•»

نام کتاب: روح دیکھی ہے کبھی؟
صنف: افسانہ
مصنفہ: ہما فلک
قیمت: 500/ روپے/ صفحات: 192/ اشاعت: 2018
ناشر: انہماک انٹرنیشنل پبلیکیشنز، ۶/ غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور (پاکستان)
مبصر: اقبال حسن آزاد

ہما فلک کا تعلق پاکستان سے ہے اور وہ فی الحال جرمنی میں مقیم ہیں۔ سوشل میڈیا کے وجود میں آنے کے بعد افسانہ نگاروں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے آئی ہے۔ یہ وہ قلمکار ہیں جنہیں اردو جرائد و رسائل میں بوجوہ جگہ نہیں مل پائی یا انہیں بہت ہی کم موقع دیا گیا۔ فیس بک اور دیگر ذرائع ابلاغ نے ان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا اور انہیں ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ سیدہ آیت (سیدہ راحیلہ شیرازی، مدیرہ انہماک انٹرنیشنل فورم و جریدہ) اپنے تعارفی مضمون ''فلک نامے اور فلکسانے'' میں یوں رقم طراز ہیں: ''ہما فلک اردو ادب اور آن لائن ادبی فورمز کی ایک معتبر ہستی ہیں۔''

ہما فلک بھی انہی فنکاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی ادبی عمر بہت زیادہ نہیں ہے لیکن انہوں نے اردو ادب کو کئی عمدہ افسانے دیے ہیں۔ ''روح دیکھی ہے کبھی؟'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس

میں سترہ افسانے شامل ہیں :ہلدی والی،وقت سے پرے،ببول،اگر،دی ونش نفے،سچا،ایوارڈ،حسرت، تلاش،وفادار،وہ لمس،دلداری، ایک ادھوری کہانی،زنجیریں،خزاں موسم کے گلاب،کاسہ باز، آخری پیغام۔لیکن ''روح دیکھی ہے کبھی ؟'' کے عنوان کا کوئی افسانہ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ مصنفہ کا تحریر کردہ حرف آغاز ہے۔وہ لکھتی ہیں کہ:

''روح دیکھی ہے کبھی؟'' یہ سوال میرے اندر ہمیشہ ایک ہلچل سی مچا دیتا ہے۔روح کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی خواہش مچل جاتی ہے۔سوچتی ہوں سوال پوچھنے والے نے یہ سوال جانے کس خیال سے کیا تھا۔شاید کسی سے پوچھا ہے کہ اس نے روح دیکھی ہو،اسے محسوس کیا ہو تو اسے بھی بتا دے یا شاید اس نے اپنی تلاش کو پالیا اور اب پوچھ رہا ہے،روح دیکھی ہے کبھی؟...... میں انہیں اپنے لفظوں میں ڈھونڈ رہی ہوں ۔ان لفظوں کو کہانیوں کا پیرہن دے کر...... میرے اندر کچھ کہانیاں ہیں اور کچھ کہانیوں کے اندر میں ہوں۔یہ کہانیاں میرے اندر سانس لیتی ہیں...... مجھے زندہ رکھتی ہیں...... مجھے خوشی دیتی ہیں......اداس کرتی ہیں...... مجھے تڑپاتی ہیں......اور سکون دیتی ہیں...... یہ میری روح ہیں۔میں ان کو لکھ کر دیکھتی ہوں اور چھو کر محسوس کرتی ہوں۔''

اس کے علاوہ گلزار ملک اور قاضی اعجاز محور کے مضامین اور حما فلک کے مختلف افسانوں پر ارشد عبد الحمید،ڈاکٹر ریاض توحیدی،ڈاکٹر اقبال حسن آزاد،میر وسیم عشرت معین سیما،وحید قمر اور سید تحسین گیلانی کے تبصرے بھی شامل ہیں۔

حما فلک کا بیانیہ سادہ مگر دل چسپ ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کا تانا بانا اپنی ارد گرد کی زندگی سے بُنا ہے۔ان کے کردار جیتے جاگتے اور متحرک ہیں۔مکالمے فطری ہیں۔چند افسانے خاص طور پر لائق توجہ ہیں مثلاً ''ہلدی والی''،وقت سے پرے'' ،''اگر''،''سچا'' اور ''خزاں موسم کے گلاب''

حما فلک کے یہاں امکانات کی ایک وسیع دنیا ہے۔ان کا ادبی سفر جاری و ساری ہے۔میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں وہ مزید تہہ دار اور معنی خیز افسانوں کی تخلیق کریں گی۔

« ● »

مکتوبات

☆ ثالث کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔طباعت اعلی اور پیشکش خوبصورت ہے۔شموئل احمد پر گوشہ اس شمارے کو مزید اہمیت عطا کرتا ہے۔ہر چند کہ شموئل صاحب کے فن اور شخصیت کا احاطہ چند صفحات کے اندر ناممکن سی بات ہے مگر یہاں جن مضامین کا انتخاب اقبال حسن صاحب نے کیا ہے ان میں شموئل صاحب کی افسانہ نگاری پر بہت عمدہ گفتگو ہوئی ہے جو موصوف کے فن کو سمجھنے میں ممد اور معاون ہے۔دیگر مشمولات بھی مدیر محترم کی بصیرت اور حسنِ انتخاب پر دال ہیں۔ (وسیم احمد فدا،ہاپوڑ)

آج کی ڈاک سے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ "ثالث" کا شمارہ ۱۳ موصول ہوا شکریہ۔یہ شمارہ اردو کے اہم فکشن نگار شموئل احمد کی شخصیت اور فن کے متعلق گوشے پر مشتمل ہے۔اس میں شامل مضامین کے مطالعے سے شموئل فہمی میں مدد ملے گی۔

(آفتاب احمد آفاقی،بنارس)

☆ کل کی ڈاک سے ثالث کا تازہ شمارہ نمبر ۱۳ موصول ہو کر باعث راحت دیدہ و دل ہوا۔آپ کی اس بے لوث محبت کے لئے صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔تمام مشمولات بخصوص گوشہ شموئل احمد بیک نظر پر کشش اور قابل مطالعہ ہیں۔لیکن حسب معمول آپ کا اداریہ بے حد توجہ طلب اور حاصلِ شمارہ ہے۔میں نے اداریہ بلا تاخیر من و عن پڑھا اور قلب و ذہن کو سیراب کیا۔آپ نے ایک انتہائی اہم گفتگو کا آغاز کیا ہے۔"مختصر افسانہ کیسے پڑھا جائے اور کس طرح اس کی مخصوص قرات سے افسانے کی تفہیم اور اس کے ذریعہ افسانے کی تنقید کو کارآمد بنایا جائے...... بہت ہی اہم سوال ہے جس سے مختلف ذیلی سوالات نکلتے ہیں۔ممکن ہوا تو اس گفتگو میں خود کو شامل کروں گا اور دیگر تحریروں کے حوالے سے بھی باتیں ہوں گی۔ایسے وقیع اداریے اور خوبصورت و خوب سیرت شمارے کے لئے مبارک باد اور شکریہ! (عین تابش،گیا)

☆ ثالث شمارہ نمبر ۱۳ موصول ہو چکا ہے اور پہلے دن سے ہی زیر مطالعہ ہے. "ثالث" جب بھی مطالعے میں آیا ہے چاہے وہ مطالعہ اس کی ظاہری سج دھج سے وابستہ ہو یا باطنی سج دھج سے ہمیشہ آپ کی بے لوث جان کاہی ظاہر رہی ہے. اس میں موجود مواد و موضوعات کی ترتیب و تنظیم و انتخاب, اس کا اداریہ اور ایک منظم ترکیب کے تحت اراکین کو ارسال کرنے کی عمل طرازی آپ کے خلوص پر دال ہے. اس بار ایک تجربہ کار مصنف محترم شموئل احمد کا خصوصی گوشہ بھی شامل مطالعہ ہے جس سے امید ہے کہ ذہن کے کئی دریچے

واہوں گے۔اور باقیات میں ہندو پاک کے دیگر معزز ومحترم مصنفوں کے مشمولات بھی اس طالب علم کے لئے بصیرت افروز ثابت ہوں گے۔اگر قلم نے ساتھ دیا تو پڑھ کر انشاالله تفصیلی رائے دینے کی لازم کوشش کروں گی۔امید ہے کہ "ثالث" کی دائمیت قائم رہے گی اور تواتر کے ساتھ اس طالب علم کو فیض یاب کرتی رہے گی۔ ممتحنہ اختر (جموں)

☆ برصغیر کے مشہور ومعروف افسانہ نگار اقبال حسن آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا "زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان" "ثالث" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔غزل کی اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔رسالے کی ترقی کے لئے دعائیں ہی دعائیں۔اگر رسالہ زندہ ہے تو ادب زندہ ہے۔شموئل احمد کے ساتھ ساتھ رسالے میں شامل تمام قلمکاروں کو دلی مبارک باد! اصغر شمیم (کولکاتا)

☆ اقبال حسن آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ثالث موصول ہوا۔شکریہ۔اس شمارہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نصف حصہ فکشن نگار شموئل احمد کے فکر وفن سے متعلق مختص ہے۔یہ اقدام کئی لحاظ سے لائق مستحسن اور قابل مبارکباد ہے۔اس وقت فکشن کی تنقید کی صورت حال یہ ہے کہ اگر فرمائشی مضامین کو خانہء استثناء میں رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ کہ ہمارے قابل ذکر تنقید نگاروں نے فکشن پڑھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ اکثر فکشن نگاروں نے فکشن پر مضامین لکھنے کی عادت ڈال لی ہے۔اب بطور مجبوری انہیں اپنے ہی مضامین میں اپنے فن کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے۔ایک وقت تھا کہ اکثر رائٹر اپنے مضامین میں عجز کے سبب اپنا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ایسے مضامین میں مدیران فٹ نوٹ کے ذریعے ان فنکاروں کی قدر ومنزلت کی نشان دہی کرتے تھے۔اب تو نہ مدیران کو فٹ نوٹ لکھنے کی توفیق ہوتی ہے نہ ہمارے قلم کار عجز کی راہ اپناتے ہیں۔ لہذا ثالث کے اس گوشہء شموئل احمد کے لئے اقبال حسن آزاد اور شموئل احمد دونوں کو مبارک باد۔

(عشرت ظہیر، گیا)

☆ دو روز پہلے ہی رسالہ موصول ہوا۔ابھی صرف شموئل احمد کے ہی افسانے ہی پڑھ سکی ہوں......زبردست!"ریپ سنسکرتی" جتنا خوفناک نام ہے اس سے بھی بڑھ کر دردناک افسانہ ہے یہ۔اپنے ہی ملک کی حالت پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔کیونکہ ہماری طرف ایسے خطرناک حالات نہیں ہیں۔"ظہار" کے بارے میں جتنا کہا جائے کم ہے۔شموئل احمد کا یہ افسانہ منٹو کے افسانوں کو ٹکر دیتا ہے۔کہنے والا اسے فحش کہہ سکتا ہے مگر کہانی کا ٹریٹمنٹ،اس کا مقصد اور اس کا بیانیہ زبردست ہے۔اسی لیے شموئل احمد کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ (رینو بہل، چنڈی گڑھ)

☆ چند روز قبل ثالث کا تیرھواں شمارہ دستیاب ہوا۔یہ شمارہ بھی حسب سابق خوب ہے اور اس میں

بہترین تخلیقات جمع کی گئی ہیں۔سردست میں نے اس کے چند مضامین اور افسانے ہی پڑھے ہیں۔شموئل احمد صاحب کا انٹرویو بھی پڑھا۔انٹرویو میں کئی باتیں حقیقت پر مبنی کہی گئی ہیں۔1۔اردو افسانہ ابھی تک فساد کی نوسٹلجیا سے باہر نہیں آسکا ہے۔2۔فی الحال اردو کو متوسط نچلے طبقے سے زندہ رکھا ہے۔3۔۸۰ء کے بعد اچھے ناول لکھے گئے ،بڑا ناول نہیں لکھا گیا۔4۔جنس کا ایک روحانی پہلو بھی ہے جسے ابھی بازیافت ہونا ہے......تقریباً تمام ہی مشمولات اچھے اور معیاری ہیں۔اداریہ بھی خوب ہے۔ ابوفہد (نئی دہلی)

«●»

لقمان حکیم عقل کے روشن اور رنگ کے سیاہ تھے۔زما جس طرح لقمان کی حکمت سے چوری چھپے پیٹ میں ڈالا ہوا میوہ ظاہر ہو گیا،اسی طرح روز جزا سب کا حلال وحرام کھایا اور کمایا ظاہر ہو جائے گا۔یہ خدائے عالم الغیب کی شان بتا رہی ہے کہ وہ ہمیں رسوا نہیں کرتا ورنہ ہمارے سب افعال اس کی نظر میں ہیں۔

زمانہ کے دستور کے مطابق وہ ایک لڑائی میں گرفتار ہو کر غلام بن گئے۔بکتے بکتے ایک تاجر کے پاس پہنچے۔اسے معلوم نہ تھا کہ یہ لقمان ہیں۔اس نے آپ کو مزدوری پر لگا دیا۔وہ آپ سے گارا بنانے کا کام لیتا تھا۔ایک دن تاجر نے اپنے سب غلاموں کو باغ میں میوہ چننے بھیجا۔وہ سب میوہ چُن کر کھا گئے اور لقمان کا نام لے دیا۔آقا بڑا خفا ہوا۔لقمان نے کہا کہ اگر مجھ پر الزام ثابت ہو تو بیشک میں قابل سزا ہوں۔چوری معلوم کرنے کی ایک تجویز میں بتا دیتا ہوں۔اگر آپ اصل مجرموں کو پکڑنا چاہیں تو اس پر عمل کریں۔تاجر نے پوچھا کس طرح؟ لقمان نے عرض کیا،آقا پانی میں لہسن ڈال کر اسے ابالئے اور وہ ابلا ہوا گرم پانی سب کو پلا کر حکم دیجئے کہ ایک گھنٹہ باغ میں دوڑیں۔اسطرح قے آئے گی اور جو کچھ کسی نے کھایا ہوگا ظاہر ہو جائے گا۔

آقا نے کہا یہ تجربہ تو آسان ہے۔فوراً اس نے لہسن منگایا اور اسکا ابلا ہوا پانی سب کو پلا کر دوڑایا۔جب قے کرنے لگے تو سوائے لقمان کے سب کے پیٹ سے میوہ نکلا۔آقا نے سب غلاموں کو سزا دی اور لقمان سے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ میں نے ناسمجھی سے جو آپ کو نہ پہچانا وہ میری خطا تھی۔اسے معاف کر دیجئے۔آئندہ گھر کا سب انتظام آپ کے سپرد ہے۔آپ سیاہ وسفید جو چاہیں کریں میں کچھ دخل نہ دونگا۔

(حکایات رومی)